جموں و کشمیر
کے
اردو مصنّفین
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

جموں و کشمیر کے اردو مصنّفین

جان محمد آزاد

جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز سرینگر

نام کتاب .... جموں وکشمیر کے اردو مصنّفین

مصنف .... جان محمد آزاد

سن طباعت ۲۰۰۴ء

تعداد ۵۰۰

ناظم طباعت .... ظفر مظفر

معاون طباعت .... محمد امین

کمپیوٹر کمپوزنگ .... میسکاٹ کمپیوٹرس ☏2483456

سرورق .... جاوید اقبال

چھاپ خانہ .... میکاف پرنٹرس دہلی

قیمت ....

ملنے کا پتہ.........

کتاب گھر

- مولانا آزاد روڈ سرینگر
- کنال روڈ جموں توی

انتساب

آسمان ادب کے

ان چاند ستاروں کے نام

جن کی تحریر کی تنویر سے

یہ کہکشاں محروم رہی

جان محمد آزاد

ترتیبُ

کشمیر میں اردو نثر کا نگارخانہ ١١

جگنوؤں کے قافلے ۳۹۶

کشمیر میں اردو نثر کا نگارخانہ

اَلحمدُلِلّٰہ...... برسوں کی عرق ریزی کے بعد ''جموں وکشمیر کے اردو مصنّفین'' آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ میں نے معیاری نثر کی اینٹوں سے ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کشمیر میں نثر کے اس قصر کی بنیادوں کو جن عظمائے رجال نے اپنے خون جگر سے مستحکم کیا تھا، ان میں محمد الدین فوقؔ اور ہرگوپال خستہؔ کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ فوق ہی تھے جنہوں نے فرزندان حریت کے دوش بدوش اہل کشمیر کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور اپنے زور قلم سے ان کے حوصلے بلند کیے۔ اردو نثر میں ان کی تاریخی کتابوں تذکروں اور رسالوں کی مجموعی تعداد لگ بھگ سو تک جا پہنچتی ہے۔ کشمیر کے دبستان اردو کو سنوارنے اور یہاں کے ثقافتی ورثے کی شیرازہ بندی کرنے میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود بعض محققین مہجور کی ''حیات رحیم'' کو کشمیر میں نثری ادب کا بنیادی پتھر تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے زیرنظر کتاب لگ بھگ ایک سو سال کی ذہنی تاریخ ہے۔ یہ ایک پورے عہد کی تخلیقی سرگرمیوں کا جائزہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر میں اس طویل دور کے اردو نثر کا

جائزہ صحیح معنوں میں ابھی تک نہیں لیا گیا ہے۔ حبیب کیفوی نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''کشمیر میں اردو'' کو ترجیحی طور ایک خاص خطے کی اردو شاعری کے تذکرے تک محدود رکھا ہے۔ اس میں مقامی نثر کے ارتقاء کا ایک سطحی سا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح عبدالقادر سروری نے اگرچہ نثر کا ایک سیر حاصل اور لازوال جائزہ پیش کیا ہے تاہم یہاں بات ایسے احباب کی ہو رہی ہے جو ابھی تخلیقی سفر میں ہیں اور پھر یہ سبھی کتابیں بالعموم ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے دور کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اپنے قیام کے پینتیس سالہ دور میں نثری سرمائے کی بازیافت اور نئی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں قابل قدر کارنامے انجام دئے۔ اکیڈیمی کی تشہیر و ترغیب سے کشمیر میں اردو نثر کو ایک نیا شعور اور ایک نئی قوت عطا ہوئی اور یہاں اردو کے ادبی سرمائے کا دامن وسیع تر ہوتا گیا۔ چنانچہ دیگر درجنوں نثری کتابوں کے علاوہ اکیڈیمی نے ۱۹۷۳ء میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کشمیر میں تخلیق کئے گئے اردو ادب کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ اس انتخاب میں پچیس سال کے اردو ادب کے نمایاں خدوخال کا محض ایک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کشمیر میں اردو نثر کے جدید رجحانات کا جائزہ لینے کی ابھی تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوسکی ہے۔ جناب محمد یوسف ٹینگ غالباً اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں1۔

> ''سروری نے اس ایکٹ کا صرف ابتدائیہ پیش کیا ہے کہ اس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس ایکٹ کے بیشتر کردار بفضلہ ابھی تخلیق کے منچ پر مصروف و مشغول ہیں۔ نہ ان کا رول ختم ہوا اور نہ ان کی تخلیقی تگ و تاز کا حرف آخر آیا ہے۔ اس لئے اس بات کو سٹیج سے روشناسی کی پہلی منزل سمجھا

جانا چاہئے۔ اچھا ہوا کہ یہ ابتدا سروری نے ہی کی تھی۔ اب اس کو منطقی انجام تک لے جانے کی تحریک سے دامن بچانا آسان نہ ہوگا''۔

مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے اس کام کو ''منطقی انجام'' تک پہنچایا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کے نا تمام رہنے کا اعتراف ہے۔ اس عظیم پروجیکٹ کی تکمیل میں جس جنوں سامانی اور اہلیت کی ضرورت تھی شاید میں اس کا متحمل نہیں تھا۔ تاہم میں نے شخصیات اور ان سے متعلق معلومات کی چھان بین اور اس کے حصول میں نہایت کاوش سے کام کیا ہے۔ یہ صبر آزما عمل میرے لئے کسی جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں تھا۔ اس کے دوران مجھے کئی ہفت خوان طے کرنا پڑے۔ افسانوی افق پر چمکتے ہوئے ستاروں کی درخشندگی سے اپنے نگارخانے کو منور کرنے کے لئے کبھی کبھی مجھے داستانوی کردار بن کر کتابوں کے دفینوں پر بیٹھے ہوئے ان ناگوں سے نبرد آزما ہونا پڑا جنہوں نے کشمیریات اور ادبیات سے متعلق مواد کو نا قابل گرفت بنا کے رکھ دیا ہے۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ بعض اصحاب بڑی محبت اور بزرگانہ شفقت سے پیش آئے اور نہایت فراخ دلی سے مجھے اپنا تعاون دیا۔ یہ اسی تعاون کا اعجاز ہے کہ بلآخر ایک ایسا نگارخانہ وجود میں آیا ہے جس کی مختلف جہتوں پر رنگ برنگے فانوس آویزاں ہیں۔ یہ فانوس اپنا ایک جداگانہ حسن رکھتے ہیں۔ یہ ایسا نگارخانہ ہے جس میں ٹنگی ہوئی پینٹنگس اور ڈرائنگس اپنے ایک مخصوص رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ کہیں کوئی تصویر رنگوں کی معقول کمپیوزشن میں صاف ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کسی تصویر کے رنگ اور خط اس کی شبیہ کو پوری طرح ابھرنے نہیں دیتے۔ ایسی بھی کئی

تصویریں ہیں جن کا محض ایک دھندلا سا خاکہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض مجسمے درشت اور کھردری شکل میں بھی ابھر آئے ہوں۔

دراصل یہ تصویریں شخصیات کے رنگ اور ان کی تصانیف کے آہنگ کو محسوس کر کے ہی کینوس پر ابھر پائیں ہیں۔ ہم عصر ادب اور ادیبوں کی یہ مصوری معمولی کام نہیں۔ خوف اور لحاظ کے پھیلے ہوئے سلسلے قدم قدم پر دامن گیر ہوتے ہیں۔ یہ چتر کاری اور یہ تجزیہ جہاں ایک طرف بڑی گہری بصیرتوں کا متقاضی ہے وہاں کبھی کبھی بے لاگ بات کہنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کسی فنکار کی تخلیقات کے بارے میں صحیح فیصلہ آئندہ نسل ہی کرتی ہے اور مستقبل کا فیصلہ ہی حتمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کام دقت طلب تھا خصوصاً اس آدمی کے لئے جس کا مسلک ہی صلح کل رہا ہو۔ پرانے اہل قلم پر بے لاگ تجزیہ کرتے وقت جھجک نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس معاصرین پر اظہار خیال کے دوران اکثر سخت پریشانی سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاہم ان سنگلاخ مزاحمتوں کے باوجود میں نے ہر چھوٹے بڑے ادیب کا معاملہ کرتے وقت جذباتی رویہ اختیار کرنے سے اجتناب کیا ہے اور ان کی خلوت وجلوت کو ممکنہ حد تک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

آدمی کے لئے آدمی کی پرکھ بہت مشکل کام ہے کیونکہ وہ جتنا باہر سے دیکھا جا سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ اندر چھپا ہوتا ہے۔ اس تہہ در تہہ چھپی ہوئی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ظاہری نگاہ سے کہیں زیادہ باطنی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ میری لغزش کی وجہ سے کہیں پر ہیروں کے ساتھ کانچ کے ٹکڑے بھی جمع ہو گئے ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے متعلقہ شخصیات اور ان کی تخلیقات کو لے کر

میں نے جو قلمی چہرے بنانے کی کوشش کی ہو وہ ان کے عکس سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے ہوں۔ تاہم یہ میرے ذاتی تاثرات ہیں اور ضروری نہیں کہ اس کتاب کا اشاعتی ادارہ یا قاری بھی ان سے اتفاق کرتا ہو۔ ممکن ہے کہ میرے بعض محترم دوستوں کو میری آراء سے شدید اختلاف ہو میں ایسے قلم کے پاسبانوں کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری ہرگز میرا مقصد نہیں۔ اگر سہواً کسی مضمون کا کوئی پہلو ان کی دل آزاری کا باعث بنتا ہو تو وہ براہ کرم اپنی تردید یا وضاحت سے مطلع فرمائیں تاکہ کتاب کے دوسرے حصے میں اس تردید کو بھی شاملِ اشاعت کیا جا سکے۔

وادی کشمیر کے چند ایک صفِ اول کے اہل قلم حضرات اور ان کے نثری شہہ پاروں کے علاوہ یہ کتاب جن نثر نگاروں کے تذکرے سے محروم رہی ان میں سرحد کے اِس پار اور اُس پار رہنے والے کشمیر کے یہ ممتاز مصنفین نثر بھی شامل ہیں جن کے تذکرے پر کام تکمیل کے مراحل میں ہے۔

میر عبدالعزیز (صحافی) خورشید الحسن (صحافی) غلام احمد پنڈت (نثر) شیخ مہدی (نثر) عزیز قریشی (نثر) الطاف قریشی (افسانہ) الطاف اعظم (نثر) رشیک ملک (نثر) قیوم اے شیخ (نثر) وقار ملک (افسانہ) ثریا عزیز (نثر) میر غلام احمد کشفی احمد شمیم (افسانہ) سید غلام حسن شاہ کاظمی (محقق) خالد نظامی (نثر) کہکشاں ملک (افسانہ) طاؤس بانہالی (صحافی) سلیم رفیقی (نثر) شمس کاشمیری (نثر) عالم سرتاج (نثر) منور کاشمیری (نثر) آزر عسکری (افسانہ) ہدایت اللہ اختر (نثر) مجید قریشی (نثر) ممتاز حمید (نثر) کشور نصیر (تمثیل نگار) شفقت مراز (افسانہ) حمید کاشمیری

(افسانہ) مقبول سید (نثر) اصغر بٹ (افسانہ) محمود ہاشمی (ناول) محمد یوسف بچھ (نثر) اکبر حیدری (محقق) پریم ناتھ بزاز (صحافی) مولانا قاسم شاہ بخاری (نثر) قاری سیف الدین (نثر) مشعل سلطانپوری (محقق) ناظر کولگامی (نثر) کاچو اسقندر کار خان (نثر) ارجن دیو مجبور (نثر) ش،م، احمد (صحافی) ظفر اقبال (صحافی) حسن زینہ گیری (صحافی) نذر بونیاری (نثر) پروفیسر نذیر احمد ملک (نثر) یوسف جمیل (صحافی) شملہ مفتی (نثر) اقبال عظیم (محقق) شہباز راجوروی (نثر)

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یک دانہ

بندہ ناچیز
جان محمد آزاد
شاداب منزل
باغِ جناب (خان لین)
اپر صورہ سرینگر کشمیر
۸ر مارچ ۱۹۹۴

---

1 کشمیر میں اردو: تیسرا حصہ ص ۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مہجور

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے کے دوران ایک نئے دبستان سے گلستانِ کشمیر معطر ہوا پیرزادہ غلام احمد مہجور اس دبستان کے امام تسلیم کئے گئے۔ انہیں جدید شاعری کا سب سے معروف اور ممتاز شاعر تسلیم کیا گیا۔ مہجور پہلے کشمیری شاعر تھے جنہوں نے اہل کشمیر کی مظلومیت اور محرومیت پر آنسو بہائے اور پہلی بار اہل کشمیر کو ڈوگرہ حکومت کے جبر واستبداد کے خلاف برسرپیکار ہونے کی دعوت دی۔ مہجور ضلع پلوامہ کے متری گام علاقے میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی خوددار طبیعت نے لڑکپن ہی میں پیری مریدی کے خاندانی مشغلے کو اپنانے سے انحراف کیا۔ پھر آگے چل کر جب انہیں شبلی نعمانی، بسمل امرتسری اور محمد الدین فوق جیسے عظیم المرتبت لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی تو آپ کی فطری صلاحیتیں نکھر کر ابھر آئیں۔

''حیات رحیم'' مہجور کا ایک ایسا نثری کارنامہ ہے جسے بعض ناقدین نے اہل کشمیر کی پہلی اردو تخلیق قرار دیا ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ ۱ ہرگوپال کول خستہ کی ''گلدستہ کشمیر'' کو اس لحاظ سے پہلی اردو کتاب تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خستہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پٹیالہ میں بسر کیا تھا۔ پھر وہ کشمیری زبان بے ساختگی سے

بولنے کا بھی متحمل نہیں تھا۔ اسی طرح فوق اگرچہ کشمیری تھے لیکن ان کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی۔ وہ بھی بعض روایات کے مطابق کشمیری زبان بولنے کی اہلیت سے محروم تھے۔ لہٰذا مہجور کو یہ سعادت نصیب ہوئی وہ وطن عزیز کا پہلا فرزند تھا جس نے ایک مکمل اور مدلل اردو کتاب تحریر کی۔

''حیات رحیم'' صفاپور کے رحیم صائب قلندر کی سوانح عمری ہے۔ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی اشاعت راوی پرنٹنگ ورکس لاہور میں ہوئی ہے۔ ۱۹۲۲ء کے آس پاس شایع ہونے والی یہ کتاب اپنے زمانے کے تقاضوں سے بہت آگے ہے۔ اس زمانے میں رحیم صائب کے معتقدین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس صاحب کمال بزرگ کے نیاز مندوں نے مہجور کو یہ سوانح لکھنے کی تحریک دی ہے لیکن مہجور اپنی اس کتاب میں خود اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''آخر میں اس نحیف الجثہ مگر بہ قیمت بہتر بزرگ ہستی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا نام کشمیر جدید کی تاریخ میں مورخ آب ذر سے لکھیں گے جس نے صدہا میل اپنے وطن قدیم کشمیر سے دور رہ کر اپنے پس ماندہ اہل خط بھائیوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اس خط زم ہریر کے منجمد و ساکن خون کو حرکت و حرارت میں لانے کے لئے اخبار 'کشمیری' جاری کیا۔ میری مراد منشی محمد الدین فوق سے ہے جن کے مشہور نام سے ہر پڑھا لکھا انسان واقف اور ان کی خدمات کا معترف ہے۔ آپ نے باوجود عدیم الفرصتی کے ''حیات رحیم'' کے مسودہ پر نظر ثانی فرمائی اور اس کی کتابت و طباعت کا اہتمام کیا۔''

کتاب کے ابتدائی حصے میں مہجورؔ کشمیر کی خاک پاک سے ابھرنے والے چاند ستاروں کا سیر حاصل جائزہ لیتا ہے۔ وہ عبدالوہاب شائقؔ کا موازنہ فردوسیؔ سے کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ارض کاشمر کے اس باصلاحیت فرزند نے تاریخ کشمیر کے موضوع پر اسی ہزار بیات تصنیف کر کے اعلیٰ رزمی قابلیت کا جوہر دکھایا۔ اسی طرح وہ شیخ یعقوب صرفیؒ، اکمل الدین بدخشیؒ اور، علامہ کمال الدین کاشمیری کے کمالات گناتا ہے۔ اس زمین کی زرخیزیت بیان کرنے کے بعد مہجورؔ رحیم صائب کا سلسلہ نسب بیان کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بعض ایسے لوگوں کا گلہ بھی کرتا ہے جو قلمی نسخوں کے دکھانے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"اس عدیم المثال بخل نے ملک کے بے بہا جواہرات اور انمول کتب خانے تباہ کر دئے۔ قران شریف اور کتب احادیث وغیرہ کو یہ لوگ عام طور پر دکھا سکتے ہیں مگر کشمیری مصنفوں کی غیر مطبوعہ کتابوں کے لئے یہ بخل اب بھی ایسا ہے جیسا کہ آج سے تین سو سال پیشتر تھا۔"

"حیات رحیم" میں جو متعدد انکشاف ہوئے ہیں ان میں ایک اہم انکشاف یہ ہے کہ رحیم صاحب نے ملک کے فرماں روا کو دو بار اپنی خلوتوں میں پیش ہونے کی اجازت سے محروم کر دیا تھا۔ اس ایک بات سے رحیم صاحب کی شان قلندری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ محمد یوسف ٹینگ 2 اس کتاب کی نثری خوبیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی زبان کو شستہ صاف عام فہم اور رواں دواں قرار دیتے ہیں۔ کتاب کے زمانہ اشاعت کو ملحوظ رکھیں تو یہ اس نثر کا ایک بڑا وصف قرار دیا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں اپنے ابتدائی تلخ تجربات کے باوجود مہجورؔ نے

اردو نثر نگاروں میں اپنا تاریخی مقام محفوظ حاصل کرلیا ہے۔

تذکرہ شعرائے کشمیر مہجورؔ کا ایک اور عظیم الشان ادبی کارنامہ ہے۔ مہجور نے اس سلسلے میں جو اشتہار تقسیم کرایا تھا اس کے مطابق اس تذکرے میں ''نیل مت پوران'' کے مصنف سے لیکر مہدیؔ تک پورے پانچ سو شعرا کے مکمل حالات درج ہیں۔ مگر مہجورؔ کا یہ لازوال تذکرہ نہ جانے کیوں نا تمام رہا اور پھر کبھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔ دراصل اس کتاب کی ترتیب کے پیچھے وہی جذبہ کارفرما تھا جو عبدالاحد آزادؔ کی ''کشمیری زبان اور شاعری'' کے پیچھے تھا۔ آزاد کو کشمیری شاعری کے ارتقائی سفر کا تذکرہ تحریر کرنا تھا جبکہ مہجورؔ کو کشمیر میں فارسی زبان کے اہم شعراء کا تذکرہ لکھنے کا کام تفویض ہوا تھا۔ اسے آزاد کی سرخروئی سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی حیات میں ہی اپنے معرکتہ الآرا تحقیق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے جبکہ مہجور داستان کہتے کہتے نہ جانے کہاں کھو گئے۔

''ابدال مہجورؔ''[3] اپنے دادا کی نا تمام تحریرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے پاس اس غیر مطبوعہ کتاب کا جو قلمی نسخہ ہے وہ چار سو دس صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مہجور نے کشمیری شاعری کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔ پہلا دور ایک ہزار ہجری تک کے سترہ شاعروں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں بیشتر شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام درج کیا گیا ہے۔ مسودے میں شعراء کے متعلق جو مواد جمع ہے وہ محققین کے لئے گنج ہائے گراں مایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا دور ۱۲۲۸ھ میں جا کر اختتام تک پہنچتا ہے۔ اس دور کے شعراء میں سرفہرست فطریؔ کا نام درج ہے۔ مہجورؔ فطریؔ کے تذکرہ میں لکھتا ہے:

''فطری ایک ہزار ہجری میں شاگرد مولانا ذہنی تھا اور اخوند ملا ندیم فصیحی کا ہم صحبت اور رفیق تھا جب مرزا جعفر موسوی فطرت ناظم صوبہ بہار کشمیر آیا اور فطری اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا کلام سنایا۔ مرزا فطرت اس زور کلام اور معجز بیانی سنکر رقص میں آیا اور سر تسلیم خم کرکے فرمایا ''اگر مجھے پیشتر معلوم ہوتا تو میں اپنا تخلص فطرت ہرگز نہ رکھتا۔''

''تذکرہ شعرائے کشمیر'' کا تیسرا دور ۱۲۳۰ھ سے ۱۳۱۳ تک کے شعراء پر مشتمل ہے۔ ۸۳ سال کے اس دور میں کل ۳۳ شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں بعض حضرات کے حالات کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے جبکہ بعض دیگر شعراء کا مختصر تذکرہ ہے اسی کتاب کے متعلق علامہ اقبالؒ نے مہجور کو ایک خط لکھا تھا جس میں شاعر مشرقؒ نے اس بات کی پیش بینی کی تھی کہ اگر تذکرہ شعرائے کشمیر آپ کی زندگی میں یا اس کے بعد شایع ہوگی تو یہ بلاشبہ ایک عظیم کارنامہ ہوگی جس سے آپ کا نام بقائے دوام حاصل کرے گا۔

''آئینہ اتحاد کشمیر'' ایک اور مختصر سا اردو مسودہ ہے۔ جس کی تحریر کی تحریک کا عندیہ اس کے دیباچے سے ملتا ہے۔ دیباچے میں ۱۹۳۱ء کے دوران پھوٹ پڑنے والی فرقہ واریت کو مسودہ کا محرک بیان کیا گیا ہے۔ یہ سارا مسودہ روایتی میل ملاپ اور مفاہمت کو سربلند کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ڈرامہ طرز کے اس نامکمل اردو مسودے کے بعض حصے اس زمانے کے اخبار لاہور میں شایع ہوئے ہیں۔ جب کبھی اہل کشمیر ڈرامہ نگاری کی تاریخ ترتیب دیں گے تو یہ نامکمل ڈرامہ ایسی تاریخ کی پیشانی کا جھومر بنے گا۔

''کلام شیخ نورالدین صاحب ریشیؒ'' کے مسودے کی مہجور یوں شروعات کرتے ہیں:

''خدا کا شکر ہے کہ راقم الحروف کو خدا نے شیخ نورالدین ریشی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو جمع کرنے کی توفیق بخشی اور آج مورخہ اول ماگھ ۲۰۱۸ مسودہ مرتب کرتا ہوں4''۔

دراصل ان ایام میں کلام شیخ العالمؒ کتابی صورت میں دستیاب نہیں تھا۔ لہٰذا مہجور نے اس جلیل القدر کشمیری کا کلام شیرازہ بند کرنے کا عزم کیا تھا۔ ابدال مہجور کے مطابق یہ مسودہ صرف ۳۶ اوراق پر مشتمل ہے جس میں مجموعی طور ایک سو آٹھ شرُک درج ہیں۔ بیشتر اشعار کے مشکل الفاظ کے اردو میں معنی درج ہیں لیکن اس مسودے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کلام شیخ کی اردو میں تشریح کی گئی ہے۔ اس تشریح کے دوران کشمیری شاعری کے مختلف ادوار پر بھی بحث کی گئی ہے۔

''سفر نامہ لداخ'' کے عنوان سے ایک اور مسودہ اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب محکمہ مال میں شجرکش متعین ہونے پر مہجور کا تبادلہ لداخ کر دیا گیا۔ مہجور نے وہاں اپنے کلام کے دوران لداخ کی ثقافت سے آگہی حاصل کر لی۔ پھر اس نے سری نگر سے لداخ کے سفر پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن بعض دیگر نگارشات کی طرح مہجور کا یہ اردو مسودہ بھی مکمل نہیں ہو سکا۔ گردش آفاق کے ہاتھوں جتنے بھی صفحات محفوظ رہ پائے ہیں ان کا انداز بیان انتہائی دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ ادھر محمد یوسف ٹینگ اپنی کتاب مہجور شناسی میں لکھتے ہیں کہ لداخ اور کرگل کا سفر نامہ ۱۹۰۹ء کے لداخ بندوبست کے متعلق مفید معلومات فراہم کرتا ہے اور یہ ''سفر نامہ

بلتستان'' کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔

ابدالؔ مہجور، ''انقلاب کشمیر'' کے نام کے ایک اور غیر مطبوعہ اردو مسودے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس مسودے کے پہلے صفحے پر یہ عبارت تحریر کی گئی ہے۔

انقلاب کشمیر جس میں ساکنان خط کشمیر گوشہ جنت نظیر کی گذشتہ شوکت و برتری اور موجودہ ذلت و پستی اور آیندہ عظمت و بہتری پر تاریخی بحث کی گئی ہے اور کشمیر کی قدیمی اولوالعزمی کے ساتھ بے نظیر ہندو مسلم اتحاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''

یہ مسودہ لگ بھگ چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مطالعہ سے کشمیر کی تاریخ کے نئے گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مہجورؔ نے ''سوانح حبہ خاتون'' پر بھی اردو میں کام کیا ہے جس میں اس عظیم شاعرہ کے حالات زندگی اور اس کا کلام درج کیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کتاب دراصل پروفیسر مجیبؔ کے حبہ خاتون ڈرامے کو بنیادی مواد فراہم کرنے کے پیش نظر تحریر کی گئی تھی۔ برسوں بعد جب پروفیسر مجیبؔ نے حبہ خاتون سے متعلق اپنا تحقیقی کام شایع کیا تو اس میں مہجورؔ کا کہیں حوالہ نہیں دیا گیا۔

مہجورؔ کے کاغذات میں اردو میں تحریر کردہ ایک معنیٰ خیز اور عبرت انگیز روئیداد بھی ملتی ہے۔ اس تحریر میں بقول ٹینگ صاحب5 ان تعصّبات و توہمات کی گھناونی تصویر بھی ملتی ہے جو اس وقت کے حکمران طبقے میں بیماری کی طرح سرایت کر گئے تھے۔ اسی دباؤ کا لاوا پھر ۱۹۳۱ء میں پھٹ پڑا اور خود مہجورؔ کا یہ بیان اس سربستہ نطق کی برف پگھلنے کا سراغ دیتا ہے جو غلامی کی شب تاریک نے اہل کشمیر

کے لب و دہن پہ جمادی تھی۔ اس روداد کی تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی ہے اور یہ مہجور کے ان قصیدوں کی شان نزول بھی بیان کرتی ہے جو اسے وقت کے حاکموں کے حضور میں پیش کرنے پڑے۔ پیش ہے اس دستاویز سے ایک اقتباس:

''مفصلاتِ کشمیر میں ۹۹ فیصد مسلمان آباد ہیں۔ سرکاری محکمہ جات سے محکمہ مال کے ساتھ ان کے زیادہ تعلقات وابستہ ہیں۔ عرصہ دراز سے زمینداوں پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا ہے ان کا سرچشمہ یہی محکمہ ہے اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ایک چپراسی سے لے کر مشیر مال تک اس محکمہ پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے جن کے دلوں میں اس جفاکش طبقہ کے لئے ہمدردی ایک ذرہ کے برابر بھی موجود نہیں۔ موجودہ فرمان روائے کشمیر سری مہاراجہ صاحب بہادر جب گدی نشین ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے بیگار کی بندش کا خسروانہ فرمان نافذ فرمایا اس اقدام سے رعایا کے دلوں میں ایک نیک دل مہاراجہ صاحب کی بے انتہاء محبت پیدا کی لیکن پھر جب بیگار کا سلسلہ عملاً بند نہیں ہوا تو ان کی تمام شادمانی یاس سے تبدیل ہوئی۔ ان کے پاس تحصیل کا ایک چپراسی آتا ہے اور خورد ونوش و دیگر ضروریات ان سے جبراً اور مفت حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاک رسانی کا کام بھی بذریعہ زمینداران بلا معاوضہ کرایا جاتا ہے''۔

جبر واستبداد کی یہ طویل روئیدار عبرتناک بھی ہے اور اس سے مہجورؔ کے صاف اور سلیس اردو نثر کا عندیہ بھی ملتا ہے۔ اس کے بے ساختہ اظہار میں جہاں ان تاریک ایام کے استحصال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں وہاں اہل کشمیر کے اس عزم و

استقلال کی شعاعیں بھی روشن ہوتی ہیں جو زم ہریر کی طویل رات میں بھی آرزوں اور امنگوں کے ارغوانی آفتاب روشن کرتے رہے۔ دراصل مہجورؔ کی یہ روئیداد محض ایک شخص کی روئیداد نہیں ہے۔ یہ ایک قوم کی داستان کا پیش لفظ ہے۔ یہ طویل نیند کے بعد کروٹ لیتے ہوئے اہل کشمیر کی نئی کہانی کا نقطہ آغاز ہے۔ اس کا ہر لفظ کشمیریت کے درد سے مہکا ہوا ہے۔ اس کے ہر لفظ میں ہزاروں حسرتیں پنہاں ہیں۔ مطلق العنانیت کے عظیم بتوں کے سامنے حرفِ حق بلند کر کے مہجورؔ نے جس جرات رندانہ کا ثبوت دیا تھا تاریخ کے اوراق میں اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

ہفت روز ''البرق'' میں ابو رشیدؔ کاشمیری کے نام سے جو مضمون شائع ہوا ہے وہ مہجورؔ کے حوالے سے ایک پرانے ادبی معرکہ کی یاد بھی دلاتا ہے اور کشمیر میں اردو نثر کے اس ابتدائی معمار کے فکر ونظر کے نئے گوشے بھی روشن کرتا ہے۔ ناقدین کی آرا میں یہ مضمون مہجورؔ کے استدلال، ان کی زبان شناسی سخن فہمی، وسعت مطالعہ، کثرت معلومات اور تنقیدی بصیرت کا ایک گراں بہا نمونہ ہے 6 اس مضمون سے ایک اقتباس:

''......ادبی نکتہ نگاہ سے بھی کشمیری حصہ قابل ستائش نہیں بلکہ قابل مذمت اور ننگ کشمیریت ہے۔ زبان بالکل سفیہانہ اور ملاہانہ استعمال کی گئی ہے۔ بزرگوں اور برگزیدہ ہستیوں کے احترام کالحاظ نہیں رکھا گیا۔ ان کی تحقیر کی گئی ہے۔ نظمیں اور مضامین ادبی خوبیوں سے بالکل خالی ہیں۔ اس پر بھی ایڈیٹوریل میں خودستائی کا حق ادا کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''پرتاپ'' کا کشمیری حصہ اس درجہ پر پہنچے گا کہ سب یار کہتے ہیں کہ کشمیری زبان زندہ

ہونے لگی۔ کشمیری زبان کی شعروشاعری کا سلسلہ کشمیر میں ۳۵۰ سال سے جاری ہے اوراس کی اشاعت پچاس سال سے ہورہی ہے۔اس طویل عرصے میں کشمیری زبان نے سینکڑوں شاعر پیدا کئے اور جو ہزار ہا کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی اشاعت سے تو کشمیری زبان کو زندگی نہیں ملی البتہ جب سے پرتاپ میگزین نے چند صفحات غلط اور بے ہودہ کشمیری نویسی کے لئے وقف کئے کشمیری زبان آسمان پر چڑھ گئی''۔

ابورشید کاشمیریؔ کے فرضی نام سے مہجور کے یہ ریمارکس محض ایک معاصرانہ چشمک کے غماز نہیں ہیں۔ دراصل ان سے مہجورؔ کی بصیرت اور زبان شناسی کا صحیح اشارہ ملتا ہے۔ مضمون میں طنز کے تیرونشتر اپنے شباب پر ہیں۔ مثلاً یہ درست ہے کہ صحیح شاعری تو گریجویٹ بن کر ہی آتی ہے۔ آئندہ اگر کسی کو ذوق شاعری ہو تو وہ سرینگر کے پرتاپ کالج سے اس فن کو حاصل کرلے۔ وہاں ٹریننگ ملتی ہے کہ کس طرح ''غفار کا وڈاری'' کے شاعرانہ سرمایہ پر ڈاکہ مارنا چاہئے''۔

''پٹواری'' نام کا کتابچہ بھی مہجور کے اردو نثر کی ایک یادگار ہے۔ اس میں پٹواری کی حیثیت سے اپنے طویل ماہ وسال کے وسیع تجربات کو نہایت عرق ریزی سے سمونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اردو نثر میں مہجورؔ کا سب سے قابل ذکر کارنامہ ایک ناول ہے۔ اس ناول کا نام ''عزیز'' ہے۔ مہجورؔ کے اس اردو ناول کا اشتہار اس زمانے کی ایک کتاب میں چھپا تھا جس کی عبارت یوں ہے:

''ایک کشمیری رئیس زادے کی عیاریاں''

اس نامکمل ناول کا مسودہ شکستہ ہو چکا ہے۔ ان بکھرے اوراق کو سمیٹنے کی

کلچرل اکیڈیمی نے مستحسن کوشش کی ہے ۱۔ اس ناول کا ہر باب اس زمانے کے چلن کے مطابق ایک شعر سے شروع ہوتا ہے۔ ناول کے مخصوص اسٹائل کا اندازہ لگانے کے لئے ہم یہاں باب سوئم سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

''......ہم اس وقت اپنے معزز ناظرین کو اس سڑک کی سیر کرانا چاہتے ہیں جو کہ سرینگر سے قصبہ ما گام کو جاتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں کناروں پر بید کے درخت دورویہ نصب ہیں۔ گویا سبز پوش دو پلٹین کسی کی آمد پر باقاعدہ کھڑی ہیں۔ پرندے دن کو پہاڑی کشت زاروں سے سیر شکمی کر کے اس وقت ان درختوں پر ٹھنڈی کا حظ اٹھانے کے لئے روز پانی پینے کے لئے جوق در جوق آتے ہیں۔ جب ان کے پژمردہ دلوں کو ٹھنڈی ہوا مؤثر آتی ہے تو ثنائے ایزدی کے گیت نہایت مؤثر لہجہ میں شروع کرتے ہیں۔ اس وقت یہ سڑک بہر صورت قابل دید ہے۔ برسوں کا غم منٹوں میں کافور ہوتا ہے...... معزز ناظرین! یہاں سے ہمارے ناول کی ہیروین پیاری جان کا مکان بالکل نزدیک ہے اور ہم عرصہ سے اس کی حالت سے بے خبر ہیں۔ چونکہ وہ جگہ بہ لحاظ آبشار و سبز زار ہوائے خوشگوار کے قابل دید ہے...... پھر بستر پر سویا ہوا ہمارا مسٹر کمرہ سے باہر نکلا اور مستانہ وار صحن مکان میں آیا۔ ایک دم اپنے تمام کپڑے پھاڑ ڈالے اور دیا سلائی لگا کر سب کو جلا کر راکھ کر دیا۔ خاندان کے تمام خورد و کلاں اس واقعہ کو دیکھ رہے تھے۔ مگر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اسے اس فعل سے باز رکھتا...... تمام خاندان پر سکتے کا عالم طاری ہوا''۔

کشمیر میں اردو فکشن کے یہ ابتدائی نقش اپنی ناتمامی کے باوجود نثر کی تاریخ میں منقش ہوتے رہیں گے۔

---

1 مہجور شناسی: صفحہ ۱۱۳

2 محمد یوسف ٹینگ: مہجور شناسی (کشمیری) ص ۱۲۹

3 مہجورِ نی غیر مطبوعات: شیرازہ مہجور نمبر ص ۵۴۲

4 موتی لال ساقیؔ کا دعویٰ ہے کہ اردو زبان میں مہجور کی لکھی ہوئی یہ کتاب چھ سو صفحات پر مشتمل ہے جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے۔ (جان محمد آزاد)

5 مہجورؔ کی سرکاری ملازمت: شیرازہ مہجور نمبر ص ۲۵۱

6 شیرازہ مہجور نمبر اگست نومبر ۱۹۸۴ء ص ۲۹۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

عبدالاحد آزاد

آپ کا اصلی نام عبدالاحد ڈار تھا۔ آپ ۱۳۰۹ء میں موضع رانگر میں ایک متوسط درجے کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد سلطان ڈار تھا۔ آپ کی زندگی کے ابتدائی ماہ وسال بے حد نامساعد حالات سے گھرے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔ چنانچہ آپ نے گویا زندگی سے ہار مان کر ایک دور افتادہ دیہات میں پرائمری اسکول کا مدرس بننا قبول کیا۔ لیکن بادِ مخالف کی یہ تندی کسی طرح بھی اس ناتواں اور مفلوک الحال انسان کے وجود میں تحقیق کی جلتی جوت کو بجھا نہ سکی۔ تخلیق کی یہ تڑپ ازلی تھی اور ۱۹۳۵ء میں جب آپ کو شاعر کشمیر مہجور سے ملنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے اپنی پرستاری کا اعتراف بھی کیا اور مہجور صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ مہجور صاحب آپ کے کلام کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دینے لگے۔ لیکن یہ کلام سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خیرہ کن چمک کے ساتھ ایک برق سی چمکی ہو۔ یہ ایک نئی آواز تھی۔ ایک توانا آواز جو جگر کو چیر کے رکھ دیتی تھی۔ محمد یوسف ٹینگ کے الفاظ ہیں[1]:

"یہ جلال و جمال کے دو بنیادی عناصر کا دل نواز سنگم ہے جس میں

صدیوں کے دبے ہوئے غلاموں کے باغیانہ جذبات کی قیامت خیز اٹھان ہے۔ اس میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی تابانی اور بغاوت کی جھنکار موجود تھی۔ مہجور چند نئے تصورات کا خالق ہو تو ہو مگر اس عظیم تاریخی شعور کی ہم نوائی اس کے بس کی بات نہ تھی جس کی قیادت آزاد نے کی۔ جہاں پر مہجور کے تصور کے پر جل جاتے ہیں۔ وہاں سے آزاد کی پرواز کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں''۔

اس دوران آپ پریم ناتھ بزاز کے اخبار ہمدرد اور پھر وتستا میں شعلہ افشاں ہوتے رہے۔ بزاز جیسے جوہر شناس نے آزاد کی فطری صلاحیتوں کو پہچان کر انہیں پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا2۔ اپنے استاد محترم سے نظریاتی اختلاف کے باوجود آزاد ان کی سوانح مرتب کرنے کے متمنی تھے۔ لیکن پھر انہیں یہ خیال آیا کہ اس تحقیق و تنقید کا دامن تمام کشمیری شعرا تک پھیلا دینا چاہئے۔ اس طرح آپ نے اس عظیم تحقیقی مہم جوئی کا بیڑا اٹھایا جسے ناقدین فن نے متفقہ طور کشمیری ادب کا ماونٹ ایورسٹ قرار دیا۔ اس عہد آفرین کارنامے کا نام تھا ''کشمیری زبان اور شاعری'' ٹینگ صاحب اس کی عظمت کا یوں تعین کرتے ہیں3۔

''یہ ایک زبان اور ایک تہذیب کی بہت ہی اہم اور سچے معنوں میں عظیم دستاویز ہے۔ یہ کشمیری زبان کی تاریخ و تنقید اور اس کی لسانی تہذیب کا اولین پتھر بھی ہے اور اس کی حیات نو کا سرچشمہ بھی۔ کانٹوں کی سوکھی ہوئی زبان کو پانی دینے آخر یہ کون سا آبلہ پا کن حالات میں اس وادی پُر خار میں آیا۔ آزاد نے بڑے حوصلے کے ساتھ اس کتاب کی شیرازہ بندی کی اور خون جگر کے چراغ جلا جلا کر اس گھٹا ٹوپ ظلمت میں علم کی کرنیں پہنچائیں۔ یہ

تذکرہ ہمارے ثقافتی ماضی کو ایک سنگم پر جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور آئندہ تحقیق و تنقید کی نئی راہیں روشن ہو گئی ہیں''۔

عبدالاحد آزاد کو اس کتاب کا مواد جمع کرنے میں بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ ریاست کے اطراف و اکناف میں گئے اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود اس کو ترتیب دینے میں سالہا سال تک عرق ریزی سے کام کرتے رہے۔ دراصل ایسی مہمیں فرزانوں سے سر نہیں ہوتیں۔ انہیں سر کرنے کے لئے عبدالاحد آزاد جیسے دیوانوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو تخلیق کے بیکراں جذبے سے سرشار ہوں جن کا جسم بھلے ہی نحیف ہو لیکن جن کی روح میں تحقیق کی تڑپ آگ بن کر تپ رہی ہو۔ جب یہ عظیم محقق بستر مرگ پر لیٹا تھا تب بھی اس کی حسرت بھری نگاہیں اپنی زندگی کے ماحصل ان بکھرے اوراق کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ اسے طبع کرانے کی سعادت سے بھی وہ محروم رہے تھے۔ یہ ۱۹۴۸ء کا سال تھا جب آپ عین شباب کے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

اس معرکۃ الآرا تصنیف کا پہلا حصہ مرزا کمال الدین شیدا کی مساعی سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ مرزا صاحب ریاستی کلچرل اکیڈیمی سے وابستہ تھے اور اسی ادارے کو ۱۹۶۱ء میں اس کے دوسرے حصے کی اشاعت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ کشمیری شعراء کے اس پہلے معتبر تذکرے کو ریاست اور ریاست سے باہر بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ پہلے حصے میں جہاں کشمیری زبان کی مبادیات پہ بحث ہوئی وہاں دوسرے حصے میں ساٹھ شعرا کے حالات زندگی درج کئے گئے۔ اس حصے کی ترتیب سو تہذیب اور حواشی محمد یوسف ٹینگ نے تحریر کئے ہیں اور اس حقیقت کا بلا

تامل اعتراف کیا جاسکتا ہے کہ ان کے حواشی سے اس تصنیف کی جدید کاری Update کرنے میں بہت حد تک معاونت حاصل ہوئی۔

یہ کتاب کشمیری شاعری کی تاریخ بھی ہے اس کا تذکرہ بھی اور تنقید بھی۔ شاعروں کی زندگی اوران کے کارناموں کی تلاش میں عبدالاحد آزاد نے سطحی اور سہل انگاری سے کام نہیں لیا۔ وہ سالہا سال تک اس علمی آوارہ گردی میں صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ آخر ان کی محنت رنگ لائی انہوں نے لگ بھگ پانچ سو سال تک احاطہ کیے ہوئیں بعض نئی حقیقتوں اور سچائیوں کو دریافت کیا۔ انہیں ایسے فن پاروں پر بھی اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے کام کرنا پڑا جو صدیوں کے بعد صحیح حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ جن تخلیقات کی موجودہ صورتیں کتنی تبدیلیوں Alterations، اضافوں Additions اور ترمیم و تخفیف Omissions کے بعد ہمارے سامنے آئیں تھیں۔ اگر فن پاروں کو اسی صورت میں جائزہ لیا جاتا تو یہ نہ صرف فن کا ایک غیر متعلق جائزہ ہوتا بلکہ یہ خود اس فن کار کے ساتھ بھی ناانصافی ہوتی۔ لیکن عبدالاحد آزاد جیسے بالغ نظر محقق نے ان لطیف نکات کی اہمیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا اور وہ ہر فن پارے پہ نقد و نظر کے ساتھ ہی حتیٰ الامکان ان باریکیوں پر بھی بحث کرتے رہے اور فن پاروں کے اصل شفاف چہروں پر صدیوں کے چھائے ہوئے کہرے کو بھی صاف کرتے رہے۔

آزاد نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے دور میں لل دید اور حضرت علمدار کشمیرؒ شامل ہیں۔ دوسرا حصہ حبہ خاتون سے شروع ہو کر محمود گامی تک کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ تیسرا حصہ محمود گامی کے بعد کے شعرا سے لے کر درویش

قادری تک محیط ہے۔ چوتھے حصہ کی شروعات وہ مہجور سے کرتے ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں شعرا پر فرداً فرداً تبصرے کئے ہیں اور ان کی زبان اور اسلوب پر دوسری زبانوں سے قبول ہونے والے اثرات کی کھوج کی ہے۔ غالباً ان کا میدان اتنا وسیع تھا کہ وہ ان اثرات کی تہہ تک جا کر اس کے اصل وجوہات سامنے لانے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ تاہم وہ رسول میر اور عبدالاحد ناظم تک کے اشعار میں فارسیت سے بیزار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

''ان شعرا کے سوچنے اور بولنے کا ڈھنگ فارسی سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں خیال بندی میں داخلی اور خارجی مواد کوشش سے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ لازمی طور ان میں کشمیریت بہت کم ہوتی ہے۔ غالباً اس وقت علمی محفلوں میں خالص کشمیری اشعار پسند نہیں کئے جاتے تھے۔ اس لئے ناظم اپنے ہم صحبتوں کو خوش کرنے کے لئے اپنے لطیف جذبات پر تکلّف کا رنگ چڑھاتے ہیں۔ غرض فارسیت کشمیری غزل کی عام خصوصیت ہے جو محمود گامی سے حقانی صاحب کے دور تک نمایاں ہے''۔

لیکن سنسکرت اور فارسی اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ آزاد نے کشمیری فضا کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کشمیری فضا کو جو فن پارے میں مختلف گوشوں سے جھانکتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے دیگر اصناف کے علاوہ دیہاتی گیتوں، وَنہٖ وُن، روف اور لڑی شاہ کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اس بسیط اور طویل تذکرے کی بے پناہ اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے علی جواد زیدی لکھتے ہیں4:

''آزاد، صحیح معنوں میں آزاد خیال تھے۔ انہوں نے تمام غیر صالح

رجحانات پر جی کھول کر تنقید کی ہے۔ انہوں نے کشمیری زبان کو زمین سے اٹھایا اور تخت پر بٹھایا ہے۔ وہ کشمیری کو بجا طور پر ہندوستان کی ایک اہم زبان مانتے ہیں ان کا فخریہ لہجہ جا بجا دیکھا اور پہچانا جا سکتا ہے لیکن یہ فخر اپنے ماضی کے صحیح احساس کی پیداوار ہے۔ آزاد کی نظر میں وسعت ہے ان میں تحقیق کرنے والوں کی ہمت اور صبر ہے۔ ان کے قلم میں روانی اور سلاست ہے۔ وہ صدیوں کے پردے چاک کرتے ہیں اور کم از کم چھ صدیوں پر پھیلے ہوئے مواد کو تین مختصر جلدوں میں یکجا کر دیتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے"۔

---

1 آزاد فکر و فن: ماہنامہ تعمیر ۱۹۶۱ء

2 آزاد کی وفات کے بعد پریم بزاز نے ان کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب "شاعرِ انسانیت" تحریر کی۔

3 کشمیری زبان اور شاعری (حصہ دوم) (دیباچہ) ص ۱۶

4 کشمیری زبان اور شاعری حصہ دوم مقدمہ ص ۱۲۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

پریم ناتھ پردیسی

آپ کا اصلی نام مدھوسودن تھا۔ آپ ۱۹۰۹ء میں سرینگر کے قلب مں واقع علاقے فتح کدل میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت مہادیو کول سادھو تھا جو ایک معمولی سرکاری ملازم تھے۔ آپ نے ۱۹۲۵ء میں باغ دلاور خان کے سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ لکھنے پڑھنے کا بے پناہ شوق تھا لیکن والد کے بے وقت انتقال کی وجہ سے خواب بے رحم حقیقت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا اور گھرانے کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔ آپ کے دادا پنڈت مکند کول سادھو کو اردو شعر و ادب سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ آپ کے یہاں اکثر ادبی محفلوں کا انعقاد ہوتا تھا۔ آپ بھی ان محفلوں کے دوران ایک گوشے میں سمٹے ہوئے علم و آگہی کے اسرار و رموز سے مستفیض اور محظوظ ہونے کی سعی کرتے۔ اپنی سوانحی مضمون ''میں اور میرے افسانے'' میں ان ابتدائی ایام کی یادیں شگفتہ کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:

''میں ان دنوں چھوٹا تھا اور دادا جان کی چلم پر آگ رکھنے کی ڈیوٹی میرے ذمہ رکھی گئی تھی۔ میں ایک کمرے میں بیٹھا ان بزرگوں کی بحثیں توجہ اور دلچسپی سے سنا کرتا اور متاثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کہانی لکھنا کیا

مشکل کام ہے۔ میں ضرور کہانیاں لکھوں گا۔ مگر دوسری مجلس میں جب شاعری پر بحث ہوتی تھی اور تڑپانے والے شعر سنائے جاتے تھے تو میرا ارادہ بدل جاتا اور میں شاعر بننے کی خواہش کرتا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب ایک صاحب نے منشی پریم چند کی کہانی ''بوڑھی کاکی'' سنائی تو میں ساری رات اس کی بے بسی پہ روتا رہا[1]''۔

یہیں محفلیں تھیں جہاں ایک حساس باشعور اور ذہین فن کار کا انہماک پروان چڑھتا رہا۔ ایک باصلاحیت کہانی کار کے فن کی تہذیب ہوئی چنانچہ پچھلی صدی کے تیسرے دہے کے دوران انہوں نے اپنی ذات کے کرب کو الفاظ کے مرمر میں تراشا۔ وہ رونق تخلص کرنے لگے لیکن شعران کے باطن میں دہکتی ہوئی اظہار کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکے۔ وہ اس صنف سخن سے جلدی ہی اکتا گئے۔ پھر ایک مختصر عرصے کے دوران وہ الف لیلیٰ دنیاوں کی رومانوی کہانی لکھ کر اپنے اندز کے فن کار کو آسودہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پریم چند نے اردو مین ایک نئے افسانوی ادب کی بنیاد ڈل دی تھی۔ پریم چند کے افسانے اور ''انگارے'' کی اشاعت نے پردیسی کے ذہن کو نئے رجحانات سے آگاہ کیا۔ ''انگارے'' کی کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی اور ان کی پیدا کی ہوئی عجیب وغریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں ہیں جن میں رورعایت کہیں نہیں ہیں اور بے باکی خیال ہر جگہ جھلکتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اردو کے افسانوں میں اس سے پہلے اتنی صاف گوئی اور بے باکی کہیں نہیں ملتی۔ لوگوں نے اب تک اپنی زندگی کے جن پہلوؤں کو دیکھ کر دیدہ دانستہ ان کی طرف سے چشم پوشی

اختیار کر رکھی تھی۔ ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے فنی جسارت سے کام لے کر پہلی بار ان پر روشنی ڈالی۔ ادھر ریاست میں بھی ڈوگرہ شاہی کے جبر واستبداد کے خلاف عوام نے تحریک آزادی کا طبل بجا دیا تھا۔ اس دوران آپ کی ملاقات ارض کاشمر کے ایک مقتدر صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز سے ہوئی۔ بزاز صاحب نے بھی آپ کو حقیقت نگاری کی طرف راغب کیا۔ وہ اب بتدریج خواب وخیال کے لق ودق صحراؤں سے نکل کر حقیقت نگاری کے نخلستان کی طرف بڑھنے لگے۔ آپ کی نثر اپنی معنویت کے دروازے کھولنے لگی۔ آپ عرصہ دراز تک رونق 'پریم ناتھ سادھو' پردیسی اور کئی دوسرے ناموں سے لکھتے رہے۔

''شام وسحر'' گو آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا لیکن یہاں ابھی فن کار تخلیق کے دھندلکوں میں کھویا سا نظر آتا ہے۔ رومانی آرزومندی کی چاہتیں اسے سر ابھارنے نہیں دیتیں۔ پردیسی کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ''دنیا ہماری'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی اس مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں2:

> ''یہ کہانیاں ''شام وسحر'' کی کہانیوں سے بہتر ہیں۔ یہ کہانیاں پر یسی کے بدلتے ہوئے شعور کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہاں نہ کوئی غصہ نہ کوئی جوش اور نا ہی کوئی تلملاہٹ نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں کی بنیادی خصوصیت انسانی نفسیات کا ادراک، انسانی دکھ کا احساس اور مصنف کا ہمدردانہ رویہ ہے۔ زبان بیان انتہائی سادہ ہے۔ نہ وہ شاعرانہ اسلوب ہے جو اس سے قبل کے ان کے افسانوں کا امتیاز تھا۔ یہ افسانے اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ہمیں کسی گہرے فلسفے دوراز کار

تخیل اور ان دونوں چیزوں سے وابستہ نکات کو دیکھنے کی دعوت نہیں دی گئی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے محسوس کر کے کہا گیا ہے اور برملا کہا گیا ہے۔ نہ ہی ان میں کوشش کی گئی ہے کہ مقام اوج کو کھینچ کر آخری سطر میں لایا جائے تاکہ مصنف کسی دوسرے ٹیکرے پر بیٹھ کر پڑھنے والے پر مسکرا سکے"۔

ان کہانیوں کے متعلق ہماری ریاست کے ایک منفرد نقاد برج پریمی ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں3۔

"پردیسی کی یہ کہانیاں ان کے متوسط دور کی کہانیاں ہیں۔ یہاں نہ وہ زندگی رینگتی ملتی ہے جو ان کے دور اول یا آخری دور کے بعض افسانوں میں ملتی ہے۔ نہ ہی وہ تنوع اور گہرائی جو ان کے آخری دور کی کہانیوں کا طرّہ امتیاز ہے۔ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ان میں بیشتر کہانیاں اپنی الگ اور منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ پردیسی نے یہ کہانیاں کافی غور وخوض کے بعد تحریر کی ہیں۔ ان میں ان کے مطالعے اور مشاہدے کا خلوص ملتا ہے۔ پردیسی کی یہ کہانیاں ان کے سکون، متانت اور شرافت نفس کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان کی تہہ میں ایک تند و تیز طوفان کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ "دنیا ہماری" کے موضوعات مختلف ہیں لیکن نفسیات کا ادراک ان کی قدر مشترک ہے۔ ان کہانیوں میں انسانی غم، انسانی بے چارگی اور انسانی قدروں کو پامال ہونے نہیں دیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر انسانی دکھ درد کی ٹیس روح کی جڑوں میں اتر جاتی ہے۔ پردیسی کا انداز بیان انتہائی سادہ ہے۔ یہاں نہ الفاظ کی شیرینی ملتی ہے اور نہ تشبیہہ واستعاروں کی بیساکھیاں۔ وہ کفایت

الفاظ کے فن کار نظر آتے ہیں......''

سچ پوچھیں تو اس مجموعے کی بیشتر کہانیوں کا مزاج کشمیری ہے۔ جس کے مختلف عناصر کو انہوں نے نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں محض تخیل کاری نہیں بلکہ رگ و پے میں طوفان کی طرح بھرنے والی عینیت ہے۔ زبان برف سے شعلہ بیانی کا یہ نیا انداز اس سرزمین کی مخصوص بو باس لئے ہوئے تھا۔ اردو افسانے میں یہ تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ یہاں کے سادہ لوح عوام کے ساتھ کرشن چندر اور عزیز احمد جیسے افسانوی دیوتاؤں نے بعض ایسی داستانیں منسوب کی تھیں جو غیور عوام کی عزت نفس کے لئے ایک کھلا چیلنج تھیں۔ اس مہمل، لغو اور بے بنیاد افترا پردازی کے خلاف پریم ناتھ پردیسی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ گئے۔ انہوں نے اپنی تحریر کی توانائی سے دنیائے ادب میں کشمیریت کی روح کو اجاگر کیا۔ ان کے افسانوں میں صدیوں کے جبر و ظلم سے کچلے ہوئے کشمیری کی پہلی صاف اور صحیح تصویر عکس ریز ہونے لگی۔ وہ کشمیری جسے ''بیگار'' جیسے مصائب و ابتلا کا نشانہ بنایا جاتا...... جس کی انمول نقش گری کو مٹی کے معاوضے میں تولا جاتا۔ جس کے دہقان بے پناہ عرق ریزی کے بعد بھی غربت اور جہالت کی تاریکیوں میں گھرے رہتے تھے۔

اس طرح پریم ناتھ پردیسی کشمیر کے پہلے ایسے اردو افسانہ نگار ثابت ہوئے جنہوں نے اپنی فنی بصیرت کی بنیاد پر اردو دنیا سے اپنا لوہا لیا۔ انہوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین ایک شاخ بھی قائم کی اور اس کی محفلیں آراستہ کرانے کے لئے مسلسل کام کرتے رہے۔ سیاسی تحریک کے ساتھ بھی ان کی وابستگی بتدریج

بڑھتی رہی۔ انہوں نے اپنے افسانوں سے ملک کے ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچادی۔ اس دوران اگر چہ وہ کسٹم واکسایز میں ایک معمولی عہدے پر کام کرتے رہے لیکن وہ شخصی حکمرانی کے خلاف عوام کی نفرت کو ''بالک رام باری'' کے نام سے بیان کرتے رہے۔

''بہتے چراغ'' آپ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ آپ کے انتقال کے بعد شایع ہوا۔ اس مجموعہ میں بیس کہانیاں شامل ہیں جو لگ بھگ سبھی آپ کے غیر مطبوعہ مجموعوں ''دھول''، ''کیچڑ کے دیوتا''، ''جنگ'' اور ''نغمہ'' سے لی گئی ہیں۔ یہ دراصل ان کی ۱۹۴۸ء تک کی لکھی ہوئی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں سہیل عظیم آبادی ان کے فنی مرتبے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں4:

> ''پردیسی کی زندگی کشمیر کے لئے تھی۔ ان کا فن کشمیر کے لئے تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اور ان کے افسانوں کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کا شاہد ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد کوئی شخص خود کو کشمیر اور کشمیریوں سے قریب محسوس نہ کرے''۔

''بہتے چراغ'' کے افسانوں میں ان کی فکر کا شباب جھلکتا ہے۔ یہاں فن کی انگلیاں زندگی کی نبض پر ہیں۔ سیدھے سادھے موضوعات کو وہ ایسی رفعت اور بلندی عطا کرتے ہیں کہ وہ آسمان کے تارے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض ہم عصر ادیب دوستوں کی طرح ذہن کے تاریک گھروندوں میں چھپ کر ادب کی تخلیق نہیں کی ہے۔ ان کا ادب سچا، حسین اور توانا ہے۔ انہوں نے خیال و بیان کی لطیف رعنائیوں کے ساتھ اپنی انفرادیت کو افسانے کے پیکر میں نمایاں کیا

ہے۔ یہاں وہ ہر اس واقعہ کو اپنا موضوع بنا لیتے ہیں جس میں انہیں انسان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ مناظر قدرت کا ذکر اگرچہ ان کی ان کہانیوں میں بہت کم ہوا ہے تاہم وہ کہیں کہیں ان مناظر کے رنگ و بو ہی سے اپنے افسانوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں۔ ''ڈھول'' کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

''پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے سے صبح کا مسکراتا ہوا سورج دو نیزے اوپر آ چکا تھا۔ اس کے قدموں کے آگے ڈل کی کشادہ پاٹ سے پرے بلیواڑ کی حسین سڑک پر سبزی سے بھرے چھکڑے شہر کی طرف دوڑ رہے تھے اور سڑک کے کنارے بنے بنگلوں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر ٹٹو والے گھوڑوں کی باگیں تھامے انتظار کر رہے تھے۔ اس نے مٹی کا گھڑا پانی میں ڈبو دیا اور خود بھی کسی خیال میں ڈوب گئی''۔

''بہتے چراغ'' سے ایک اقتباس:

''جہلم کے دونوں کنارے بے حد حسین نظر آ رہے ہیں۔ سیاحوں کی غیر معمولی آمد نے اس سال انہیں وقت سے پہلے ہی شباب اور حسن بخشا ہے۔ ہر ہاوس بوٹ میں قمقمے ہیں...... روشنیاں ہیں...... خوشبوئیں ہیں۔ اور نغمے ہیں اور ان کے ساتھ لگے ہوئے کچن بوٹوں سے سیاہ دھواں بے ترتیبی سے یوں اٹھ رہا ہے جیسے کسی رنگین وادی میں عیش پرستوں کے ساتھ ساتھ کوئلہ نکالنے والے مزدور آوارہ پھر رہے ہوں''۔

ایک اور افسانے ''نئی سڑک'' سے اقتباس:

''موسم کے چہرے پر وقت سے پہلے ہی جھریاں پڑ چکی تھیں۔ صبح

کی دھوپ بے جان اور میلی تھی اور لیٹے ہوئے ننگے کھیتوں میں ایسی نظر آ رہی تھی جیسے کسی ویران مکان میں غلیظ بتی کی مدھم سے روشنی ٹمٹمار ہی ہو۔ توت، چنار، اخروٹ اور بید کے درختوں پر نامحسوس قسم کا خوف لرز رہا تھا۔ گاؤں کی کچی سڑکیں سنسان اور عریاں تھیں جیسے کسی بڑھیا کا گریباں افلاس کی شدت سے ناف تک چاک ہو گیا ہو"۔

کشمیر کی بھوکی اور بلکتی ہوئی زندگی کی گھٹن آمیز تصویروں کو آپ نے اپنے خون جگر کے رنگوں سے پینٹ کیا ہے۔ آپ کے المیہ جذبات کی عکاسی میں غضب کی تاثیر بھری ہوتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً آپ کی وہ دردمندی اور غم آشنائی ہے جو ازل سے آپ کا مقدر رہی۔ انسانی نفسیات کا عمیق مطالعہ کر کے وہ واقعات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر مشاہدے کی باریک بینی سے اپنی تصویروں کو زیادہ پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً "کاریگر" ان کے ایک یادگار کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

"نفسیات کا معلم ایک نظر سے سنگار بکس کو دیکھ رہا تھا اور دوسری نظر سے دماغی حسن کے سراپا مجسمے کو۔ معاً اسے محسوس ہوا جیسے اژدھے کی چوبیں آنکھوں میں نفرت کشمکش اور انتقام کی بے پناہ آگ دہک رہی ہے اور جیسے وہ کرہ ارض کو ڈسنے اپنے زہر سے تباہ و خاکستر کرنے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔ اس نے دیر تک مام دین کے چہرے اور نحف جسم کی طرح خاموش مگر لرزاں نگاہوں سے دیکھا۔ یہی معمر کاریگر، یہی تانبے کی طرح سیاہی مائل سرخ اور نیم عریاں انسان مغرب اور مشرق سے اپنا انتقام لینے کے لئے بھاگا آ رہا تھا"۔ ان کے ایک اور افسانے "ان گوٹ" کا ایک حصہ:

دو پہر کو ہزاروں بچے اور ہمیشہ کے بیمار بھک منگے جمع ہو گئے تھے۔
دھوپ قدرے تیز تھی اور چاند ماری کے میدان کی گھاس مرجھا گئی تھی۔ لوگ برابر خیموں کی طرح بڑھے آرہے تھے جہاں چاول کے بورے رکھے گئے تھے اور مہاراجہ کے گارڈ پہرے پر حاضر تھے۔ میدان کے اردگرد بلند قامت چنار کھڑے تھے لیکن اس وقت ان کی زندگی بخش سائے بے حقیقت تھے۔ مضطرب بے چین روحیں خاموش خیموں کا طواف کرنے لگیں اور ٹٹولتی نظروں سے اندر جھانکنے لگیں...... چاول...... اتنے چاول آئے کہاں سے؟

''کیوں سنتری جی! چاول کس وقت میں ملیں گے''؟ ایک ادھیڑ عمر کے انسان نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پھیلا کر پوچھا۔

''چاول......؟ ہاں۔ شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے''۔ سنتری کا جواب سن کر دوسرے بھک منگے حاجت مند اور ناتواں بوڑھے نزدیک نزدیک آنے لگے سب کے چہروں پر پوشیدہ جذبات کی ایک سنہری لکیر سی نمودار ہوئی۔ بچے نے جو زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا چونک کر اپنا سر اوپر اٹھایا اور پوچھا۔ ''مجھے بھی ملیں گے......''؟ باپ نے ہنس کر کہا ''ارے ہاں تمہیں بھی......''

''اور اماں کو نہیں......''؟ بچے نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں اسے نہیں۔ وہ بیمار نہ ہوتی اور یہاں ہوتی جب ملتے''۔ بچے کی مسرت چراغ کی اس لو کی طرح بجھ گئی جسے اچانک پھونک مار کر بجھا دیا جائے۔

نئی صبح، دیوتا کہاں ہیں؟ خون اور اس کے سوغات، کتبے امام

صاحب، جواری، اجالے اندھیرے سبھی اسی طرز کی کہانیاں ہیں۔ ان میں دیہاتی زندگی کی معصومیت کا عکس بھی ہے اور شہری زندگی کی تلخیوں کی تصویریں بھی۔ یہ کہانیاں ان کے زخمی دل کی چیخیں ہیں جو ہمارے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہیں......

بعد کے برسوں میں پردیسی ریڈیو کی ملازمت میں آ گئے ریڈیو کے محاذ پر انہوں نے کہانیاں کم اور ریڈیائی ڈارمے اور فیچر پروگرام زیادہ لکھے۔ اگرچہ یہ پروگرام سیاسی نوعیت کے تھے لیکن پھر بھی ان سے ان کے وطن کے تعمیر نو کے جذبے اور امنگ کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ کئی مضامین، ایک رپورتاژ (پانچ دن) بچوں کے ایک ناول اور ایک نامکمل ناول ''پوتی'' کی تخلیق بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں صرف ۴۶ برس کی عمر میں آپ کا سورگباش ہوا۔

---

1 ماہنامہ فسانہ الہ آباد ص ۴ نمبر ۸

2 پردیسی: دنیا ہماری ص ۶

3 ذوق نظر برج پریمی ص ۴۲

4 بہتے چراغ: ص ۱۶

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

حامدی کاشمیری

آپ کا اصلی نام حبیب اللہ ہے۔ چنانچہ آپ اپنے شعری مجموعے "لاحرف" کے انتساب میں لکھتے ہیں: "حبیب کے نام...... جو میرا ہمزاد ہے"۔ آپ ۲۹/جنوری ۱۹۳۲ء کو سرینگر کے بہوری کدل علاقے میں پیدا ہوئے۔ آپ کی سخن فہم اور انسان شناس شریک حیات "مسرّہ مریم" اُن ابتدائی ماہ وسال کا یوں تذکرہ کرتی ہیں1:

"حامدؔی نے ایک مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ اُن کے والد ان کو بچپن میں صبح سویرے اٹھا کر اپنے ساتھ مسجد اور خانقاہوں میں لے جایا کرتے تھے۔ یہ عادت جوانی تک قائم رہی۔ آپ کے مزاج میں جو شرافت، قلندری، محبت، لاتعلقی، دردمندی، فقر، خودشناسی اور فن کارانہ جذبہ ہے۔ وہ انہوں نے اپنے خاندان سے وراثت میں پایا ہے۔ ان کا ایک مشترکہ گھر تھا۔ جو چند برس پہلے تقسیم ہوا ہے۔ والدہ ایک ذہین اور سیدھی خاتون تھیں۔ محبت اور خلوص کی دیوی۔ کشمیری شاعری کی رسیا۔ میں نے انہیں اکثر تنہائی میں حبہ خاتون کے اشعار زیر لب گنگناتے ہوئے سنا۔ حامدؔی کے کانوں میں اس شیریں گنگناہٹ نے بچپن ہی سے رس گھولا ہے۔ آپ کے والد صوفی مزاج

آدمی تھے۔ علالت کے باعث وہ کام کاج ترک کر چکے تھے۔ وہ حامدی سے
دیوانگی کی حد تک محبت کرتے تھے......"

حامدیؔ صاحب نے کالج کی طالب علمی کے ایام میں ہی ایک شاعر اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں آپ کا پہلا افسانہ "ٹھوکریں" ماہنامہ "شاعیں" (دہلی) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اردو کے مقبول اور معتبر رسائل میں آپ کے افسانے نمایاں طور شائع کئے جاتے رہے۔ بادام کے نوخیز شگوفوں کی رعنائیوں کے پس منظر میں آپ کا افسانہ "وادی کے پھول" افسانہ نگار کی روحانی آرزومندی کا نقش اول ہے۔ اس کی زبان نہایت شگفتہ اور مؤثر ہے۔ ۱۹۵۷ء میں "وادی کے پھول" کے عنوان سے سولہ منتخب کہانیوں پر مشتمل آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ لیکن اس سے قبل آپ کا پہلا ناول "بہاروں میں شعلے" شائع ہو چکا تھا۔ اس ناول کی زبان شاعرانہ ہے۔ اس میں آپ نے گرد و پیش کی سچی زندگی کو سادہ اور مؤثر طریقے میں پیش کیا ہے۔ یہاں آپ کے فن میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی بلکہ آپ نہایت معصومیت سے سرمایہ پرستی اور معاشرتی بھید بھاؤ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ اہل کشمیر کی زندگی کے عکاس بن کر اس ضخیم ناول میں مصوری کی نیرنگیوں سے بھی قاری کو محظوظ کرتے ہیں۔

روایات کے برخلاف حامدیؔ کاشمیری نے اردو میں ایم اے کرنے سے قبل انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ آپ اردو کے لکچرر مقرر ہونے سے پہلے انگریزی کے مدرس رہے۔ انگریزی ادبیات سے گہری وابستگی نے ڈاکٹریٹ کے لئے آپ کے تحقیقی مقالے "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" کی ترتیب و تہذیب میں آپ کی

کافی مدد کی۔ لیکن یہ بہت بعد کا سلسلہ ہے۔ اس سے قبل آپ کا دوسرا ناول ''پگھلتے خواب'' شائع ہوا۔ اس ناول کو ادارۂ بیسوی صدی نے شائع کیا تھا۔ عبدالقادر سروری اردو میں اچھے ناولوں کی کمی کے پیش نظر اس ناول کو ایک کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ مظہر امام اس کے بارے میں یوں فرماتے ہیں2:

''''پگھلتے خواب'' حامدی کاشمیری کا سب سے اچھا ناول ہے۔ اس ناول میں کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل کا اظہار فن کارانہ پختگی کے ساتھ ہوا ہے اور ایک خاص دور کی طبقاتی زندگی کی سماجی، سیاسی اور جنسی پیچیدگیوں کی تصویریں نمایاں ہوئی ہیں۔ ناول کی دلچسپی بھی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ پلاٹ کا تانا بانا خوب صورتی سے بُنا گیا ہے اور کردار مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی زندگی سے لئے ہوئے ہیں''۔

یہ وہ ایام تھے جب آپ شیریں اور البیلی یادوں اور حسین وجمیل خوابوں سے الجھتے رہے۔ حالانکہ زندگی نے ہر مقام پر آپ کے احساس کے آبگینوں کو چٹانوں سے ٹکرانے پر مجبور کر کے رکھ دیا لیکن آپ زخم کھا کھا کر سنبھلتے رہے اور مسکراتے رہے۔ آپ کو زندگی کی ہر ادا سے پیار رہا ہے اور جیسا وہ خود کہتے ہیں ''مجھے اپنے پیار پر اعتماد رہا ہے۔ یہ اعتماد مجھے اپنے فکروفن پر بھی ہے''۔ دراصل یہی اعتماد آپ کے احساس کی صداقت اور تجربات کے خلوص کا نقیب بنا رہا۔ اسی اعتماد کے سہارے تخلیق کے چراغ اور جگنوؤں کے قافلے روشن ہوتے چلے گئے۔ چند ہی برسوں میں (۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک) آپ کے دو اور ناول ''اجنبی راستے'' اور ''بلندیوں کے خواب'' منظر عام پر آئے۔ بلندیوں کے خواب پر آپ کو جموں وکشمیر

کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے انعام سے بھی نوازا گیا۔

اس ناول میں عصری رجحانات کا شدید احساس ملتا ہے۔ اس میں انسان کی بے چارگی کا فکر انگیز پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ جب بجلیاں بستیوں کو خاکستر کر دیتی ہیں، جب راستے بہہ جاتے ہیں، جب منزلوں کے نشان مٹ جاتے ہیں اور انسان سراسیمہ ہو جاتا ہے...... لیکن وہ زندہ رہتا ہے۔ وہ تاریکیوں کے امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس کی روح کے پردوں میں نئی صبحوں کے اجالے کسمساتے ہیں۔ دراصل یہ ان مسافروں کی کہانی ہے جو دل میں امنگوں اور آرزوؤں کا ارتعاش لئے پلکوں پہ خوابوں کے دئے جلائے، ایک طویل عرصہ کے بعد، اپنے وطن کی فضاؤں میں واپس جا رہے تھے۔ ان کی بس جموں سرینگر کے پہاڑی راستوں پر گزرتی ہے۔ ان راستوں کے چپے چپے پر موت کے پہرے ہیں۔ ایک معمولی سی غفلت ساری بس کو موت کے تاریک غاروں میں دھکیل سکتی ہے۔ لیکن اچانک راستہ خراب ہو جاتا ہے۔ بسوں کا روان رک جاتا ہے اور ناول کے مرکزی کردار کو جبراً و قہراً رات ایک گوردوارے میں بِتانی پڑتی ہے۔ وہ کئی دن تک دیگر ان گنت مسافروں کے ہمراہ برفستان کے اجاڑ ویرانوں میں مقید ہو کے رہ جاتا ہے......

اس ناول میں آپ کی فکر و نظر کے نہ جانے کتنے آئینے سامنے آتے ہیں جن میں قاری اپنی نفسیاتی باریکیوں اور اپنے رومانوی ذہن کے خدوخال کی جھلک دیکھتا ہے۔ لیکن لب و لہجے کے سوز و گداز کے باوجود آپ کی ان ابتدائی کاوشوں میں وہ شدید داخلیت نہیں ملتی جو ''نرگسیت'' کی انتہا پسندی کو نمایاں کرتی ہو۔ اس دور کی

اپنی نگارشات کے متعلق آپ خود لکھتے ہیں3:

''۱۹۵۰ء کے آس پاس جب میں نے لکھنا شروع کیا تو بیک وقت شاعری اور افسانہ نگاری کی جانب متوجہ رہا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۶۱ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''عروس تمنا'' منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے میرا ایک افسانوی مجموعہ اور تین ناول چھپ چکے تھے۔ اس دوران میں تنقیدی مضامین بھی لکھتا رہا۔ دس گیارہ برسوں پر محیط یہ دور میری ادبی زندگی کا ابتدائی دور کہلایا جاسکتا ہے۔ دراصل میں اپنے تخلیقی وجود کی شناخت کی پیہم جد و جہد میں مصروف رہا۔ فکشن کے روایتی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے میں دراصل دو باتوں کو زیادہ اہمیت دیتا رہا۔ اول، حقیقی زندگی کی الجھنوں کی تخیلی تشکیل۔ یہ گویا خارجیت اور مقصدیت کا رجحان تھا جسے میں اپنے ذہن وفکر پر حاوی محسوس کرتا رہا اور افسانے ناول لکھتا رہا۔ دوم شاعری کے حوالے سے ذاتی جذبات کی مصوری۔ میں اس مانوس راستے پر چلتے ہوئے مقبولیت اور شہرت کے فاصلے طے کرتا گیا لیکن ۱۹۶۰ء میں مجھے شدت سے محسوس ہونے لگا کہ روایت پرستی میرا راستہ نہیں ہے۔ مجھے تو منزل طلبی کے لئے دشوار گزار اور پُر پیچ راہوں سے گزرنا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء کے بعد میں فکشن سے قطعی طور دست بردار ہوگیا اور افسانہ نگاری کے لئے بے مصروف ہوگیا......''

لیکن ماہنامہ ''بیسوی صدی'' دہلی کے صفحات حامدؔی صاحب کے اس بیان سے انحراف کرتے ہیں۔ اس رسالے کے قارئین بعد کے برسوں تک بھی

افسانہ نگار کی حیثیت سے آپ کے فکر وفن کے معترف رہے۔ مثلاً جنوری ۱۹۶۵ء کے سالنامے میں آپ کا افسانہ ''جو تیری بزم سے نکلا'' شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسی الجھن کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جو جدید تہذیب کی سوغات ہے۔ ایک بیسوی صدی ہی نہیں اس زمانے میں آپ کے افسانے تعمیر، آج کل، شاعر، سب رس، کتاب، شب خون وغیرہ رسالوں میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں ایک سال تک اسسٹنٹ سکرٹری رہنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں آپ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۶ء میں آپ کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ پھر ۱۹۷۱ء میں ماہنامہ شاعر کے عظیم وضخیم ناولٹ نمبر میں آپ کا ناولٹ ''پرچھائیوں کا شہر'' شائع ہوا5 یہ حسن اور حیوانیت کی ایک مکمل داستان ہے۔ صفو اور افضل اس ناولٹ کے مرکزی کردار رہیں۔ صفو جس کا خارجی زندگی سے برائے نام تعلق تھا۔ شاہراہوں کی ہمکتی بھیڑ میں، سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہر جگہ وہ ایسا محسوس کرتی ہے کہ وہ اصل دنیا میں نہیں بلکہ پرچھائیوں کے شہر میں چل پھر رہی ہے۔ وہ زخموں سے چور اپنا وجود لے کر بہت دور تک اور بہت دیر تک محو سفر رہتی ہے۔ یہاں حامدی صاحب کا اندازِ تحریر اتنا شگفتہ، بے ساختہ اور حسین ہے کہ اہل کشمیر میں اس سے قبل کسی ادیب نے اتنی خوبصورت اردو نثر نہیں لکھی ہوگی۔ لفظوں کی تراش خراش، بندشوں کی نزاکت، مطالب کی گہرائی، مظاہر فطرت کی عکاسی اور انسان کی بہیمیت۔ یہ ناولٹ ان ساری خصوصیات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں معجزاتی طور قلم کار کے چھوتے ہی لفظ ہیروں کی طرح جگمگانے لگتے ہیں۔ ایسے لطیف الفاظ کا حساس ہوتے ہی شعور میں ایسی دھنک پھیل جاتی ہے کہ قلب و

ذہن منور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک نثر نگار کی مسحور کن صناعی کا لازوال نمونہ ہے۔ تاہم فکشن کی ان ابتدائی کوششوں میں مناظر فطرت کا رجحان اختصار کے بجائے تفصیل کی طرح ہے فطرت کی رعنائیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اکثر اپنے آپ کو اس کے ''رومان'' میں گم کر دیتے ہیں اور اس عالم گم گشتگی میں وہ ان مناظر کا ایسا سحر انگیز سماں باندھتے ہیں کہ انسان اور فطرت کی سرحدیں سمٹتی ہوئیں محسوس ہوتی ہیں۔ قاری اس طلسمی ماحول میں کھو جاتا ہے...... مخمور ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی معاملہ اعتدال کی حدوں سے تجاوز کر جاتا ہے اور پڑھنے والے کے لئے یہ گم گشتگی الجھن اور تھکن کا سبب بنتی ہے۔

اس سے قبل حامدی کاشمیری کے دو اور افسانوی مجموعے ''سراب'' اور ''برف میں آگ'' شائع ہوئے۔ پہلے مجموعے میں سراب کے علاوہ آگ اور دھواں ''نیا سفر، آخری سہارا، سائے، شہناز، رنگ اور روشنی، جلتا صحرا اور لمحوں کا سفر'' مجموعی طور دس افسانے شامل ہیں۔ وہ اپنے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہنے اور کسی نہ کسی نئے انداز سے پیش کرنے کے متمنی رہے ہیں۔ ان افسانوں میں بیان کی شگفتگی بھی ہے اور کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی لہر بھی...... ان میں اکثر کشمیر کی معاشرت اور معیشت کی صحیح مصوری کا عکس نظر آتا ہے۔ ''لمحوں کا سفر'' میں انہوں نے موضوع کو اپنے ذہن تخیل اور فکر کے مختلف عناصر میں گھلا ملا کر اسے ایک فنی تجربہ کی شکل دی ہے۔ اسے فن کے سانچے میں ڈھالنے سے پہلے اس کے مختلف اجزا میں موزونیت اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اس افسانے کی تخلیق میں پوری فنی صناعی اور فکر کا شباب نظر آتا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

"شیلا بے سدھ سوئی پڑی تھی، اس کے دونوں بازو کھلے پڑے تھے۔اس کے بال بے ترتیبی سے اس کے سینے پر پریشان تھے اور وہ ابھی تک کل والی سفید ساڑھی میں...... کمرے کی ہر چیز اپنی حالت میں تھی، لیکن...... وہ چونک اٹھے...... ڈرائنگ روم کی ایش ٹرے شیلا کے کمرے میں کیسے آ گئی تھی۔ایش ٹرے فرش پر تھی اور سگریٹ کے آدھ جلے ٹکڑوں کا یہ انبار...... معاً رات کی تصویر ان کی جلتی ہوئی بے خواب آنکھوں کے سامنے گھوم گئی، ان کی رگ رگ میں خون ابلنے لگا اور دوسرے ہی لمحے وہ دروازے سے آگے بڑھے۔وہ سوچ رہے تھے کہ نیلی کے لئے ایک اچھا لڑکا مل جائے تو وہ دونوں لڑکیوں کی شادی اسی سال کر دیں گے......"

ایک اور افسانہ "نیا سفر" مقامی بو باس لئے انسانی نفسیات کی تہہ در تہہ پیچیدگیاں اور اسرار واضح کرتا ہے:

"...... جب وہ اور غلام احمد کے ساتھ رحیم لنگو کے محلے میں آیا تو اسے ذرا بھی خوف نہ تھا۔یہ ٹھیک ہے کہ اب وہ ذرا کمزور ہو گیا تھا اور اسے بلغم کی شکایت رہنے لگی تھی لیکن پھر بھی پورے شہر میں اس کا دبدبہ قائم تھا۔کیا جوانی کے دنوں میں گانے بجانے کی محفلوں میں...... بادام واری کے شگوفوں کے میلے میں...... شیر اور بکرے کی لڑائی میں...... شراب خانوں میں اس نے تن تنہا بڑے بڑے رستموں کی شیخی کرکری نہیں کی تھی...... اور اب...... اب اس کا دست و بازو غلام احمد تھا۔غلام احمد جس کا ماتھا لوہے سے بھی زیادہ سخت تھا اور جس کے پٹھوں میں فولاد کی سی سختی تھی...... ایک دن موسم بہار میں جب

کہ شالیمار کے باہر ڈل کے لمبے کنارے پر ڈونگوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔
لوگ بڑی تعداد میں سیر کو آئے تھے۔ایک بڑے ڈونگے میں بچہ نغمہ ہو رہا تھا۔
یہ اس کا جاننے والا محبوب رقاص تھا۔خوب صورت خدوخال والا۔وہ جونہی
ڈونگے کے اندر آیا وہاں اس کا پرانا حریف علی گنائی گا و تکیے......"

"مقامی رنگ" کے افسانے ہماری افسانہ نگاری کے ہر دور میں لکھے گئے اور ہر دور میں یہ رجحان افسانے کی معنوی اور صوری ترقی کا ضامن بنا۔لیکن حامدیؔ کاشمیری کے یہاں افسانوں میں یہ روش اور میلان اکثر ایک فنی احساس کا مظہر بن کر ابھرتا ہے۔اس رجحان نے ان کے افسانوں کی کشش اور تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔حامدیؔ کے بعض ہم عصر کشمیر سے باہر کے افسانہ نگاروں نے بھی اس روش کو اپنایا ہے اور بے تحاشہ اپنایا ہے لیکن ان کے عمل میں کاوش اور انہماک کی کمی اور سہل انگاری کا غلبہ ہے۔حامدیؔ نے مقامی رنگ کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی بازیافت کا بیڑا اٹھایا اور اس معاملے میں وہ اپنے تمام معاصرین کے فنی علم بردار بنے رہے۔ اس چیز نے ان کے فن کو ایک نیا پن اور انفرادیت بخشی۔

ان کے ایک اور افسانے "رنگ اور روشنی" کا موضوع دل اور روح کی دنیا ہے۔دل کی بستی پہ ان کی یہ دستک اسی شاعرانہ اندازِ بیان کی مدد سے سنائی دیتی ہے۔لیکن اب ان کا لہجہ زیادہ معتدل، متوازن اور شیریں ہے۔اس افسانے سے یہ چند سطور پیش ہیں:

"......اسے دکھائی دیا جیسے سارا کمرہ خطوں سے اٹ گیا اور ساری
کائنات پر محبت نامے بکھرے ہوئے ازلی اور ابدی رشتوں کے اسرار کے دفتر

کھول رہے ہیں...... کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے...... جہاں بظاہر یہ ڈوبتی ہے...... وہیں اس کا طلوع بھی ہوتا ہے''

''برف میں آگ'' کے افسانوں کے بھی وہی دیکھے بھالے اور سمجھے بوجھے موضوع ہیں جو ہمیشہ سے حامدی کی نگاہوں میں سمائے ہوئے ہیں اور جنہوں نے ان کے دل کے گوشے گوشے پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ان کا پس منظر اب بھی اکثر صورتوں میں وہی ''مقامی رنگ'' لئے ہوئے ہے۔ لیکن ان افسانوں میں ماحول اور کردار کے درمیان اتنا گہرا ربط اور مطابقت ہے کہ چھوٹے چھوٹے مناظر میں اور کرداروں کی زبان سے نکلی ہوئی چھوٹی سے چھوٹی بات میں ہمیں صدیوں کی روایت کا گہرا عکس صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ بعض افسانوں میں درد کی ایک کسک بھی ہے لیکن یہ کسک تلخ نہیں بلکہ یہ نسیم بہار کی طرح لہراتی ہے۔ غالباً اس کی بڑی وجہ ادبیت اور شعریت کا وہ عکس ہے جس سے کبھی کبھی سیدھی سادی بات بھی کوئی حسین نظم معلوم ہونے لگتی ہے لیکن کہانی کے ڈھانچے اور اس کی تہذیب میں بھی ایک نظم رہتا ہے...... ہر چیز میں ایک ہمواری ہوتی ہے ایک سکون رہتا ہے۔ سندری، برف میں آگ، کشمکش، اندھیروں سے روشنی تک اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں۔

اس دوران حامدی صاحب نے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش (حیدر آباد) سے ڈگری لی۔ بعد کے برسوں میں انہوں نے افسانوی ادب تخلیق کرنے سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ان کی ساری توجہ اب شعر و شاعری اور تنقید کی طرف مبذول ہوئی۔ ان کے تنقیدی مضامین ملک کے بعض معتبر رسائل میں شامل ہونے لگے۔ ان کا تخلیقی سفر ایک ایسے نقطے سے شروع ہوا جہاں وہ موجود اور قابل شناخت

معروضی حقیقت سے انقطاع کرنے لگے 5 اور خالصتاً شخصی سطح پر شعور اور لاشعور کے عمل اور ردِ عمل کے تحت خوابوں کی دھند میں کسمساتے ہوئے وحشی، نادیدہ اور نادرہ کار پیکروں کی شناخت کرنے لگے۔ یہ سیال پیکر ان کے داخلی وجود کا ناگزیر حصہ بن گئے اور بقول ان کے وہ ان کی دریافت و تجسیم کے عمل میں دراصل اپنے وجود کی سیاحت کرنے لگے...... اب انہوں نے روایت پرستی تیاگ دی۔ وہ لامتناہیت کا ادراک کرنے لگے۔ ان پہ اجتماعی عقائد کی بے معنویت واضح ہونے لگی۔ ذہنی آزادی کی جانب یہ ان کا پہلا قدم تھا۔ ''جدید اردو نظم اور یورپی اثرات'' ان کا پہلا تنقیدی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں 6۔

''حامدیؔ نے بڑی عرق ریزی سے جدید اردو نظم کے صوری اور معنوی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ اردو نظم پر یورپی اثرات کی نشاندی کر کے ایک خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مطالعہ حالیؔ اور آزادؔ کے عہد سے لے کر ۴۷ تک کی نظمیہ شاعری پر محیط ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے تحقیقی نوعیت کے ہیں، جہاں انہوں نے اردو شاعری کے دور قدیم میں نظم کی اصطلاحات کی روایات اور اس کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا ہے۔ اس کے بعد کا حصہ تنقیدی ہے''۔

''غالب کے تخلیقی سر چشمے'' ان کی دوسری گراں قدر کتاب ہے جس نے ان کی محققانہ اور ناقدانہ جینیس کا اظہار کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے مرزا غالبؔ کی تخلیقی فضا کا سراغ لگانے کے لئے متعدد طریقے اختیار کئے ہیں۔ کہیں نفسیات کا سہارا لیا ہے اور کہیں لسانیات کا۔ ان کے سہارے انہوں نے غالبؔ کے باطن میں

کسمساتے ہوئے تخلیقی تجربوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ تنقید کا یہ شعور ان کی Consciousness کا اعتراف ہے۔ انہوں نے بعض دیگر محققین کی طرح کتاب میں سوانحی، تمدنی اور معاشری حالات کے انبار نہیں لگائے ہیں۔ انہون نے صرف فن کو کلیدی حیثیت دی ہے۔

''نئی حسیت اور عصری اردو شاعری'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس ذہنی فضا کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جس میں جدید شاعری آج پروان چڑھ رہی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ شمس الرحمان فاروقی اور دیباچہ محمد یوسف ٹینگ کا لکھا ہوا ہے۔ اس تفصیلی تجزیے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''موج نگاہ'' ہے جس میں عصری شاعری کے محرکات کی تلاش کی گئی ہے اور اس کے پس منظر پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب ''سرحدِ ادراک'' ہے جس میں عصری شاعری کے منفرد کردار کا تذکرہ ہے۔ کتاب کا تیسرا اور آخری باب ''دیدۂ خواب'' ہے۔ اس باب میں ۱۹۵۵ء کے بعد کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہمیں ایک نئی تنقیدی بصیرت سے آگہی دلاتی ہے۔ جدید دور میں انسان نے پیش رفت کی جن نئی منزلوں کو سر کرلیا اور ترقی کے جس آسمان کی طرف وہ برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے اس میں تنقید نگار پرانے گھسے پٹے پیمانوں سے تخلیقی سرچشموں کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ اس کے لئے ضروری بن جاتا ہے کہ وہ بھی ان نئی وسعتوں میں خود کو مستغرق کردے تب جا کر وہ تخلیقات کو صحیح طور پر پرکھ سکتا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب ''سرحدِ ادارک'' کا جائزہ لیتے ہوئے غلام نبی فراق یوں فرماتے ہیں7:

''اس باب میں ماہرین نفسیات کی انسانی نفسیات سے متعلق جدید دریافتوں اور باقی باتوں کے علاوہ ان دوسری بنیادی حقیقتوں کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے جو نئی شاعری میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں شاعری کا نظریاتی وابستگیوں سے لاتعلق ہونا، زندگی کی بنیادی سچائیوں کی بصیرت کا حصول اور عصری حسیت سے تخلیقی بازیافت شامل ہے۔ حامدؔی صاحب ان سچائیوں کا اس لئے بھی تذکرہ کرتے ہیں کیوں کہ ۱۹۵۵ء سے پہلے سالہا سال برصغیر میں اردو شاعروں اور ادیبوں کے لئے نظریاتی وابستگیوں سے عاشقانہ حد تک تعلق بڑھ گئے تھے اور عصری حسیت کی تخلیقی بازیافت مشکل سے نظر آتی تھی۔ چنانچہ اس دوران جو ادب پیدا ہوا اس کا بہتر حصہ اگرچہ زیادہ سطحی نہیں تھا تاہم اس میں گہرائی بھی نہیں تھی۔ مصنف نے ان انوکھی اور حیرت انگیز تبدیلیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے جنہیں جدید علوم نے جنم دیا۔ اس سچائی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ ان ایجادات کی بدولت کس طرح مذہب اور سیاست کے بارے میں انسان کے سوچنے کا ڈھنگ متاثر ہو کر بدل گیا۔ حامدؔی صاحب جدیدیت کے رجحانات سے بوکھلانے والے معترضین کو خاموش کرنے کے لئے اس ثقافتی تصریف اور امتزاج کا برمحل تذکرہ کرتے ہیں جس کا عمل حسب سابق آج بھی اس ملک میں جاری ہے...... لیکن آج کا شاعر قومی حدود میں رہ کر بھی بین الاقوامی وسعتوں سے ہمکنار ہونا پسند کرتا ہے۔ دیگر کئی باتوں سے قطع نظر حامدؔی صاحب کی یہ کتاب مجموعی طور ایک کارآمد اور سنجیدہ کوشش ہے۔ روایتی اعتقادات کی بے چارگی نے جو انقلاب پیدا کیا ہے اس سے ادب کے

رجحانات میں کیا تغیر ہوا''

آج کا انسان آگہی کے کرب میں جل رہا ہے۔ وہ اپنے ریزہ ریزہ وجود کو یکجا کرنے کی کوشش کرر ہا ہے۔ لیکن وسوسوں اور شکوک کے پھنکارتے ہوئے سانپ اس کی جانب تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ یہی شکست وریخت اس کا مقدر ہے اور یہی عصری شاعری کے ذہنی سفر کی داستان ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے نہایت خوبی اور تنقیدی بصیرت سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ مفید میزان بلا شبہ ان کے نقد ونظر کا ایک شاہکار ہے۔

''اقبالؒ اور غالبؔ'' ایک اور تنقیدی کتاب ہے جو ان دو عظیم المرتبت شعرا کے شخصی اور فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ شاعری کی تعریف، دوسرا غالبؔ اور اقبالؒ کی جدت پسندی اور تیسرا حصہ اقبال کے تخلیقی عمل پر مبنی ہے۔ اس کتاب پر بعض یارانِ نکتہ داں8 نے یہ تنقید کی ہے کہ متضاد فن کاروں میں کسی قسم کی مشترکہ خصوصیت تلاش کرنا کلچر سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ غالبؔ کے زمانے میں ہندوستان کی روایتیں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ غالب مغلیہ تہذیب کے اجڑ جانے کی خستہ علامت بنے رہے۔ دوسری طرف اقبال کے زمانے میں ہندوستانی کلچر کی شیرازہ بندی کی سعی کی جارہی تھی۔ اقبال کو اس لحاظ سے غالب کے حوالے سے سمجھا نہیں جا سکتا اور نہ غالبؔ کو اقبال کے حوالے سے پہنچانا جا سکتا ہے۔

''کارگہہ شیشہ گری'' ان کی ایک اور تصنیف ہے۔ اس میں میرؔ کی شاعرانہ عظمت او اس کے تخیل کی انوکھی کائنات پہلی بار دریافت کی گئی ہے۔ یہ ڈاکٹر

صاحب کے سلسلہ تنقید و تحقیق کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ جو میرؔ کی معنویت کو پرکھنے کے سلسلے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ آپ نے حالیہ برسوں کے دوران اپنے ادبی مانومینٹ کی جونئی منزلیں تعمیر کی ہیں۔ اُن سے آپ کے ارادوں کی توانائی کا عندیہ ملتا ہے کہ وہ ابھی کوئی اور منزلیں تعمیر کریں گے اور پھر آپ کی تخلیقات کا تاج محل بلا شبہ اپنی مثال خود آپ ہوگا۔ دریں اثنا ''کارگہ شیشہ گری'' کے بعد علامہ اقبالؒ کے مطالعے پر مبنی آپ کی کتاب ''حرفِ راز'' منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب شاعر مشرق کے فنی مزاج اور تخلیقی عمل کی تفہیم کراتی ہے۔ ''ناصرؔ کاظمی'' ایک اور نسبتاً مختصر کتاب ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ آپ کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ''امکانات'' اور ''تفہیم وتنقید'' نام کے ان مجموعوں میں بھی میرؔ، غالبؔ اور اقبالؒ جیسے مرغوب موضوعات پر آپ کے مضامین ملتے ہیں۔ کچھ مضامین نئی نظم، نئی غزل اور نئی تنقید سے متعلق بھی ہیں۔ یہ کتابیں آپ کی ادبی شخصیت کے ہمہ پہلو رخ سامنے لاتی ہیں۔ یہ سبھی رخ نہایت روشن اور واضح ہیں۔ آپ کے قلم کی شہہ زوری نے آپ کو عہد حاضر کے سب سے باوقار ناقد کی حیثیت سے مقبول کیا۔ اس سلسلے میں مظہر امام لکھتے ہیں۹:

''حامدیؔ کاشمیری اپنے تنقیدی مؤقف میں بہت واضح رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے بار بار اس خیال کا اعادہ کیا ہے کہ شاعر کے تخلیقی ذہن تک رسائی محض اس کی حقیقی زندگی ماحول اور عہد کی ترجیحات کا محاکمہ کر کے نہیں حاصل کی جا سکتی۔ دراصل خالق کی داخلی شخصیت کے ازلی تخلیقی سرچشموں کا کھوج لگانا ہی تنقید کا فریضہ ہے۔ چنانچہ آپ نے نئی

تنقید کی محدودیت کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے وضع کردہ نظریہ نقد پر روشنی ڈالی، جیسے آپ نے اکتشافی تنقید سے موسوم کیا اور کہا کہ اس نوع کی تنقید کی ضرورت کا احساس اردو ہی کیا یورپی زبان میں بھی تقریباً ناپید ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اسے خانہ ساز نظریہ تنقید سے تعبیر کیا۔ لیکن حامدؔی کاشمیری نے اس نوع کے ردعمل کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور اس سلسلے میں ایک مفصل کتاب بعنوان ''معاصر اردو تنقید نئے تناظر میں'' تحریر کی جو زیر اشاعت ہے''۔

اکتشافی تنقید سے متعلق آپ کی معروف تنقیدی تھیوری دراصل آپ کی ہمہ جہت اور کلاسیکی شخصیت کا ایک عہد آفریں اظہار ہے۔ کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر نذیر احمد ملک، اردو زبان وادب پر ایک اتارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

''پروفیسر حامدؔی اردو کے واحد نقاد ہیں جنھوں نے رائج گوناگوں تنقیدی نظریات کے باوجود تفہیم ادب کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے وہ اردو کی نئی نسل میں اعتبار اور استناد کا درجہ حاصل کر رہا ہے''۔

اردو ادیبوں کے نمائندہ وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے حامدؔی صاحب نے جنوری ١٩٨٦ء میں پاکستان کا سفر کیا۔ ''انجمن آرزو'' نام سے شائع ہونے والا سفر نامہ اس کی روداد ہے۔ بقول مظہر امام حامدؔی کے نزدیک سفر نامہ تجربات وواقعات اشخاص اور مناظر کے بارے میں شخصی تاثرات کی باز آفرینی ہے۔ یہ سفر سے متعلق صرف خارجی حالات وواقعات کا حقیقی بیان

نہیں ہوتا بلکہ یہ سفر کرنے والے کی شخصیت اور اس کے داخلی رد عمل کی مصوری بھی ہوتا ہے۔ اس سفر نامے میں دلچسپی کے بہت سے عناصر موجود ہیں اور قاری ہر لمحہ اپنے آپ کو اس سفر میں شریک سمجھتا ہے۔

۷/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے براڈوے ہوٹل کے دیوان خانہ میں ''ممتاز ہم عصر کے ساتھ ایک شام'' سلسلے کے تحت آپ کے اعزاز میں ایک یادگار تقریب کا انعقاد کیا۔ اس پر شکوہ تقریب میں ریاست کے معروف قلم کاروں نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر حامدی صاحب نے اپنی دو درجن سے زائد مطبوعہ کتابوں کی نمائش کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد جناب محمد یوسف ٹینگ نے حکایتی انداز میں حامدی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے ان کے تخلیقی سفر کا ایک دلچسپ جائزہ پیش کیا۔ حامدی صاحب کی اعزاز پوشی کی اس تقریب کا یہ ایک دلچسپ حصہ تھا پیش ہے اس جائزے سے ایک اقتباس:

''حامدی کشمیر کے مکتب اردو کی پہچان بھی ہے اور عنوان بھی۔ اس کا ڈنکا ہر اس جگہ بجتا ہے جہاں اردو کا زمزمہ گونجتا ہے۔ حامدی ایک نا آشنا دیس میں ہمارا ادبی سورما ہے اور یہ بات ہمیں بھاتی ہے۔ حامدی نے اپنی خلوت کو اپنی گوہر ریزی کا قلزم بنا دیا ہے۔ آج کی نقش آفریں زندگی میں اسے بقول فیض

پکارتی رہیں بانہیں بدن بلاتے رہے

لیکن وہ ان سب جناتی فریبوں اور آسیبی گردابوں کو جھٹک کر فوراً اپنے

خلوت کدے میں روپوش ہو جاتا ہے اور پھر اعتکاف کے بعد اپنی ہتھیلی پر نگارشات کے روشن چراغ لے کر برآمد ہوتا ہے۔ یہی اس کا ارتقاء بھی ہے اور ارتفاع بھی۔ کشمیر کے معاصر منظر نامے میں جہاں ہمارے مٹی سے ہماری ضروریات کی سبز ترکاریاں بھی بقدر ذوق نہیں ابھرتیں علم وادب کے اس راہب اور سعی وطلب کے اس کاہن کا وجود ایک نئی امید بن کر چمکتا ہے۔ اکیڈیمی آج اس قابل تعظیم معاصر انفرادی لب ولہجہ کے نقاد اور ایک شناختی آواز کے شاعر کا استقبال کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں رنگین ورق جوڑ رہی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ مقام بھی اس کی پیش قدمی کا صرف ایک پڑاؤ ہے اور وہ برابر سلسلہ ہائے کوہ کی تسخیر پر تسخیر کے کارنامے انجام دے رہا ہے۔ لیکن یہ شرف کیا کم ہے کہ ہم نے ''کوہ ندا'' کی طرف جاتے ہوئے اس زینے پر اس کے ہاتھ میں ایک جام تھما دینے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ہم اپنے اس پانچویں درویش کی شان میں اسی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے دلی فرحت محسوس کرتے ہیں۔

کچھ ایسی روشنی پھوٹی گی اس کی آنکھوں سے　　قدیم تیرہ سمندر بھی جگمگائیں گے

---

1 ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی: گوشہ حامدی کاشمیری ۱۹۸۵ء

2 ۷/اکتوبر ۱۹۸۹ء کی اس تقریر سے اقتباس جو ہوٹل براڈوے (سرینگر) میں ادا کی گئی۔

3 میرا تخلیقی سفر: حامدی کاشمیری: شیرازہ جلد ۲۴ شمارہ تین ص ۲۱

4 ماہنامہ شاعر (ممبئی) ناولٹ نمبر ص ۳۹۳

5 نایافت: حامدی کاشمیری ص ۱۱

6 اردو تنقیدی وتحقیق: ڈاکٹر برج پریمی تعمیر اگست ۱۹۸۳ء ص ۶۸

7 شیرازہ جلد ۱۴ شمارہ ۶ نئی حسیت اور عصری شاعری غلام نبی فراق ص ۱۲۱

8 اقبال اور غالب: تعمیر جون ۱۹۸۰: اقبال فہیم جون ۱۹۸۰ء تعمیر۔

9 شیرازہ نومبر دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۲

10 بازیافت: دسمبر ۱۹۹۸ء پروفیسر نذیر احمد ملک ص ۱۱

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

پریم ناتھ در

بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں ہندوستانی ادیبوں نے کشمیر کے موضوع پر جو افسانے اور ناول لکھے ان میں گیارہ ہزار فٹ کی بلندیوں پر چناروں کے سائے نظر آتے، گلمرگ میں جہلم بہتا اور نرگس کے پھولوں اور نیلی جھیلوں کے درمیان باہر سے آیا ہوا افسانہ نگار جوں ہی پاوں رکھتا تو سیب جیسی گالوں والی عورت اس کو ٹیلے کے پیچھے ایزار بند کھولے ملتی تھی1۔ ان افسانوں میں مقامی مسائل کی روح کو پہچاننے کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔ کشمیر میں افسانہ نگاری کی شروعات دراصل ان ہی خودساختہ ادیبوں کے خلاف نفرت کے جذبے سے ہوئی۔ پریم ناتھ پردیسی کے ساتھ ساتھ اس کارواں میں پریم ناتھ در پیش پیش رہے۔ انہوں نے اس جنت بداماں وادی کے حسین چہرے پر موجود داغوں اور زخموں کی نشاندہی کی۔

پریم ناتھ در ۲۵ جولائی ۱۹۱۴ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ اعلا تعلیم کے لئے لاہور گئے۔ وہ کارل مارکس اور لینن کی تحریروں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے رہے اور ان سے بہت حد تک متاثر ہوئے۔ انہوں نے ان تخلیقات کے متعدد

عناصر کو اپنے افسانوں میں سمونے کی بھرپور کوشش کی۔ ان میں بے پناہ جوش ولولہ تھا آہنی عزم تھا اور عقاید وافکار کی ایک زبردست آگ ان کے سینے میں سلگ رہی تھی۔ ان کے گردوپیش میں ایک قوم صدیوں کے جبر کے بعد کروٹ بدل رہی تھی۔ ایک سیاسی انقلاب کا جوالامکھی کھول رہا تھا۔ وہ بے خطر سیاسی تحریک میں کود پڑے۔ چنانچہ ہل والے سرخ جھنڈے اس کا بنیادی ڈیزائن 2 اسی جوشیلے افسانہ نگار کے زرخیز تخیل کا اعجاز تھا۔

در صاحب کی پہلی کہانی ۱۹۴۵ء میں لاہور کے ماہنامہ ''ادبی دنیا'' میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد ان کے افسانے مسلسل شایع ہوتے رہے۔ ان کا ہر نیا افسانہ اپنے عہد کے تضادات کی سچی دستاویز بن کر سامنے آتا۔ ان کی کہانیاں ستائے ہوئے انسانوں کے دکھ درد کو فخر کے احساس کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں نفسیات کا تحلیلی تجزیہ ان کی خلاقیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں مصالحت کے خلاف بغاوت ہے۔ بے نیازی کا احساس اقتدار کے خلاف کھڑے ہونے کی جرات دیتا ہے۔ یہ بے نیازی در صاحب کا عظیم ورثہ ہے جس نے ان کے فن کو ایک نیا احساس ایک نئی سمت دی ہے۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے وطن کے عوام کی تہذیبی زندگی کو دریافت کیا اور اسے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔!

۱۹۴۹ء میں پریم ناتھ در کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کاغذ کا واسدیو'' حلقہ ارباب ذوق (دہلی) کے اہتمام سے شایع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے پہلے ہی وہ اردو افسانے کے خلا میں ایک گونج پیدا کر چکے تھے لیکن اس کی اشاعت کے بعد یاران نکتہ دان نے ایک زبان ہوکر ان کے عظیم الشان عطا کا اعتراف کیا۔

انہوں نے افسانے کی ہیّت میں نئی اور کامیاب تبدیلیاں کیں۔ ان کے اس مجموعے کے اکثر افسانے ایک نئی شگفتگی سے معطر تھے۔ ان میں حسین وادیوں کے پس منظر میں مریضانہ عشق کی داستانوں کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اپنی فن کارانہ بصیرت سے اپنے کرداروں کا باطن بے نقاب کر کے رکھ دیتے تھے۔ سطح آب کی ظاہری شانت دنیا کے نیچے ذات کے پاتال کی عمیق گہرائیوں میں وہ اپنی نگاہ سے حقیقت کا بے حجاب نظارہ کرتے۔ اس نظارے کی فن کارانہ پیش کش ان کی کہانی کو عالمی معیار کی حد تک لے جاتی۔

ان کے دس افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ''نیلی آنکھیں'' ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کی تخلیقی سفر کی ایک نئی رفعت تھی۔ اس میں نیلی آنکھیں کے علاوہ بھوت پریت، ویسے کا ویسا، زندگی کا گھونٹ، گدھ، فائدہ بے فائدہ، بیچ اندھیرے دودھ اور نیلی بوتل کے عنوان سے افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں عرفان و آگہی کی ایک نئی کائنات اجاگر ہوتی ہے۔ تخیل اور تحریر کا ایک مچلتا محشرستان بیدار ہو اٹھتا ہے۔ ان میں سے بعض افسانوں کی تکنیک بالکل انوکھی تھی۔ مثلاً ''دودھ'' میں شعور کی رو کا تجربہ کیا گیا۔ نفس کی بے پایاں گہرائیوں میں اتر کر بعض ایسے کرداروں کو جنم دیا گیا جو فکشن کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ رجحان ان کے ہم عصر افسانہ نویسوں کے ہاں عنقا تھا۔ لیکن ان ہی رجحانات پر آج ''جدید ادب'' کی اساس رکھی جاتی ہے۔ اس بات کا عندیہ ممتاز نقاد مولانا صلاح الدین احمد نے اس وقت دیا تھا جب ۱۹۴۷ء کے آس پاس در کا افسانہ ''غلط فہمی'' ادبی دنیا میں شائع ہوا تھا۔ صلاح الدین رقم کرتے ہیں:

"پریم ناتھ در ہمارے افسانوی افق پر طلوع ہوتے ہی چمک اٹھا ہے وہ ہمارے موجودہ استادوں کو بھی آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا...... میں نے در کے بارے میں پہلے بھی جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوگی۔ کہاں ہیں وہ افسانہ نگار جو کہتے ہیں کہ انہوں نے عظیم افسانے لکھے ہیں۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ افسانے یہ ہوتے ہیں (چائے کی پیالی کو) داخلیت اور نفسی تجزیہ کا معیار سمجھنے والے یہ جان لیں کہ اس معیار کے حدود ابھی اور آگے ہیں"۔

در صاحب نے اسی زمانے میں حلقہ ارباب ذوق کی محفلیں دہلی میں سجائیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ان یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں3:

"جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آگئے تو دہلی میں جو سب سے پہلی ادبی مجلس جمی وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی در کے گہرے دوست تھے۔ دونوں نے مل کر حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی اس کی مجلسوں میں اردو کے نامور ادیب شرکت کرتے تھے جن میں ظہور الدین شیر محمد اختر خورشید الحسن، محمد حسن عسکری، اعجاز بٹالوی، غلام عباس، رفیق خاور، تابش دہلوی عبادت بریلوی، ن م راشد، جوش، اشک اور شاہد احمد دہلوی شامل تھے"۔

پریم ناتھ در انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" "اسٹیٹمین" اور آل انڈیا ریڈیو کے رسالے "آواز" کی ادارت میں شامل رہے ہیں۔ ۲۹/اگست ۱۹۷۱ء کو ٹائمز آف انڈیا (نئی دہلی) کے نامہ نگار کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے پریم ناتھ در نے

کہا کہ ایک اچھی اردو کہانی میں موزوں، توازن، پلاٹ، کردار نگاری اور ماحول ہونا چاہیئے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک ہی کہانی کو اہم نہیں بناتا بلکہ ان کا امتزاج کہانی کی اہمیت کا متحمل ہوتا ہے۔ یہ امتزاج مختلف عناصر کو ملانے سے عمل میں آتا ہے۔

پریم ناتھ در کے افسانوں میں موضوع کا اتنا اچھا انتخاب ہوتا ہے کہ داد دینی پڑتی ہے۔ ان کا اسلوب نہایت شگفتہ ہے۔ تحریر میں ایک بے ساختہ بہاو ہے۔ ان کا ہر کہانی میں انوکھی اور حسین تشبیہیں ملیں گی۔ ممتاز درشناس حسرت صاحب لکھتے ہیں کہ 4 آپ کے افسانوں کے کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان کہانیوں میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے کردار ہمارے گردوپیش کے پیداوار ہیں جن کا خالق زندگی کا نباض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان کی سب سے زبردست خصوصیت وہی ہے جس کی طرف ہم پہلی بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ خصوصیت ان کی کشمیریت ہے جو آپ کے فن وفکر کے ہر موڑ پر نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ مختصر سے اقتباسات ساتھ ملاحظہ ہوں5:

"کشمیر کی برف تو آسمان سے آتی ہے۔ جس میں نہ تو شیشے کی وہ کاٹتی ہوئی چمک ہوتی ہے نہ تیزی۔ اس برف میں تو چاند کی نرم نرم روشنی ہوتی ہے اور جب برف فروش ایک کنڈآلے سے ایک ٹکڑے کو ڈھیرے سے الگ کرتا ہے تو یہ برف گاہک کے ہاتھوں میں مصری کے دانوں کی طرح گرتی ہے۔ یہ برف ترازو سے نہیں تُلتا کیونکہ کشمیری اسے بیچتا نہیں تبرک کی طرح بانٹتا پھرتا ہے......"

"واسودیو بھی اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ وہ بھی برف کے بیلچے چلا رہا

تھا۔ عالم گیر سفیدی کے پس منظر میں چھیتڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے لئے بھوت سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ایک بیلچہ ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا اور ایک ایک دھڑام پہ بچوں کے نعرے بلند ہوتے۔ کھو بلی پھاندی پھنس گئی کہیں کتا دوڑا دھنس گیا اور کہیں ٹہنی ہلی اور برف کی چادر کسی کے سر پر آ گئی6"۔

"کاغذ کا واسدیو" ایک فکر انگیز افسانہ ہے اور اس کے مرکزی کردار کی محرومیوں کے ذریعہ درؔ نے اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ انہیں انسان کی سائیکی میں جھانک کر اس کی روح کا عکس رے لینے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔ آپ نے زبان و بیان کی کوتاہیوں کے باوجود فنی چابکدستی سے اہل زبان کو بھی اپنا معترف بنالیا۔

---

1 اختر محی الدین شیرازہ سیمنار نمبر ص ۱۱۸

2 آتشِ چنار ص ۲۴۰

3 آنکھیں ترستیاں ہیں۔ مصنف جگن ناتھ آزاد۔

4 چناروں کے سائے میں ترتیب حسرت گڈھا۔ اس کتاب میں "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں" کے افسانوں کے علاوہ در صاحب کے بعض غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل کئے گئے۔ یہ کتاب مارچ 1991ء میں شائع ہوئی۔ (جان محمد آزاد)

5 گیت کے چار بول۔

6 کاغذ کا واسدیو۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

نندلال کول طالبؔ کاشمیری

طالبؔ کاشمیری کا جنم سرینگر کے ایک رئیس خاندان میں پچیس دسمبر ۱۸۹۹ء کو ہوا۔ آپ کے والد پنڈت ٹھاکر پرساد سنسکرت کے ایک عالم تصور کئے جاتے تھے۔ پنڈت نندلال کول نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور ایس پی کالج سرینگر میں لکچرر مقرر ہوئے۔

پنڈت نندلال کول طالبؔ نے وادیٔ کشمیر میں اردو کی شمع کو اس وقت فروزاں رکھا جب ان کے عصر دوست احباب وقتی تقاضوں کے تحت کشمیری زبان کو اظہار وابلاغ کا ذریعہ بنانے پر مُصر تھے۔ اس زمانے میں بس چند ایک ہستیاں تھیں جو اس دھارے میں نہ بہہ سکیں۔ ان چند ہستیوں کے مخصوص گروپ میں طالبؔ صاحب ایک میر کارواں کی طرح نثر اور نظم کے نئے چراغ روشن کرتے رہے۔

موصوف برسہا برس تک امر سنگھ کالج سرینگر میں فارسی اور اردو کے معلم رہے اور شعر و ادب کی پرکھ تقابلی نقطہ نظر سے کرتے رہے۔ اس دوران آپ پنڈت کیفی، مولوی عبدالحق، چودھری خوشی محمد ناظرؔ جیسے مشاہیر کی صحبتوں میں دادِ سخن حاصل کرتے رہے۔

طالبؔ کاشمیری کی سب سے بڑی عطا ''جوہر آئینہ'' ہے۔ آپ کے مقالات کا یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں مجموعی طور آپ کے بائیس مقالات شامل ہیں۔ ان میں بیشتر مقالات اس سے قبل زمانہ (کانپور) ادب لطیف (لاہور) محقق (بہاولپور) جیسے ممتاز رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کتاب میں ''غالب شناسی'' کے بعض نئے گوشوں کو پہلی بار ابھارا گیا۔ مرزا غالبؔ کے بعض مخالفین نے ماضی میں معمولی فروگزاشتوں پر زیادہ زور دے کر ان کو ناحق ہدف ملامت بنادیا تھا۔ ادھر بعض عقیدت مندوں نے ان کی عیوب کو نظر انداز کر دیا۔ اس تضاد کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا صاحب کی شخصیت ایک دھندلی فضا کی دھوپ چھاؤں میں کبھی روشن نظر آتی اور کبھی محض ایک مبہم عکس بن کر رہ جاتی۔ طالب کاشمیری نے ''جوہر آئینہ'' میں ایک اعتدال پسند ناقد کا فریضہ ادا کرتے ہوئے مرزا غالبؔ کے کلام کا ایک منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی اور اس عظیم شاعر کے گنجینۂ طلسم اور ان کے فکر وفن کے بہت سے ایسے گوشوں کو روشن کیا جو اکثر نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع ہونے والی اس معتبر کتاب کو ملک کے علمی وادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور اس مستحسن کاوش کے صلے میں طالب صاحب کو کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

طالبؔ کاشمیری کے دیگر متعدد مضامین بھی معروف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ''کیفی کی یاد میں'' عنوان سے آپ کا ایک مضمون شیرازہ جنوری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں آپ نے علامہ کیفی کے ساتھ اپنے مراسم کا تذکرہ کیا ہے۔ اس اہم مضمون میں طالب کے نام کیفی کے تحریر کئے ہوئے خطوط بھی

شامل ہیں۔ کشمیری شعرا کے یادگار تذکرہ ''بہار گلشن کشمیر'' کے لئے آپ کا تحریر کیا ہوا مقدمہ سیر حاصل بھی ہے اور مؤثر بھی۔ کشمیر میں اردو نثر اور تنقید کی اس اہم شخصیت کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

میر غلام رسول نازکی

سرینگر کے پرانے شہر میں کادی کدل کے نزدیک میر نازک قادریؒ کا مزار واقع ہے۔ یہ بزرگ سادات حضرت شیخ حمزہؒ کے زمانے کے کچھ بعد کشمیر آئے تھے اور اپنے علم و عرفان سے لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے تھے۔ میر غلام رسول نازکی کے والد انہیں کی اولاد میں تھے۔ لیکن گردش آفاق کی کچھ ایسی ہوا چلی کہ انہیں سرینگر سے بانڈی پورہ ہجرت کرنا پڑی اس وقت نازکی صاحب کی عمر محض تین چار سال رہی ہوگی۔ گھر کا ماحول علم و ادب کا تھا جس نے آپ میں شعر و ادب کا ذوق پروان چڑھایا۔ وادی کے ایک اور ممتاز قلم کار بنسی نردوش آپ کی حیات و افکار کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں1:

"......آپ کی شخصیت میں اسلامی روایات کا ڈوبا ہوا قرینہ صاف جھلکتا ہے۔ پرانے کشمیری بزرگوں کے رکھ رکھاو، انکی سی خاص تمکنت اور فطری وقار...... اپنی وضع قطع اور علم و فضل کے اعتبار سے آپ دوسروں سے بہت الگ تھلگ اور ممتاز نظر آتے ہیں! آپ عصر حاضر کی ان نایاب شخصیتوں میں سے ہیں جن میں قوم کی معاشرتی، علمی و ذہنی زندگی کا بھرپور عکس ملتا ہے......"

میر غلام رسول نازکی نے ۱۹۵۰ء سے اردو میں مقالے اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے قبل ۱۹۴۹ء میں آپ کا مجموعہ کلام ''دیدہ تر'' شایع ہو چکا تھا۔ آپ نے متعدد مضامین لکھے جن میں تاریخی اور تنقیدی شعور کے قابل قدر نمونے پائے جاتے ہیں۔ اپنے اسی ابتدائی زمانے کی محسوسات پر مبنی آپ کا مضمون ''وہ ایک سجدہ'' ۱۹۷۱ء کے شیرازہ میں شایع ہوا ہے۔ اس میں مولانا آزاد سے اپنی پہلی ملاقات کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا یہاں اپنی اہلیہ مرحومہ کے غم کو بھلانے کے لئے آئے تھے۔ ۱۹۴۵ء کا اگست مہینہ تھا۔ میں مولانا مسعودی کے ساتھ حضرت بل نماز پڑھنے گیا انہوں نے نماز سے پہلے مولانا آزاد سے ملاقات کی تجویز رکھی۔ وہ حضرت بل گھاٹ سے ذرا دور ایک شاندار ہاوس بوٹ میں فروکش تھے۔ ہاوس بوٹ کا محل وقوع دل فریب تھا۔ اس کے سامنے نشاط، شالیمار، چار چناری اور ڈل کی وسیع پہنائیاں تھیں اور بغل میں نسیم باغ کا پرشکوہ جمال...... ہمیں اندر بلایا گیا مولانا نشاط کی طرف منہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ براق سفید کھدر کا قمیض اور پاجامہ زیب تن تھا۔ سفید بال، پہلی نظر میں مجھے ایسا لگا کہ میرے سامنے ایک شمع فروزاں ہے۔ باتوں کا سلسلہ دو مولاناؤں کے درمیان شروع ہوا اور میں نقش بہ دیوار سنتا رہا اور مسحور ہوتا رہا......''

اس مضمون سے ان کے میلانات اور رجحانات کا اظہار ہوتا ہے۔ ''اقبالؒ کا تصور ابلیس''2 کے موضوع سے تحریر کئے گئے اور مضمون میں آپ کی وسیع علمیت اور کلام اقبالؒ کی ایک نئی جہت سامنے آتی ہے۔ یہ ایک کامیاب اور مستحسن سعی ہے۔

اس مضمون کا یہ اقتباس آپ کی وسعت نظری اور اقبال شناسی کا عکاس ہے۔

''......ابلیس ناری ابلیس انکاری ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس کے طوفان یم بہ یم، دریا بہ دریا اور جو بہ جو ہیں اور اسی کے دم قدم سے کائنات پر ہنگامہ قائم ہے۔ وہ نہ ہوتا تو یہ دنیا بھی ملکوت کی طرح عالم بے کاخ وکو ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے چاک دامن کو رفو نہیں کرنا چاہتا۔ وہ قصہ آدم کو اپنے خون سے رنگین کر چکا ہے اور اسی لئے وہ اقبال کے الفاظ میں کوئی معمولی مخلوق نہیں۔ وہ خدا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دعوت مبارزت دیتا ہے......''

آپ کشمیری ادب کے ایک اہم ناقد اور محقق ہیں۔ آپ نے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بعض قابل قدر مضامین لکھے ہیں۔ ان کی یہ تخلیقات ملک کے موقر جرائد میں اہتمام کے ساتھ چھپتی رہی ہیں چنانچہ ملک کے اطراف کے ادبی حلقوں میں آپ کی آواز نہایت توجہ سے سنی جاتی ہے۔ ''زبان وادب'' 3 میں آپ کا مضمون ''کشمیری ادب......ایک مختصر جائزہ'' شایع ہوا ہے ''ہمارا ادب'' 4 میں آپ کا ایک اور تنقیدی مضمون کشمیری شاعری ''حبہ خاتون سے وہاب پرے تک'' شایع ہوا ہے۔ ان مضامین کو آپ کے تحقیقی کارنامے قرار دیا جاسکتا ہے ان میں آپ نے کشمیری زبان وادب کے ارتقا سے متعلق کئی مباحث ابھارے ہیں اور بعض گوشوں پر ایک نئے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔

''نعیتہ ادب'' 5 سے متعلق آپ کے مضامین کا سلسلہ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ عربی زبان میں نعیتہ ادب کی روایات کا سیر حاصل مطالعہ کرنے کے بعد ان مقالات میں اردو اور کشمیری زبان کے نعیتہ ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالے اعلا

درجے کی نگارشات ہیں اور ان میں شعر و ادب کے نادر خزانوں کی تلاش و جستجو کے بعد انہیں دریافت کیا گیا ہے۔ کشمیر کے نعت نگار شاعر عبدالاحد نادم کے شعری انتخاب پر مشتمل ایک کتابچہ بھی آپ نے مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب و تہذیب کے بعد آپ کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ریڈیو کشمیر کی ملازمت سے رٹائر ہونے کے بعد برسوں پہلے آپ نے ایک ہفت روزہ ''الغفران'' بھی نکالا تھا۔ اس اخبار کے ادارئے سے زندگی اور اس کی کشمکش اپنی تمام تر نیرنگیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ نظر آتی تھی۔ اس اخبار نے اپنے منفرد و ادبی مذاق کی وجہ سے قلیل مدت میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا تھا۔

---

1 تعمیر مارچ:۱۹۶۱ء

2 شیرازہ اقبال نمبر

3 زبان وادب (بہار) اکتوبر ۱۹۷۶ء

4 ہمارا ادب ۱۹۶۰ء ص ۲۷

5 شیرازہ جنوری ۱۹۶۲ء ستمبر ۶۲

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

علی محمد لون

آپ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۶ء کو سرینگر کے محلّہ درگجن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبدالرحمان تھا۔ انہیں فارسی علم وادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ کبھی کبھار جاڑوں کی لمبی راتوں میں وہ بچوں کو پاس بٹھا کر طلسم ہوشربا، بوستان اور قصہ چار درویش سے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اپنے لڑکپن کے بعض ناقابل فراموش واقعات کی یادیں تازہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں1:

"..... میں آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس زمانے میں ہم خوش حال تھے یا مفلوک الحال، کبھی کبھار گھر میں کھانے پینے کی افراط رہا کرتی تھی لیکن کبھی دانے دانے کے لئے ادھر ادھر دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی۔ لیکن ایک نہایت سنجیدہ باپ اور ایک بہت ہی پیاری ماں کی موجودگی میں کبھی فاقہ کرنے کی نوبت نہیں آئی..... ! درگہ جن کے تاریخی محلّہ کے ایک طرف شنکراچاریہ کی پُر شکوہ پہاڑی سایہ فگن ہے اور دوسری طرف ڈل جھیل اس کے قدموں میں بہہ رہی ہے۔ گرد و پیش کی اس خوبصورتی نے میری ذہنی نشو نما میں

کافی اہم رول ادا کیا۔ میں اکثر جھیل میں نہاتے ہوئے دیکھا گیا۔ پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے چراتے ہوئے پکڑا گیا۔ شام کو بلواڑ پر آوارہ گردی کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اپنی ان نت نئی شرارتوں پر میری بے تحاشہ پٹائی ہوتی۔ اس روز روز کی مار پیٹ نے مجھے اسکول سے بددل کر دیا۔ میں غیر حاضر رہنے لگا اور پھر ایک دن تو میری تعلیم کا سلسلہ تقریباً ختم ہی ہو چلا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی مہاراجہ کے جنم دن کے موقع پر ان کا دریائی جلوس نکلنے والا تھا۔ ہم سب لڑکوں کو ندی کے دونوں کناروں پر مہاراجہ بہادر کی جے کے نعرے لگانے پڑتے تھے۔ لڑکے گلابی رنگ کی پگڑی پہنتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لال ہرے رنگ کی جھنڈیاں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے بیماری کا بہانہ کر کے جے جے کار کہنے سے نجات تو حاصل کر لی لیکن تماشہ دیکھنے کی لالچ میں ندی کی اور چل دیا۔ اچانک اسکول کے ہیڈ ماسٹر غلام محمد شاہ کی نظر مجھ پر پڑی دوسرے دن انہوں نے اس بے دردی سے میری مار پیٹ کی کہ میں سب کے دیکھتے دیکھتے کلاس سے کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف چل دیا۔ لیکن پھر دوسرے روز شاہ صاحب نے گھر آ کر مجھ سے معافی مانگی۔ میرے آنسو نکل پڑے۔ میں پھر سے اسکول جانے لگا۔ شاہ صاحب نے پھر ایک روز مجھ سے کہا...... ''کچھ بھی ہو، کتابیں پڑھا کرو۔ ان میں عقل چھپی ہوتی ہے''۔ اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ آٹھویں تک آتے آتے میں نے طلسم ہوش ربا کا بیشتر حصہ، ڈپٹی نذیر احمد اور شرر کے ناول پریم چند اور سدرشن کی کہانیاں سبھی کچھ پڑھ لیا تھا۔ کالج میں آنے سے پہلے میں ترقی پسند مصنفین

کی تحریک سے متعارف ہو چکا تھا"۔

وہ زمانہ نہایت پُر آشوب تھا۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پہ نمایاں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کی ہلاکت خیزیوں کے بعد ہندوستان کی آزادی کی بات چل پڑی تھی۔ خود کشمیر میں بھی ڈوگرہ حکومت کے خلاف تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ نئے افکار و عقائد لہو بن کر نوجوان علی محمد لون کے رگ و ریشے میں دوڑنے لگے۔ اس نے چیخوف کے افسانے اور دوستوویسکی کے ناول پڑھے۔ لون کے ذہن نے ان تمام باتوں کا اثر قبول کیا۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے لگے اور حالات دھیرے دھیرے معمول پر آنے لگے۔

ان ہی ایام میں ان کا پہلا افسانہ "بچے" ماہنامہ آج کل (دہلی) میں شائع ہوا۔ اب وہ ریڈیو میں آ گئے اور وہاں بعض ادب ساز شخصیات کی محبت نے ان کی ادبی ذوق کو تحریک دی۔ انہوں نے جو پہلا اردو ڈرامہ لکھا وہ نشر ہو کر کافی مقبول ہوا۔ کشمیر کے مانجھیوں کی زندگی پر مبنی ان کا لکھا ہوا ڈرامہ "گھروندے" جونہی نشر ہوا تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔ سینکڑوں لوگوں نے ریڈیو سٹیشن کے باہر مظاہرہ کیا لیکن اس حوصلہ شکن واقعہ نے پُر جوش اور باعزم علی محمد لون کو نا امید نہیں کیا بلکہ اس کی ہمت اور مضبوط ہوئی اسے اپنی نگارشات کی صداقت پہ زیادہ اعتماد ہوا۔ چنانچہ اس ابتدائی زمانے کی ان کی تحریروں میں بھی گرد و پیش کی عوامی زندگی کی حقیقت پسندانہ جھلکیاں پیش ہوتی تھیں۔ ان پر الزامات لگائے گئے۔ لیکن وہ نہایت بے باکی سے اپنی کوششیں کرتے رہے۔ ریڈیائی ڈرامے کی تخلیق و اشاعت کے ساتھ علی محمد لون کی

گہری وابستگی بڑھتی رہی۔ اس زمانے کے ان کے ڈرامے ''دیوانے کا خواب'' کو ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا لیکن بعض لوگوں نے امن کے موضوع پر اس ڈرامے کو اشتمالی پروپیگنڈے کی ایک کامیاب کوشش قرار دیا۔ لون نے سٹیج کے لئے بھی کچھ ڈرامے تصنیف کئے۔ ان کا سٹیج ڈرامہ ''خالو جان کا خواب'' بے حد مقبول رہا۔ یہ ڈرامہ مشہور روسی ادیب دوستوویسکی کی ایک ناول پر مبنی تھا۔ صاحبزادہ محمد عمر اور نور الٰہی 2 نے ریاست کے ایک اور خطے جموں میں پہلے ہی اردو ڈرامے کی شاندار روایات کا آغاز کر دیا تھا۔ ڈرامہ کے فن اور اس کے ارتقا پر ان کی عہد آفرین کتاب ''ناٹک ساگر'' شائع ہو چکی تھی۔ یہ کتاب متعلقین کے لئے بلا شبہ ایک روزنامچہ ہدایات کا کام دیتی رہی۔ کلچرل فرنٹ سے کلچرل کانفرنس کے آخری ایام تک لون ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے رہے۔ آپ کے بیشتر اردو ڈرامے تکنیک کے اعتبار سے ان کی پختہ کاری کے غماز تھے۔ یہ ڈرامے ایک باشعور تحریک کے آئینہ دار تھے۔ بعض ڈراموں کی ہیت میں ہمیں یورپی ہم عصر ڈراموں کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ دراصل ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا انہوں نے گالزوردی، ابسن، آسکر وائلڈ، گوگول، چیخوف، پرانڈیلو اور دیگر مقتدر ڈرامہ نویسوں کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے ان کے فن کو سمجھنے اور اس میں تکنیک اور موضوع کے تنوع سے آگہی حاصل کرنے میں بے پناہ عرق ریزی سے کام کیا۔ وہ ان قلم کاروں کے تجربات کو ساری انسانیت کی میراث تصور کر کے ان سے مستفیض ہونے کی پیہم سعی کرتے ہیں۔ اسی دوران ان کے دو کشمیری ڈرامے ''مہمان'' اور ''روتل تہ روح'' آل انڈیا

ریڈیو کے سبھی سٹیشنوں میں ترجمے کے بعد نشر ہوئے۔ یہ دونوں ڈرامے ان کی ادبی زندگی کے سنگ میل ثابت ہوئے جنہوں نے انہیں ملک گیر شہرت بخشی۔ لون کے ڈراموں کے مکالمے بڑے زوردار اور مرصع، مناظر دلفریب، حزینہ حصے بڑے دل دوز اور کامک ریلیف کے حصے نہایت دلچسپ ہیں۔ ڈراموں کے کرداروں کی زبان روزمرہ اور محاورہ بالکل مناسب اور بامقصد ہے۔ ان میں بالعموم ہمارے معاشرے کے بدنما دھبوں کو سرعام دھونے کی ہمت کی گئی ہے۔ ان میں کشمیر کے صدیوں سے دبے کچلے عوام کے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح چنا گیا جن میں سالہا سال کا حزن و ملال چھپا ہوا تھا۔

ڈرامہ ''سُیا'' علی محمد لون کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس ڈرامے کی اٹھان میں روایتی سنسکرت اور لوک ڈرامے کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے لیکن آگے چل کر ڈرامہ معقولیت پسندی سے چلتا ہے۔ یہ ڈرامہ پہلے اردو زبان میں ہی ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ اس ڈرامے کے ہر موڑ پر لون کی فنی مہارت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار اور ''سُیا'' ہے جو ہماری تاریخ کا ایک ہیرو انجینئر گزرا ہے۔ جس نے پہلی مرتبہ وادی کو سیلاب سے بچانے کا منصوبہ باندھا تھا۔ کشمیر میں تھیٹر تحریک کی ممتاز شخصیت ''پران کشور'' اس ڈرامے کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں3:

> ''لون اس ڈومنی سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں جس نے اس بچے (سُیا) کو سڑک سے اٹھایا اور اسے بیٹے کی طرح پالا پوسا...... پڑھایا اور پروان چڑھایا۔ سُیا کی کہانی میں گرجتا بپھرتا جہلم ایک ایسا زبردست کردار

ہے کہ اس کے بغیر ''سُیا'' کی زندگی کا ڈرامہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک بڑی خامی جو لون کے ڈرامہ ''سُیا'' میں ہے وہ یہ ہے کہ جہلم کا وجود بالکل پس منظر میں ہے۔ اس کی لہروں میں چھپے ہوئے موت کے اژدھے کے مسلسل خوف کو دوسرے کرداروں کی بے بسی میں زیادہ شدت سے پیش کرنا ایسے ڈرامے کے لئے لازمی ہے۔ لیکن ڈرامے کا پلاٹ سٹیج پر دریا کے خونخوار تیور دکھانے سے معذور ہے''۔

لون کے ایسے متعدد ڈرامے ملک کے ریڈیائی ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔

آپ کے کئی سوانحی جائزے اور انشایئے بعض معتبر رسائل میں شائع ہوئے۔ تعمیر میں ان کا ایک مضمون ''ماسٹر جی حیات وافکار ۴'' شائع ہوا ہے۔ اس میں ماسٹر زندہ کول کی شخصیت اور افکار کا ایک سیر حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ماسٹر جی کی شاعری کی روح میں انسان دوستی اور محبت کے آفاقی نظریات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ زندہ کول کا تصوف سیدھے سادھے عام فہم اور معنی خیز انداز میں اپنے مسائل پیش کرتا ہے۔ لیکن اس دقت طلب اور مشکل موضوع سے بیزار آدمی بھی تھوڑی دیر کے لئے ایک کشش اور گہرائی محسوس کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی سادگی ان کی پُرکاری اور پختہ کاری کی دلیل ہے۔

مضمون میں خیالات کی صحت، رفعت اور ان کا تسلسل نہایت مربوط اور موثر ہے۔ ان کی نثر میں جو آہنگ ہے وہ خاصی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے ہمارا ادب میں ''کشمیری زبان میں بچوں کا ادب'' کے عنوان سے ان کا

ایک اور مضمون شائع ہوا ہے جس میں کشمیری ادب کی تنگ دامنی کا احوال نہایت پُر اثر طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''مجھے کشمیری ادیبوں کی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ادب کے اس لازمی جز کے لئے بھی اپنے خون جگر سے وہ گسہائے رنگارنگ پیدا کریں گے جن کی مہک وادی کشمیر کو معطر کرے گی''۔

علی محمد لون کا ناول ''تیری آرزو'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک ڈرامہ نگار علی احمد کی کہانی ہے جو تھیٹر کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کشمیر سے دلی آجاتا ہے۔ ترکمان دروازے کی ٹوٹی پھوٹی محراب کے آس پاس کی دنیا میں...... یہاں کافی گہما گہمی رہتی ہے۔ رکشا، تانگے، بیل گاڑیاں، میلے کچیلے لوگ سانولی صورتیں، بھنگنیں، چھاپڑے اور ٹھیلے والے، ننگ دھڑنگ گندے بچے۔ لید اور ریت سے اٹی ہوئی تنگ سڑک۔ اس کا جواں سال نوکر بالا ایک بھنگن جوالا کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ جوالا...... جس کی موٹی آنکھیں، بھاری پپوٹے، اونچی ناک، مسے سے رنگے ہوئے ہونٹ، سفید دانت اور بے باک ادائیں سارے گردو پیش کو متاثر کئے ہوئے ہیں۔ بالا زمانے کا ستایا ایک نوجوان جس کی ماں تیس سال کی عمر میں مری، باپ نے دوسری شادی کی اور بالا سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گیا۔ ماموں نے پناہ تو دی لیکن وہ ہمیشہ اسے مارتا پیٹتا رہا اب اس کے ماضی کے ایک سرے پر پیار کی بھوک کھڑی تھی اور اس کے دوسرے سرے پر جوالا کی کھنکتی ہوئی پازیب۔

علی احمد جھوٹ موٹ کی شرافت کا دعوے دار کھوکھلی اخلاقی قدروں کا ٹھیکے

دار، جو متوسط طبقہ کا ایک سفید پوش کمزور انسان ہے۔ زندگی کے اس ہر دم جواں ڈرامے کا ایک کردار بن جاتا ہے۔ جس میں اس کی حیثیت محض ایک تماشائی کی ہوتی ہے لیکن ایک رات سنتری بے حد اصرار کے بعد اسے کالی مسجد کے پاس سڑک کے دائیں طرف اس قبرستان کی طرح لے آتا ہے جہاں گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں ایک اور کردار راجو پنواڑی میں ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی ہے۔ نورانی صورت اور مقدس داڑھی والے اس پنواڑی کے سیاہ باطن پر علی احمد حیران رہ جاتا ہے۔ اسی رات سنتری اسے جوالا کی جھونپڑی کے نزدیک بھی لے آتا ہے۔ جوالا کا بڈھا پتی منسو چار بیویوں کو پہلے ہی جلا آیا ہے۔ اب جوالا کے بچہ ہوا ہے تو وہ دل ہی دل میں اینٹھ رہا ہے کہ اس کی مردانگی کی لاج رہ گئی وہ جوالا کو مارتا پیٹتا ہے اور صبح کو اچانک مرجاتا ہے۔ علی احمد بالا اور جوالا کو ایک کرنا چاہتا ہے لیکن سماج کی دیوار اس کے ارادوں میں حائل ہو جاتی ہے بلآخر جوالا خود کو سماج کی قربان گاہ کی بلی چڑھاتی ہے اور اپنا بچہ مرتے مرتے بالا کو سونپ دیتی ہے تاکہ وہ اس معاشرے کے لئے جدوجہد کر سکے جس میں سبھی ایک سمان ہوں گے۔

یہ انسان کی بے دردی اور معاشرے کی بے حسی کی داستان ہے جہان طبقاتی منافرت کے اندھیروں میں افکار کی لہریں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں ناول کے کلایمکس میں پروپیگنڈے کی سی جھلک نظر آتی ہے۔ ادب کو جان بوجھ کر پروپیگندے سے احتراز کرتا چاہیئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ادب پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔ ادیب چاہتا ہے کہ زندگی کو جس انداز میں اس نے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے ادوسرے بھی اسے اسی انداز میں دیکھیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں بعض چیزوں کے

لئے محبت اور بعض دیگر چیزوں کے لئے نفرت کے جذبات پروان چڑھانے کا متمنی رہتا ہے۔ وہ آرٹ کے تمام ترحربوں کو بروئے کار لاکر قاری کو قائل کرنے کے درپے رہتا ہے۔ لیکن جب یہ پروپیگنڈا صناعی محاسن اور فنی لطافتوں کے ریشمی لباس سے مزین ہوتا ہے تو اس میں تاثر کا عنصر پیدا ہوتا ہے لیکن جب یہ اندھا دھند کیا جائے گا تو مضرت رساں ہوگا۔ بہر کیف ناول مقصدی اور احتجاجی ادب کا ایک نمونہ ہے۔ مصنف نے اپنے بیرونی سفر میں جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے۔ یہ اس کا ایک منظّم اور شاندار ریکارڈ ہے۔ اس ناول پہ مصنف کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے ایوارڈ سے بھی نوازگیا۔

علی محمد لون کی نثری نگاری کا اصلی رنگ ان کے لکھے ہوئے افسانوں میں ہی نکھرتا ہے۔ افسانے جو دکھ اور سکھ جیت اور ہار سے بھری ہوئی اسی دنیا کے گرد گھومتے ہیں عموماً ان افسانوں کا پلاٹ بہت مختصر سا ہوا کرتا ہے۔ بہت چھوٹا سا...... لیکن جوں ہی یہ پلاٹ ان کے قلم کی نب سے ٹکراتا ہے تو اس کی گونج کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اس کا مجموعی تاثر ہمارے ہر ریشۂ وجود کو لرزا دیتا ہے۔ ''انسان اور چھینٹے'' اور ''نالے کا بادشاہ'' میں لون نے کشمیر کے بعض نچلے طبقوں سے کردار لئے ہیں اور انہیں لافانی بنا دیا ہے۔ ان کے افسانے شیرازہ اور تعمیر کے علاوہ شاہراہ، پگڈنڈی راہی محور اور بیسویں صدی میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے بعض کہانیوں کے ترجمے ملک کی مختلف زبانوں میں بھی کئے گئے۔ وہ اپنے افسانوں کے موضوع کی طرح ان کی تکنیک تنوع میں بھی بڑا تنوع رکھتے ہیں۔ انہوں نے سکھ کا ساحل، پاپی پجاری کی داستان ''پمپوش، یہ محلّہ، دردِ تنہائی، مسکراہٹ کا زخم، تم سب میرے ہو، اور

بت شکن'' جیسے افسانے لکھ کر اردو کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

سڑک کے ایک حادثے میں آپ کا انتقال ہوا اور آپ اپنے سینکڑوں مداحوں کو سراپا حزن وملال چھوڑ کر ابدی نیند سو گئے۔

---

1 غبار کاروان ماہنامہ آج کل فروری ۷۲ ص ۱۲

2 صاحبزادہ محمد عمر اور نور الٰہی ایک دوسرے کے جگری دوست تھے۔ ایک جان دو قالب ہو کر ہمیشہ نور الٰہی محمد عمر کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر لوگ انہیں ایک ہی شخص تصور کرتے تھے۔

3 شیرازہ سیمنار نمبر: پران کشور ص ۱۴۷

4 ماہنامہ تعمیر فروری ۱۹۵۷ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اختر محی الدین

آپ کا اصلی نام غلام محی الدین وانی ہے۔ آپ ۱۷ر اپریل ۱۹۲۸ء کو بٹہ مالو سرینگر میں عبدالکبیر وانی کے ہاں تولد ہوئے۔ اختر صاحب کشمیر کے صف اول کے افسانہ نگار اور ادیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ اپنی ابتدائی زندگی کے حالات یوں بیان کرتے ہیں1:

"میرے ہوش سنبھالنے سے پہلی ہی کشمیر میں ایک زوردار سیاسی تحریک چل پڑی تھی۔ میں ابھی تین سال کا بچہ تھا جب وادی میں مارشل لا نافذ کیا گیا اور آزادی کے پرستاروں کے سینے شخصی راج کی گولیوں سے چھلنی کر دئے گئے۔ میرے والد صاحب اگرچہ ایک معمولی دکاندار تھے۔ وہ پڑھے لکھے بھی نہیں تھے لیکن وہ تحریک آزادی کے زبردست حامی تھے۔ ادھر ان ہی دنوں ایک مذہبی تحریک زوروں پر تھی۔ مولوی محمد انور شاہ شوپیانی کی قیادت میں جمعیت اہل حدیث سرگرم عمل تھی۔ یہ لوگ وعظ خوانی کے علاوہ کتابیں اور رسالے شائع کرتے تھے۔ میرے والد یہ کتابیں مجھے پڑھوا کر خود زبانی رٹ لیا کرتے تھے"۔

بچپن کے ان ہی ایام کا ایک واقعہ ہے۔ میری والدہ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھی تھیں۔ میں ان کے قریب تھا۔ وہ مجھے کہانی سنا رہی تھیں۔ انہیں بہت سی لوک کہانیاں یاد تھیں۔ دروازہ کھلا اور خواجہ احمد اللہ وانی (غلام محی الدین قرہ کے والد) اندر آئے والدہ نے پردہ کے لئے اندر جانا چاہا لیکن خواجہ صاحب نے آواز دی...... ''بیٹی کہاں جا رہی ہو شیخ صاحب تشریف لائے ہیں''۔ میری والدہ رک گئیں۔ دراز قد لیکن پتلے بدن کے شیخ صاحب جونہی آنگن کے اندر تشریف لائے تو میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ میں ان کے متعلق بہت کچھ سنتا رہا تھا۔ وہ مصیبت زدہ لوگوں کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میری والدہ کے پاس جتنے بھی چاندی کے زیور تھے انہوں نے اتار کر ایک ایک کر کے شیخ صاحب کو پیش کئے اور پھر مجھے اٹھا کر ان کے قدموں میں ڈال دیا۔ شیخ صاحب نے شفقت سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا...... اس عمل میں تصور ہی تصور میں میں نہ معلوم کہاں پہنچا۔

کالج میں پہنچ کر میری چند ایسے لڑکوں کے ساتھ ملاقات ہوئی جو عملی سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ اب تک تو میں نیشنل کانفرنس کے لئے کام کرتا تھا۔ لیکن اب میری وابستگی میں زیادہ اضافہ ہوتا رہا...... شاعر کشمیر نے اب تک تحریک آزادی کے ہر موڑ پر امید افزا ترانے گائے تھے لیکن اب وہ بھی آزادی اور لالولالو جیسی طنزیہ نظمیں لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کی پری دراصل قحبہ نکلی جو صرف چند مال داروں کے پہلو گرمانے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر ہم نے خیریت اسی میں سمجھی کہ سرکاری ملازم ہو جائیں......

سیاسی ماہ وسال کی اس وسیع وعریض اوراغوانی سرزمین کی طرف ان کی یہ واپسیں نگاہ دراصل ان کی ذات کا ایک بالیدہ تر اظہار ہے۔ جب خود فریبی کے بت ٹوٹ گئے اور خود شناسی کی تکملیت کا مسافر رواں دواں ہوا تو روح کی گہرائیوں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ وقت کے لمبے اور مضبوط ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ یہی ہاتھ اس عہد کے مزاج داں بنے۔ وہ اپنے قلم کی نوک سے...... فریب اور ریاکاری کی دبیز تہوں کے نیچے چھپی ہوئی ایک نئی دنیا کی داستان رقم کرتے رہے۔ اختر صاحب ۱۹۵۱ء میں کلچرل فرنٹ کے ساتھ متعارف ہوئے اور باقاعدہ طور اردو زبان میں افسانے تحریر کرنے شروع کیے۔ یہ ان کے طویل ادبی سفر کا آغاز تھا۔ آپ نے کلچرل کانگریس کی ایک محفل میں اکتوبر ۱۹۵۱ء میں ایک طنزیہ افسانہ ''یونانی حکیم'' پڑھا۔ یہی افسانہ بعد میں ایک مقامی ادبی رسالے ''آزاد'' میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں ہیرالڈ ٹریبیون نے افسانہ نویسی کے ایک بین الاقوامی مقابلے کا اہتمام کیا۔ دنیا کی سبھی معیاری زبانوں کے افسانہ نگار اس مقابلے میں شامل ہوئے۔ بھارت میں اس مقابلے کا انتظام روزنامہ ملاپ کے سر تھا۔ اختر صاحب بھی اپنی کہانی ''پونڈ رچ'' لے کر اس مقابلے میں شامل ہوئے۔ جب نتائج کا اعلان کیا گیا تو اختر محی الدین کا افسانہ دوسرا بہترین افسانہ قرار دیا گیا۔ ایک نوآموز فن کار کی اس بے پناہ پذیرائی سے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ برصغیر ہند پاک کے بلند پایہ افسانہ نگار علی عباس حسینی کی کہانی کو اس مقابلے میں پہلے انعام کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔ انہوں نے اختر صاحب کو مبارکباری کے ایک خط میں لکھا کہ میاں تم نے تو سمجھ لو، اس بڑھاپے میں مجھے پچھاڑ ہی دیا تھا۔

''پونڈرچ'' کا مرکزی کردار ایک بھکاری ہے جسے لوگ اپنی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے سبب درویش کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ اسے بے تحاشہ کھلاتے پلاتے رہے۔ اس کے ناز اٹھاتے رہے۔ اس کی سطحی باتوں اور حرکات وسکنات میں بھی اسرار و رموز تلاشتے رہے۔ معتقدوں کی ان نوازشوں کی وجہ سے اسے بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن پھر ایک دن اچانک...... عقیدت و نیازمندی کا ساگر سوکھ گیا۔ لوگوں نے اسے تیاگ دیا۔ اپنے عقیدت مندوں کی اس سردمہری نے اس کی ذات کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ اس کردار کی اندرونی کشمکش کا ایک جائزہ لیتے ہوئے ''ہندوستان ٹائمز'' کا تبصرہ نگار لکھتا ہے کہ یہ ایک نئے افسانہ نگار کی دریافت ہے جس نے افسانے کے فن کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ اختؔر صاحب کا یہ افسانہ پاکستان کے معتبر ادبی رسالے ''افکار'' میں شائع ہوا اور اس طرح اُن کی تخلیقی معنویت نے اُن کی مقبولیت میں نئے اضافے کئے۔ ''پونڈرچ'' کا کردار اپنی تمام تر بوالعجبی کے ساتھ آج بھی زندہ ہے۔

''پیوند'' آپ کا ایک اور افسانہ تھا جو ''کونگ پوش'' میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں بھی غیر معمولی واقعات کے بجائے روزمرہ کے معمولی حقائق اور کردار پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہاں بھی کشمیری مزاج کے مختلف عناصر کا نہایت فن کارانہ اظہار ملتا ہے۔ یہاں ایک عام کلرک اس جنون میں مبتلا ہے کہ اسے ڈاک سے روزانہ خط ملیں جن سے محلے میں اس کی عزت بڑھ جائے گی۔ وہ کلکتہ کے چٹرجی صاحب سے قلمی دوستی کر لیتا ہے۔ خط وکتابت کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ کلرک اپنی امارت کے خودساختہ افسانے خطوط میں تحریر کرتا ہے۔ اچانک ایک روز چٹرجی کا

ٹیلیگرام آتا ہے کہ میں آ رہا ہوں۔ کلرک مہاشے بے حد پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ پہلی بار نہایت باریک بینی سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ اسے پہلی بار اپنی بیوی بہت نحیف اور ناتواں نظر آنے لگتی ہے، بچے بے حد گندے اور پھوہڑ دکھائی دیتے ہیں اور دیواروں کی شکستگی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ کردار نگاری کے فن کا یہ سلجھا ہوا انداز آپ کی فنی بصیرت کا غماز ہے۔ یہاں انہوں نے انسانی زندگی کے تضاد اس کی محرومیوں اور ناکامیوں کو موضوع بنایا ہے۔ انسانی فکر کا وہ پہلو جسے بڑی آسانی سے مضحکہ اور تمسخر کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ادبی مواد کی یہ سچائی اور اس کا بے باک اظہار اختر محی الدین کے فن کو دوسروں سے منفرد کر دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں انفرادیت کا یہ قابل رشک پہلو انہیں اپنے ہم عصر ساتھیوں سے ایک علیٰحدہ اور اعلیٰ مقام دلانے کا باعث بنتا ہے۔ اس افسانے کا ہندی اور ملیالم زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔

''اور رات مر گئی'' آپ کا ایک اور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک رمزیہ انداز رکھتا ہے۔ جس میں رات کو ایک باغ میں الوؤں کی اودھم بلبلوں اور کویلوں اور دوسرے پرندوں کا سہا ہوا انداز رات کے ختم ہونے اور پو پھٹنے تک بڑی شگفتگی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں تخلیقی ساحر نے کچھ کمالات اور کرامات کو سخن کا ملبوس پہنایا ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس:

> ''مشرق کی اونچی چٹانوں پر نور کی سپیدی، اندھیرے کی روح قبض کر رہی تھی۔ ستارے آکاش پر اس طرح غایب ہوتے جا رہے تھے جیسے وہ بھی پگھل پگھل کر اپنی روشنی سپید سحر پر نچھاور کر رہے ہوں۔ باغ چہک اٹھا۔

رات کی خاموشی میں الّو کو یقین ہوا تھا کہ پرندے سرے سے ہی ختم ہو گئے
ہیں لیکن اب سارا باغ گا رہا تھا۔ ہزاروں اور لاکھوں پرندے ایک ساتھ پکار
رہے تھے۔ سحر آ رہی ہے۔ رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہی تھی......"

آپ کا افسانہ "ظاہر باطن" مئی ۱۹۶۲ء کے شیرازہ میں شایع ہوا ہے۔ اس میں شعور کی رو کی تیکنیک سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جو بھی نقش یکے بعد دیگرے ان کے ذہن میں ابھرتے ہیں انہیں صفحہ قرطاس پہ اتارنے کی سعی کرتے ہیں۔ اسی طرح "چھلاوہ" آپ کا ایک اور اچھا افسانہ ہے۔ یہاں وہ انسان کے باطن کو نہایت نفسیاتی انداز میں بے نقاب کر دیتے ہیں۔ یہ نفسیاتی تہ داریاں آپ کے افسانوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ یہاں وہ مقامی زندگی کے مناظر اور مانوس کرداروں کے نقوش کھینچ رہے ہیں۔ اس افسانے کے اختتام پر قاری اچانک چونک اٹھتا ہے۔ "اختر محی الدین" کے فن کا اعجاز یہ ہے کہ ان کے ہاں افسانے کے کردار اور قاری میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ ہر بات بے ساختہ کہی جا سکتی ہے۔ بے تکلفی کی اس فضا کی تخلیق کو بلاشبہ ان کا ایک بڑا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ کے تنقیدی مقالے بھی گذشتہ برسوں کے دوران اخبارات اور رسائل میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ "معاصر کشمیری افسانہ اور نیا شعور" کے عنوان سے آپ کا مضمون شیرازہ کے سمینار نمبر میں شایع ہوا۔ اس اہم مضمون میں آپ نے اجنبی ادبی تحریکوں کی مصنوعیت کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ پردیسی، ڈر، اور تشنگی نے دراصل اردو کے بعض خود ساختہ افسانہ نگاروں کے خلاف نفرت کے جذبے کے تحت لکھنا شروع کیا۔ کشمیر کے ان افسانہ نگاروں نے دنیا کے

سامنے یہاں کے سماج کی اصل صورت پیش کرنا شروع کی۔ آپ کے ان مقالات میں بھی تحریر کا وہی بے ساختہ اور بے تکلف انداز نظر آتا ہے جس سے آپ کی تخلیقات میں طنز وظرافت کے عناصر جھلکتے ہیں۔ آپ کے اس اسلوب کی وجہ سے بعض ناقدین آپ کے افسانوں کو لطیفہ کہکر ٹال دیتے ہیں۔ شمیم احمد شمیمؔ آپ کے فکر وفن کا جائزہ پیش کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:

''افسانہ اخترؔ سے پہلے بھی تھا اور اس کے بعد بھی ہے لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے اس صنف کو اپنے اظہار خیال کے لئے خاص کرلیا۔ آپ کے بعض سنجیدہ افسانوں کو چھوڑ کر باقی سبھی افسانے مزاحیہ ادب کی ذیل میں آتے ہیں۔ اختر کو ہم مزاح نگار اور ان کی تخلیقات کو مزاحیہ ادب میں شامل سمجھتے ہیں۔ مزاحیہ ادب ایک طاقت ور صنف ادب ہے۔ ہمارے بیشتر نقاد مزاحیہ اور سنجیدہ ادب میں امتیاز نہیں کر پاتے ہیں اس لئے جب وہ اختر کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں لازماً مایوسی ہوتی ہے اور انہیں لطیفہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں لیکن یہ اخترؔ سے انتہائی زیادتی ہے۔ مشہور امریکی وڈہاوس افسانے لکھنے کے باوجود مزاح نگار کہلائے تو اختر کو کس طرح افسانہ نگار کہا جاسکتا ہے......''

عجیب اتفاق ہے کہ خود شمیمؔ صاحب کو ہی بعد میں اخترؔ کی افسانہ نگاری کے اعتراف میں صفحات کے صفحات سیاہ کرنے پڑے۔ اخترؔ محی الدین کے افسانے ''حُسن ہے زندگی'' کی اشاعت کے ساتھ ہی ادب کے پر سطوط محل کے دیوار و در دہل اٹھے۔ ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ ماہنامہ تعمیر کے صفحات پر خیالات

اور نظریات کی لڑائیاں چنگاریاں اٹھاتی رہیں۔ منٹو کے ٹھنڈا گوشت کے بعد اردو کے کسی افسانے پر اتنی متضاد رائیں قائم نہیں ہوئیں۔ لیکن بلاشبہ یہ اختر محی الدین کا Magnumopus ہے جس کو اپنے موضوع اور اسلوب دونوں کے بے باک حسن نے آپ کے فن کا سنگ میل بنا دیا۔ اس افسانے کے کشمیری original پر رحمان راہی کا سیر حاصل تنقیدی مطالعہ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے کشمیری تنقید کا اولین نمونہ ہے۔ افسانے کے متعلق راہی ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں2:

"......افسانہ کے سب سے بڑی دل کشی اس کی ہیئت ہے۔ یہ ہیئت اتنی پختہ ہے کہ لامحالہ اختر کی استادی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ میں میں جو دنیا ابھرتی ہے قاری اس کے چاروں طرف دیکھ سکتا ہے۔ افسانے کا Suspense قریب قریب آخر تک برقرار رہتا ہے۔ زبان کا رنگ موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اختر کا مشاہدہ مجموعی اعتبار سے بہت صحیح اور باریک ہے۔ یہ سب چیزیں مل جل کر افسانے کو ایک طلسم بنا دیتی ہیں"۔

اس افسانے کا مرکزی کردار رمضانا ہے۔ ایک واجبی تعلیم کا ہانجی لڑکا۔ وہ کشمیر سے باہر کی دنیا دیکھنے کا متمنی ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے وہ ایک پنجرے میں بند ہے۔ پہاڑوں کی چاردیواری میں قید۔ اس کی بے چین روح اسے فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ کئی برسوں تک جنگی محاذوں پر کام کرتا ہے۔ اب اس پر اپنی سحر انگیز سرزمین کی حقیقت واضح ہونے لگتی ہے۔ چار سال بعد جب وہ جنگ کے خاتمے پر کشمیر واپس لوٹتا ہے تو اس کی ساری شخصیت بدل جاتی ہے۔ اس کا باپ ملہ سبحان حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ رمضانا اب دن بھر شکارے میں بیٹھ کر جھیل ڈل

کے نیلگوں پانی میں پہاڑوں اور درختوں کے عکس کو دیکھتا رہتا۔ لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے پاس گرد و پیش کی خوبصورتی کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں ہوتے ہیں۔ پھر ایک دن ڈل یخ بستہ ہو جاتا ہے۔ رمضانا کی رومانیت اس ویران نظارے کی تاب نہیں لاسکتی ہے اور پھر ایک دن صبح کو اس کی لاش ڈل کے یخ بستہ پانی میں پائی جاتی ہے۔ کئی سال بعد ایک انگریز دوشیزہ ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں آ کر رہنے لگتی ہے۔ یہ دن بھر مصوری میں مصروف رہتی ہے۔ وہ فطرت کی کرشمہ سازیوں کے نمائیدہ شاعر ''ورڈز ورتھ'' کی مداح ہے۔ ایک دن میم صاحب ملہ سبحان کو ساتھ لیکر شالیمار باغ جاتی ہے۔ سہ پہر کو وہ اس باغ کی پچھلی پہاڑی پر جانے کی خواہش ظاہر کرتی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر وہ ایزل لگاتی ہے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق کا لالہ زار دور پہاڑوں میں پھوٹ رہا تھا۔ وہ اس اتھاہ حسن کو رنگوں میں نہیں سمیٹ پاتی بلکہ جسم کے پنجرے سے آزاد ہو کر اس سارے حسن میں تحلیل ہونا ہی موزوں سمجھتی ہے چنانچہ وہ ان بلندیوں سے چھلانگ لگا کر اپنی روح کو جسم کے پنجرے سے آزاد کر دیتی ہے۔ رمضانا کے کردار پر رحمان راہی کے اعتراضات کا جواب شمیم صاحب کے الفاظ میں:

> ''......دراصل رمضانا شیلے تھا اور نہ کیٹس وہ نہ رحمان راہی تھا اور نہ شمیم احمد شمیم۔ وہ رمضانا تھا۔ وہ ان معنوں میں فلسفہ جمالیات کا ماہر نہیں تھا جن معنوں میں راہی صاحب اسے سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے سوال اگر ہر ادبی تخلیق کے خالق سے کئے جائیں تو ادبی تنقید نہایت دلچسپ ہوسکتی ہے۔ مثلاً سرشار سے پوچھا جائے کہ اس کے ''خوجی'' نے اتنی ساری حماقتیں

کیوں کیں۔ منٹو سے پوچھا جائے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کے کردار پاگل کیوں ہیں۔ رمضانا اس لئے جان دیتا ہے کہ حسن کی وسعتیں محدود ہو گئیں اور میم صاحب اس لئے مر جاتی ہیں کہ حسن کی وسعتیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔ کہانی کار ہم سے پوچھتا ہے کہ انسان کی اس بوالعجبی کو کس نظرئے کے تحت سمجھاؤ گے''۔

اختر محی الدین کی غیر معمولی ادبی خدمات کے عوض انہیں ۱۹۶۸ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا3 اس کے علاوہ ساہتیہ اکیڈیمی اور وشو ہندی سمیلن کے انعامات بھی آپ نے حاصل کئے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں تھیٹر فیڈریشن کی طرف سے آپ کو کلا کیندر شیلڈ عطا کیا گیا۔ آپ ریاستی حکومت میں متعدد اہم اور ذمہ دار عہدوں پر اپنے فرائض انجام دینے کے بعد وظیفہ حسن خدمت حاصل کر چکے ہیں اور لال بازار کے اپنے دور افتادہ بنگلے میں عافیت کے ایام گذار رہے ہیں4۔

---

1 سنگ و خشت ہفت روزہ آئینہ نومبر ۱۹۷۲ء

2 تعمیر: اکتوبر ۱۹۶۲ء: رحمان راہی ص ۴۲

3 بعض وجوہات کے پیش نظر آپ یہ اعزاز لوٹا چکے ہیں۔ (آزاد)

4 اختر محی الدین گزشتہ برس مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

امین کامل

ان کا اصلی نام محمد امین ہے۔ ۱۹۲۴ء میں کاپرن تحصیل کولگام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد عبداللہ ٹینگر وتھا۔ امین کامل ایک ہمہ گیر قلم کار ہیں۔ ان کا شمار کشمیری کے چوٹی کے شعراء میں ہوتا ہے۔ کشمیری کے علاوہ انہوں نے اردو میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ انہوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ترجمے کا بھی کچھ کام کیا ہے۔ کشمیری میں ان کا ایک نیم تاریخی ناول ''گٹہٕ منز گاش'' بھی شائع ہوا ہے۔ اپنے بعض دیگر ہم عصر دوستوں کی طرح یہ بھی ابتداء میں صرف اردو میں ہی اپنے احساسات کا اظہار کرتے تھے۔ بعد میں کشمیری زبان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کے باوجود یہ اردو سے اپنی وابستگی برقرار رکھے رہے۔ اردو میں ان کے افسانے اور مضامین وقفوں کے بعد شائع ہوتے رہے۔ ان کی تحریر کا ہر رنگ ایک انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ ان کی تخلیقات کا ہر نقش ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ رنگوں کی اس قوس قزح میں تحلیل اور تجزئے کا ایک دلآویز امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے اپنے دور کی تمام تلخیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ غالباً اسی لئے ان کا ہر افسانہ پڑھنے کے بعد ہم سوچ کے ساگر میں مستغرق ہوجاتے ہیں۔ یہ افسانے

کشمیری مزاج کلچر اور روایات کے آئینہ دار ہیں۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ ''مرغوں کی لڑائی'' پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ افسانہ شیرازہ نومبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ شاہ مال اپنے شوہر غلام خان کو مرغا لانے کے لئے مجبور کر دیتی ہے تا کہ اپنی پڑوسن جان تیلی کی جان جلا سکے۔ اس روز غلام خان مرغا لئے جوں ہی آنگن میں داخل ہو جاتا ہے شاہ مال بے حد خوش ہو جاتی ہے جیسے کوئی بڑی نعمت اس کے ہاتھ آ لگی ہو۔ اس دن وہ اپنی پڑوسن کو جلانے کے لئے چیخ چیخ کر اپنے مرغے کے اوصاف بیان کر کے نہیں تھکتی۔ ''بھلا شہر میں ایسے مرغے کہاں بکتے ہیں؟ اور پھر اتنا مہنگا بھی خریدے گا کون؟ یہاں تو بس یہی نیچ ذات کے مرغے ہی چلتے ہیں......'' پڑوسن کی پانچ مرغیاں تھیں اور ایک مرغا اور شاہ مال کی صرف مرغیاں ہی تھیں۔ جان تیلی کا مرغا دن میں ایک دو بار دیوار پھاند کر شاہ مال کے آنگن میں اترتا۔ شاہ مال اسے کوسنے لگتی...... رات کو جب سب سو گئے تو شاہ مال کے مرغے نے بانگ دی۔ شاہ مال کو مرغے کی بانگ کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا اس بات کا ڈر کہ کہیں مرغے کی بانگ پڑوسن نے نہ سن لی ہو۔ پھر تو وہ طعنے دے دے کر جان کھائے گی۔ ''اری! اسی مرغے پر اتنا اینٹھ رہی تھی؟ دنیا جہاں کے مرغے سحر کے بعد نور کی خوش خبری سناتے ہیں اور تمہارا منحوس مرغا......'' وہ صبح صبح ہی صمد و ذبیحے سے مرغے کو ذبح کرنے کی بات طے کر کے گھر لوٹتی ہے تو وہاں اس کے اور پڑوسن کے مرغے میں زبردست لڑائی چھڑی ہوتی ہے۔ شاہ مال گھبرا گئی پڑوسن کے مرغے نے تو محلے بھر کے مرغوں سے ناکوں چنے چبوائے تھے۔ غالباً اسی لئے پڑوسن نہایت اطمینان سے اپنی کھڑکی سے لٹکی ہوئی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ دونوں مرغوں کے گردنوں کے پر دائروں کی صورت میں کھڑے

تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ٹھونگیں مار مار کر اودھم مچا رہے تھے۔ مرغوں نے ایک دوسرے کو لہولہان کر دیا لیکن شاہ مال کے مرغے کی حالت خراب تھی۔ پھر ایک انہونی ہوگئی۔ پڑوسن کا مرغا اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور شاہ مال کا مرغا اس کا پیچھا کرنے لگا۔ پڑوسن پسینے میں ڈوب گئی اور شاہ مال نے سرشار ہو کر کہا...... ''مرغے میں لاکھ عیب ہوں لیکن وہ لڑائی جھگڑے میں تاک ہونا چاہئے۔ میں تو بس ایسے ہی مرغے کی تلاش میں تھی''۔

یہ افسانہ معاشرے کی ایک مکمل تصویر ہے جس کی تکمیل کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مختلف رنگوں اور کرداروں سے ہوئی۔ اگر ان میں کوئی ایک ٹکڑا ایک رنگ ایک کردار بھی اس سے علیحدہ کر لیا جائے تو معاشرہ کا امتیازی رنگ و روپ ہی بدل جائے گا اور اس کی شناخت مشکل ہو جائے گی۔ افسانے کے کرداروں اور ماحول میں جو باہمی ربط ہے اس کا احساس بھی افسانہ نگار نے پوری شدت سے کیا ہے۔ ہر کردار اپنی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت سے اپنی شخصیت کی وضاحت کرتا ہے۔ اپنی عمل سے دوسرے کرداروں کو نمایاں کرتا ہے اور اس طرح ماحول کے نقش کو مکمل بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ کامل نے اس افسانے میں نچلے طبقے کی زندگی کی مصوری کا ایک شاہکار نمونہ پیش کیا ہے اور یہ نمونہ فنی اور افسانوی دل کشی کا ایک یادگار مجموعہ بن گیا ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ ''جھیل اور چٹان'' اس لحاظ سے ایک نقش ناتمام ہے گو اس میں بھی ہاجرہ کی محرومیت، مظلومیت اور گھٹن کی ایک لرزاں خیز تصویر ابھرتی ہے۔ لیکن یہ تصویر نیم روشن سی ہے۔ افسانے کا آغاز ہی ایک طویل منظر یہ بیان سے کیا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹتے ہی موضوع کو گرفت میں لینے کی بات

پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

کامل صاحب ایک اچھے محقق بھی ہیں۔ بعض ممتاز رسائل میں آپ کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کا ایک مضمون ''پنچ تنتر اور برہت کتھا'' مارچ ۱۹۶۴ء کے شیرازہ میں شائع ہوا تھا۔ ''نورنامہ'' کا طویل مقدمہ آپ کی تحقیقی بصیرت کا اچھا نمونہ ہے۔ آپ نے حبہ خاتون کے کلام پر ایک طویل تبصرہ بھی تحریر کیا تھا۔ اس میں آپ نے حبہ خاتون کی شاعری کا سماجی پس منظر بیان کیا تھا۔ برسوں تک شیرازہ کی ادارت سنبھالنے کے بعد اب ملازمت کی بندشوں سے نکل چکے ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے منعقدہ ایک پُر شکوہ تقریب پر چند سال پہلے کشمیری زبان وادب کے اس سربرآوردہ معاصر کو ان کی بیش بہا عطا کے لئے خلعت پہنائی گئی۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

تنہا انصاری

کشمیر کی ادبی تاریخ میں تنہا انصاری اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنا تعارف وہ یوں کراتے ہیں[۱]:

''ہری سنگھ کے دور کی پیداوار ہوں۔ مطلب یہ کہ شخصی راج میں بحیثیت استاد ملازم ہو گیا۔ کوالفکیشن کچھ زیادہ نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے بی اے بی ٹی منشی فاضل، ادیب فاضل، جے وی، بی، ای سی۔ ریاست کا بہترین استاد ہونے کی بنا پر راشٹر پتی کے ہاتھوں ۱۹۶۰ء میں نیشنل ایوارڈ بھی وگیان بھون نئی دہلی میں حاصل کیا۔ تقریباً سات سال سے ٹیچرز ٹریننگ سکول سوپور میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہوں۔ ریاست کی ٹیکسٹ بک ایڈوایزری بورڈ کا ممبر بھی ہوں۔ ۱۹۵۵ء کے بعد میں نے دو کتابیں تصنیف کیں۔ ''تعلیم زبان'' اور ''صحیح اردو بولئے'' پہلی کتاب استادوں کے لئے ہے اور دوسری طلبہ کے لئے۔ یہ دونوں کتابیں میں نے خود ہی شائع کر لیں مطلب سرکاری آلائش کے بغیر......''

تنہا انصاری کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اس حلقے میں مختلف مکاتب فکر سے لوگ شامل تھے۔ رشید نازکی کی جو اس وسیع حلقۂ احباب کے ایک دیرینہ رکن تھے تنہا صاحب کا ادبی مقام متعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں2:

''اپنے شعوری حیات کے چالیس سال تک زبان و ادب کی لطافتوں میں ان کا طوطی بولتا رہا۔ وہ ایک گل افشان شاعر، دلآویز مقرر، دل پسند فکاہیہ نگار اور عطر افشاں مکتوب نگار تھے ان کے خطوط میں نجی دلچسپیاں رقص شرر سے شعلہ مستعجل بنتے بنتے رہ گئیں ہیں۔ اکثر خطوط میں رنگ حیات نے مکتوب نگاری کی دُزدیدہ نگاہی کو طول دے کر سانحہ کو واقع بنادیا ہے......''

تنہا اردو اور کشمیری کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ اردو کے ایک منفرد نثر نگار بھی تھے۔ آپ کے فکر انگیز مضامین ماہنامہ سفینہ، صداقت ہفت روزہ وطن، آئینہ، سلسبیل اور آفتاب میں خصوصی طور شائع ہوا کرتے تھے۔ آپ کا پیش کردہ دینی ادب آپ کے دینی افکار کا حامل تھا۔ لیکن یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس قسم کا ادب تعصب کا ہدف بنتا رہا ہے۔ حالانکہ اردو فارسی اور عربی کے کلاسیکی ادب سے کماحقہ آگہی حاصل کرنے کے بعد آپ کی شائستہ علمی تنقید ایک وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی ہے۔

تنہا انصاری نے جتنے خطوط لکھے ہیں۔ شاید ہی کشمیر کے کسی اور مفکر یا ادیب نے لکھے ہوں۔ آپ کے خطوط مکتوب نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان میں ذاتی تعلق کا لمس بھی ہے اور جذبات کی حرارت بھی۔ ان میں ان گنت مسائل پر

بے لاگ انتقاد ہے۔ جس کی بنیاد تحقیق و تفکر پر ہے۔ ان خطوط میں آپ نے جو فکری اور تمدنی مباحث ابھارے ہیں ان کی تازگی پر اب بھی کہنگی کا کوئی سایہ نہیں۔ یہ خطوط دراصل نثری ادب کے بہترین فن پارے ہیں۔ ان میں نثر کی وہ تمام خوبیاں ہیں جس سے اردو نثر کا بنیادی اسلوب عبارت ہے اور جس کی اعلیٰ مثالیں سرسید، شبلی، حالی اور آزاد کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ آپ کے نزدیک خطوط نویسی ایک تخلیقی کام تھا۔ اپنے اس Concept کی وضاحت وہ خود یوں کرتے ہیں3:

"آپ کہیں گے کہ یہ مضمون تھوڑے ہی ہیں۔ یہ تو خط لکھا جا رہا ہے۔ لیکن میں یہی عرض کروں گا کہ یہ مضمون ہے...... ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسا میں ویسا میرا مضمون۔ اصل میں مضمون ایک ایسا جامع لفظ ہے جس کی وسعتوں میں معنی اور مفہوم کے اعتبار سے بہت کچھ سما سکتا ہے۔ ادب کو چھوڑ یئے۔ دوسرے علوم وفنون کی بات کیجئے تو یہاں بھی مضمون کے بغیر کام بنتا نظر نہیں آتا۔ اصل میں دیکھا جائے تو گائے، بیل، پھول اور اس قبیل کے دوسرے حقیر موضوعات پر قلم اٹھانا اور پھر موضوع اور مضمون کا حق ادا کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ تو مرحوم خواجہ حسن نظامی ہی سے ہو سکا جس نے بے مایہ اشیا پر قلم اٹھا کر ذرے کو آفتاب بنا دیا۔ ذہن ان کی "سی پارۂ دل کی طرف منتقل ہوا"۔

ہر خط اضطراب و آشوب کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ ان یادگار تصویروں کو تنہا انصاری نے جیسے اپنے خون جگر سے پینٹ کیا ہوا ہے۔ ہر خط میں افسانہ اور

حقیقت ایک عجیب امتزاج پیش کرتے ہیں4:

''طبیعت دشمنوں کی نہیں بلکہ اپنی ہی ناساز تھی اور نہ جانے یہ ناساز گاری کب تک طبیعت کا ساتھ دیتی رہے گی۔ اب یہ حال ہے کہ ہر سال میرے جسم پر نئے نئے امراض نازل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ تقدیر کا صلہ ہے۔ایک ہی قبلہ کی طرف رخ کر کے جھک جانے کا اور جو لوگ پچھلے پندرہ سولہ برسوں میں ہر موسم میں اپنا قبلہ بدل کر بندے کو قاضی لحاجات بتاتے اور کہتے رہے۔ وہ اپنی بگڑی ہوئی دنیا بناتے اور سوارتے رہے۔انہیں اپنی خوش قسمتی نے ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رکھا''۔

ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں5:

''کبھی سوچتا ہوں کہ زہر ہلاہل کو زہر ہلاہل اور قند کو قند کہنے کی سزا اگر دنیا والوں نے دی تو کیا خدائے برتر نے بھی ان ہی کا ساتھ دیا۔ جن لوگوں نے ہر چیز کا سودا کیا وہ حصیر خاک سے اٹھ کر سریر سیم وزر پر جا بیٹھے۔ لیکن ہم قناعت کی اجڑی ہوئی دنیا میں''۔

آپ کی تحریر کا منفرد اسلوب مختلف سانچوں میں ڈھل کر نیا جادو جگاتا ہے۔ پروفیسر محی الدین حاجنی کے نام ایک خط:

''مجھے یقین ہے کہ آپ خشم ناک ہو چکے ہوں گے اور کف بدہن بھی اور ماڈرن قسم کی گالیاں تصنیف فرما رہے ہوں گے۔ اس لئے کہ آپ کو ''فکاہات'' ابھی تک نہ ملی۔ آپ مسدس کی طرز پر خوب گالیاں اس گنہگار کے

نام لکھ ڈالئے۔ مگر ایک شرط پر کہ وہ گالیاں ''آزاد غانایئہ'' کے زیرِ عنوان چھپے پر خود ہی گایئے اور گا کر سنایئے۔ کتاب تو ایسی ویسی ہے نہیں مجلد اور معتبر..... تو اس کو آپ تک پہنچانے والا انسان مجلد نہ سہی ''مُجرّب'' ہو اور معتبر۔ ان دو خاصیتوں کا حامل کوئی انسان آج تک نہ ملا۔ ایک اقبال (سوپوری) کچھ دن پہلے ضرور ملا تھا۔ مگر اس کا رخ مخالف سمت کو تھا۔ واللہ اقبال بھی کیا شاندار آدمی ہے۔ خالص اور ٹھیٹھ چربی کا بنا ہوا یا غستانی دنبہ۔ ملٹری ٹرک کی طرح ابھرتے ہوئے گوشت کا پیکر۔ انجینئروں کا خیال ہے کہ اقبال سے اب روڈ رولر کا کام بھی لیا جا سکتا ہے......''

اس شگفتہ بیانی کا ایک اور انداز شمیم احمد شمیمؔ کے نام خط میں رقم طراز ہیں:

''میں خوش تھا کہ آپ کھلے عام ایک معرکے میں پٹ گئے۔ آپ معرکے کے آدمی تو ضرور ہیں۔ اپنی زبان وقلم کا لوہا ہر دوست و دشمن سے منوا چکے ہیں۔ لیکن حکما کا قول ہے کہ تجربہ انسان کا سب سے بڑا استاد ہے۔ جسے آپ اصطلاح میں مار پیٹ کہتے ہیں۔ یہ مار پیٹ آپ کے عملی تجربوں میں ایک اہم اور تاریخ ساز اضافہ ثابت ہوگا''۔

ایڈیٹر آفتاب تنہاؔ صاحب سے عید ایڈیشن کے لئے ایک مضمون کے متمنی ہیں۔ مضمون سے ایک اقتباس:

''اکثر گھرانوں کے بچے اپنی ''عیدی'' کو محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ جوا کھیلنے کی ابتدائی مشق میں صرف کرتے ہیں۔ یہ ان کے

سپوت ہونے کی اچھی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ایسا مسلمان جس نے بھولے سے بھی کوئی روزہ نہ رکھا ہو۔ جو نماز پنجگانہ کی تفصیل سے بھی واقف نہ ہو۔ اس انداز و انہاک سے عید منانے کا اہتمام کرتا ہے کہ قرون اولے کے مسلمانوں کی روح دنگ رہ جاتی ہے......''

تنہا انصاری صحافت کے انحطاط پر بھی اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ثناء اللہ بٹ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے اخبار نویسی کے معزز پیشے کو اپنے مختلف فوائد کے حصول کی خاطر اختیار فرمایا ہے۔ عوام کو بے وقوف بنانا اب اخبار نویسوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ پر سکون حالات کو سنسنی خیز سرخیوں کے سانچے میں ڈھال کر اخبار کے پہلے صفحے پر بڑے اہتمام سے شائع کرنا کہ ہاکر کی پہلی آواز پر ہی اخبار بینی کے مریض پیسے ہاتھ میں لے کر اس پر پل پڑیں۔ مدیر آفتاب بھی آخر مدیر ہی ہیں۔ ان کے فن کے مظاہر بھی ہر سال عید کو ایکس پلاٹ کر کے زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی ایسی سبیل پیدا کر لیتے ہیں۔ جس میں ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے......''

شمیم احمد شمیم اور ان کی صحافت پہ اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔
''آئینہ گر کے خون جگر کے قطرے ''آئینہ'' کی ہر اشاعت کے چمن کے لئے بادِ بہاری کا کام کرتے آئے ہیں اور اسی خون جگر کی ودیعت ہے کہ آئینہ کو آئینہ ساز کی ایک نادر تخلیق سمجھا جارہا ہے۔ جس کی ہر ادا اس کے ادا شناسوں کو عزیز ہے۔

آئینہ کے سراپا میں اس کے جواں فکرفن کار کا کمال فن جھلکتا ہے۔ شمیم کا رواں دواں دماغ بجائے خود ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں فکروفن کے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی اس کے اپنے لفظوں، فقروں اور اسالیب اظہار کو بھٹکنے سے بچاتی ہے۔ لیکن یہی ''آئینہ ساز'' جب اپنے ہفت روزہ کو روز نامہ بنانے کا فیصلہ کرتا ہے تو تنہاؔ انصاری ایک پیش بین کی طرح خبردار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''نہ جانے کیوں کچھ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے آپ کی اس بشارت یا ضمانت پر یقین کرنے میں حائل ہو رہے ہیں۔ آپ کے ملٹی پرپز مشاغل پر نظر کر کے سوچتا ہوں کہ آپ ایڈوکیٹ ہیں۔ ممبر اسمبلی کی حیثیت سے حلقہ انتخاب کی لیڈری کا بوجھ بھی اٹھائے پھرنا ہے اور بھی نجی نوعیت کی دوسری متعدد مصروفیتیں آپ کے گرد گھیرا ڈالے ہیں۔ تو کیا آپ اتنی کم فرصتی کے باوجود ایک اعلا پایہ کا روزنامہ شائع کرنے کی ذمہ داری سے واقعی عہدہ برآ ہوں سکیں گے؟ خیر تیس روپے منی آرڈر کر کے بھیج رہا ہوں۔ اسے یوسفؑ کی خریداری کے شوق میں بڑھیا کی سوت کی انٹی سمجھ لیجئے''۔

ان خطوط کی شیرازہ بندی بلا شبہ ایک مستحسن کارنامہ تھا۔ ''خاطر احباب'' کی اشاعت کے سلسلے میں تنہاؔ صاحب کے فرزند کے علاوہ آپ کے برادر اصغر نشاطؔ انصاری اور کلچرل اکیڈیمی کے ایک سینئر آفیسر معراج الدین صاحب نے عرق ریزی سے کام کیا۔ اس سے قبل جناب نشاطؔ انصاری کی مساعی جمیلہ سے مرحوم کے کشمیری مجموعہ کلام ''فرات'' اور اردو مجموعہ کلام

''شبنمستان'' کو بھی منظر عام پر لایا گیا تھا۔

---

1 مکتوب بنام سید رضا کاظمی (چنڈی گڑھ)

2 تقریظ: خاطر احباب ص ۱۴

3 خط بنام خواجہ ثناء اللہ بٹ مدیر آفتاب: خاطر احباب ص ۹۰

4 خاطر احباب ص ۱۷۴

5 خاطر احباب ص ۱۶۶

6 یہ اقبال ان دونوں یارانِ نکتہ داں کا کوئی مشترکہ دوست رہا ہے۔ (آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
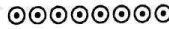
رحمان راہیؔ

پروفیسر رحمان راہیؔ کشمیر کے ایک اہم شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ آپ کا جنم ۱۹۲۵ء میں سرینگر شہر کے پائین علاقے وازہ پورہ میں ہوا۔ لڑکپن کے زمانے سے ہی ان کی بے چینیاں اور اضطراب انہیں بعض مقتدر شخصیات سے راہ و رسم پیدا کرنے کی تحریک دیتی رہیں۔ کتب فروش نور محمد ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ راہیؔ صاحب ان ایام کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں1:

''تب میں نویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ جاڑے کے دن تھے۔ میں نور محمد کی دکان سے کتابیں کرایہ پر لے کر پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن نور محمد نے ایک کتاب پہ مجھ سے سنجیدہ بات چیت کی۔ اچانک ان کی نیلی آنکھوں میں لہراتی ہوئی چنگاریوں نے میرے ناآشنا ڈھانچے پہ سحر سا کر دیا۔ یہ لمحہ بڑا جادوانی تھا جس نے میرے وجود کی کایا پلٹ دی۔ انہوں نے غیر شعوری طور مجھے کتابوں کا ایک زبردست عاشق بنا دیا۔ کتابوں سے مجھ پر مختلف اسرار کی گرہیں کھلنے لگیں۔ یہ دکان دراصل فیض اور عرفان کا ایک سرچشمہ تھی جہاں تشنہ لب اور ساقی دونوں جمع ہوجایا کرتے تھے۔ یہاں

مجھے مہجور، عبدالاحد آزاد، صمد میر، حفیظ جالندھری، پریم ناتھ بزاز، اور غلام رسول نازکی جیسی متعدد شخصیات سے متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا''۔

یہی چنگاریاں تھیں جنہوں نے رحمان راہی کی بے قرار روح کو ایک شعلہ بنا دیا۔ آپ نے انگریزی اور فارسی میں ایم اے کے بعد پبلک ورکس محکمے میں کلرکی کی۔ بعد میں آپ روزنامہ خدمت کے ادارتی عملے میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصہ تک امر سنگھ کالج میں پروفیسر رہے اور آخر کشمیر یونیورسٹی میں مختلف کلیدی عہدوں پہ کام کرنے کے بعد کشمیری شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے رٹائر ہوگئے۔

کشمیری زبان کے اولین جریدے ''کونگ پوش'' کے آپ کئی برس تک ایڈیٹر رہے۔ اس دوران اردو ماہنامے آزاد اور تعمیر میں آپ کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ آپ دہلی سے شائع ہونے والے اردو کے معتبر رسالے ''آج کل'' کے ادارتی بورڈ میں بھی کئی برسوں تک شامل رہے۔ آپ ساہتیہ اکادمی کے ایگزیکٹیو بورڈ اور جنرل کونسل کے ممبر بھی رہے۔ اس کے علاوہ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے صلاح کار بورڈ میں آپ ایک اہم ممبر رہے ہیں۔ اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''نوروز صبا'' پہ آپ کو ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

راہی صاحب کے تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی مضامین کے بکھرے اوراق کی اگر شیرازہ بندی کی جائے تو ان کی ترتیب وتہذیب سے تحریروں کی ایک قوس قزح بن جائے گی۔ ''کشمیری شاعری......دور جدید'' کے عنوان سے آپ کا مضمون ہمارا ادب کے ۶۲-۱۹۶۰ء کی خصوصی اشاعت میں شامل ہے۔ یہ ایک سیر حاصل مضمون ہے جس میں آپ نے کشمیری زبان میں شعری تخلیقات کے نئے رجحانات کا حقیقت

پسندانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں آپ روایتی اسالیب سے انحراف کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور شاعری میں تبلیغ کی تنقید کرتے ہیں۔

آپ کا ایک اور مضمون ''موجودہ سماجی ساخت میں تخلیقی ادیب کا رول'' کے عنوان سے شیرازہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں آپ اپنی وسعت نظر سے موضوع کی پیچیدگی کو سلجھاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''تخلیقی قلم کار سے یہ توقع رکھنا کہ وہ موجودہ سماجی نظام میں کسی سیاست دان یا سائنس دان یا معلم کا رول ادا کر سکتا ہے۔ اس کا مذاق اڑانے، اسے گمراہ کرنے یا اس کی صلاحیتوں کا استحصال کرنے کے برابر ہے۔ سیاست بازوں اور سماج وادیوں کی اس توقع کے خلاف ہر تخلیق کار کا سچا تخلیقی عمل ایک خاموش احتجاج ہوتا ہے''۔

اس قسم کی راست بازی سے ہی انہوں نے ہمارے عہد کے ایک روشن خیال تنقید نگار کی حیثیت حاصل کی ہے۔ ہر اہم ادبی مسئلے پہ ان کی آرا ہمیں ایک نئی جہت سے آشنا کرتی ہے۔ جس انداز سے وہ مختلف موضوعات کی تفسیر پیش کرتے ہیں اس سے معنویت کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''معاصر شاعری اور ابلاغ کا مسئلہ 2'' کے مضمون میں آپ نے جدیدیت کے میکانکی رجحانات کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔

یہاں انہوں نے جدید شاعری میں ابہام اور سادگی کا تجزیہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تضادات کو نظر انداز کر کے اصل مسئلہ تجربے کو موزوں ترین اور ناگزیر صورت عطا کرنا ہے۔ تنقیدی معیارات کی یہ تفہیم بلاشبہ راہی صاحب کا ہی

حصہ ہے اسی لئے آج بھی ادب کے طالب علم ان کی بات سننے کے لئے گوش برآواز ہوتے ہیں۔

---

1 شیرازہ شخصیات نمبر
2 شیرازہ سیمنار نمبر

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

غلام رسول سنتوش

سنتوش نے ۱۹ جون ۱۹۲۹ء کو ایک عام کشمیری گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ولادت ننھیال کے چھوٹے سے گاؤں ڈب میں ہوئی۔ سنتوش کے والد غلام احمد ڈار ایک سرکاری ملازم تھے۔ ان کی تبدیلی پلوامہ ہوئی۔ سنتوش کو بھی پلوامہ کے مڈل اسکول میں داخلہ دیا گیا۔ آپ کو اوائل عمر میں عجیب وغریب حالات سے گزرنا پڑا۔ گھر کے حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ دسویں کے بعد تعلیم جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ ادھر ان کے والد پینٹنگ کے بڑے خلاف تھے۔ ان ایام کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں1:

"......والد کی خواہش تھی کہ میں کسی سرکاری دفتر میں کلرک ہو جاؤں۔ میں ابھی خود کو کاروبار دنیا کے لئے تیار نہیں کر پایا تھا کہ ایک سانحہ گذرا۔ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب حالات کچھ سنبھلے تو محکمہ خوراک میں ورک چارج کی حیثیت سے ملازم ہو گیا لیکن سرکاری نوکری سے جلدی ہی اوب گیا۔ پھر رنگوں نے مجھے راہ دی۔ میں موٹر گاڑیاں رنگ کرنے اور کمپنیوں کے نام لکھنے لگا۔ ساین بورڈ تیار کرنے لگا۔ میں نے کچھ

دن مہاراجہ کے محل میں بھی رنگ و روغن کا کام کیا۔ میں نے مصوری کے کسی اسکول میں تربیت حاصل نہیں کی۔ رنگوں سے مجھے شغف تھا۔ تخلیقی تربیت اسی شغف نے دی......"

آج سنتوش کو بجا طور پر معاصرِ ہندوستانی مصوری کا ایک اہم رکن تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی بے پناہ ریاضت اور محنت سے اپنا انفرادی اسلوب دریافت کرلیا ہے۔ یہی انفرادیت آپ نے شاعری کے علاوہ افسانے میں بھی قائم کی ہے۔ آپ نے اردو میں لگ بھگ پچاس کہانیاں تحریر کی ہیں۔ آپ کی کہانیوں میں آفاقی مسائل ملتے ہیں۔ آپ کے افسانوں کا موضوع ذات کی تلاش نہیں بلکہ کائنات کی کھوج ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کے علامتی اظہار ہیں۔ آپ کے افسانے شیرازہ اور ہمارا ادب میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے ابتدائی دور کے افسانوں میں "چار چناری، ایک ماں تھی، خزاں کی خوشبو اور ٹھنڈی آگ کا دھواں" آپ کے فکر و فن کے نمائندہ افسانے قرار دئے جاسکتے ہیں۔ آپ کا افسانہ "ڈل کے آنسو2" منظری ایمائیت کی انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ اس کا پس منظر ڈل ہے۔ نہایت وسیع، عمیق اور لطیف پس منظر۔ افسانے میں متعدد تصویریں ایک دوسرے میں گھل مل کر پڑھنے والے کے ذہن پر انمٹ نقش چھوڑتی ہیں۔ یہ ہماری گردوپیش کی زندگی کے بڑے معمولی کردار ہیں۔ اپنی غیر معمولی صفات اور مجبوریوں کے ساتھ۔ افسانہ نگار نے اپنی نگاہ اور تخیل کی مدد سے ان کی دلآویز تصویریں کھینچ دی ہیں۔ یہ تصویریں نہ صرف ہماری عصری آگہی میں اضافہ کرتی ہیں۔ بلکہ آدمیت کا تصور بھی دیتی ہیں۔ افسانے سے ایک اقتباس:

''......میں جب سے پیدا ہوئی تھی تو ایک ہی ڈل کو جانتی پہنچانتی تھی، جس ڈل میں ہمارا نیا نیا ڈونگا تھا۔ جس میں ہر وقت دیودار کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا ایک سجا سجایا شکارا بھی تھا جس میں میرے بابا لوگوں کو تمہارے موتیوں کے کھیتوں کی سیر کراتے۔ جب رات کو بابا اپنا شکارا لیکر واپس آتا اور چولہا پھونکنے میں لگ جاتا، میں چپکے سے شکارا لے کر تمہارے ان موتیوں کے کھیتوں کو دیکھنے جاتی۔ میں نے کئی بار انہیں اٹھانے کی کوشش کی لیکن یہ چھو جانے پر پانی پانی ہو جاتے لیکن جوں جوں میں جوان ہونے لگی بوڑھے بابا کے ہاتھ شکارا کھینچنے کے بدلے مجھے مضبوطی سے پکڑتے رہتے، جیسے میں کوئی موتی تھی اور کوئی مجھے اٹھا لے جانے کی تاک میں تھا۔ اب ہمارے ڈونگے کی بوسیدہ تختیاں چرمرانے لگتیں اور ایک دن ہمارا ڈونگا میرا ہی ایک فرن بن گیا جس میں دوسرے ہی رنگ کے پیوند تھے......''

اس فنی جسارت میں ذہنی زندگی کی سہمی سہمی اور بے لاگ مصوری کا ایک منظوم مرقع پیش کیا گیا ہے۔ یہ قربتیں یہ دوریاں 3 سنتوش کی افسانہ نگاری کا ابتدائی جذباتی رنگ ہے۔ یہاں بھی اندھیرے اور اجالے آپس میں تحلیل ہوتے نظر آتے ہیں۔ آپ ایک حساس فن کار ہیں۔ اس وصف نے آپ کے فن کو جو گہرائی عطا کی ہے۔ آپ کا افسانہ ''سنگ مزار 4'' اس کا ایک شاہکار نمونہ ہے۔ ان گہرائیوں سے موتی نکالنے کے لئے قاری کو غوطہ زن ہونا پڑتا ہے۔ یہ سرسری طور پڑھنے کی چیز نہیں۔ یہاں خواب اور حقیقت، معلوم و نا معلوم، موجود اور ناموجود سب آپس میں

گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ سنتوش ہمیں لبھانے کے لئے افسانہ شروع کر دیتے ہیں تو ان کے قدم بظاہر ٹھوس زمین پر ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر چیز مانوس معلوم ہوتی ہے۔ پھر اچانک ایک موڑ پر منجمد حقیقت تاثرات میں تحلیل ہو جاتی ہے یہ پورا افسانہ اپنے تجریدی رنگ میں ہمارے سامنے ابھر آتا ہے اور ہم سے نئی جہتیں متعین کرنیکا تقاضہ کرتا ہے۔ بوڑھا سنگ تراش، اندھیرا، قبرستان، ہاری پربت کے مندر میں آرتی کی گھنٹیاں...... یہ ساری چیزیں مل کر افسانے کی فضا کو ایک پُر اسراریت بخشتی ہیں۔ اسی پُر جلال فضا میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ دراصل انسان خود اپنی قبر کا سنگ ہے اور اس سنگ پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ کیا ہوا ہے۔

سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' ان کی زندگی اور ان کے فن کا ایک عکس ہے5۔ اس میں شعوری رو کی سی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن کہانی کا کینوس محدود ہے۔ یہ سیدھا سادہ بیانیہ ہے۔ جس میں جگہ جگہ احساس کے فنی لمحے بیانیہ میں ادبیت پیدا کر دیتے ہیں۔ سنتوش اپنے گرد و پیش کی زندگی کی دلآویزیوں اور تنگ و تاریک مقامات میں رینگتی اور کراہتی ہوئی زندگی کے خط و خال فنی سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ آپ کی منظر نگاری ناول میں رنگ و بو کا ایک شدید احساس جگاتی ہے۔ یہ ایک مصور اور تصویر کی کہانی ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں رنگ روپ اور ریکھاؤں کا امتزاج ہے۔ اس تصویر کو کینوس پر اتارتے ہوئے یا صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے بقول مصنف اس نے اپنا برش اپنے ہی خون میں ڈبویا ہے۔ ممتاز ناول نگار ٹھاکر پونچھی اس ناول کے تعارف میں یوں رقم طراز ہیں:

''سمندر پیاسا ہے'' ایک دریا کی کہانی ہے جو بھکی بھٹکی چھوٹی

چھوٹی سی ندیوں کو اپنے سینے سے لگائے ان کی منزل کی جانب بڑھنے کی جستجو میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی میں اس کی اپنی محبت کی تکمیل ہے۔ میں نے جب سنتوش پر ''قفس اداس ہے'' ناول لکھا تو میرے سامنے ایک دریا کے سفر کی کہانی تھی۔ لیکن ''سمندر پیاسا ہے'' دریا کے سفر کی اپنی آواز ہے۔ اپنا سنگیت ہے۔ اپنی نگاہ ہے جس میں مصور کا جمالیاتی ذوق بھی ہے اور ایک ادیب کی پختہ نگاہ بھی''۔

یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ سنتوش انسانی نفسیات پر گہری نگاہ رکھتا ہے۔ یہاں اس کے سٹائل میں شعریت اور شگفتگی کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ متحرک نقاشی کی تمثیل Graphic Images ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہے۔ کہانی کا سوانحی Content اسے اور زیادہ دلچسپ بناتا ہے۔

کرداروں کی آرٹ گیلری میں ہاجرہ شکنت، پشپا، کانتا، کلپنا، آشا کئی تصویریں ابھرتی ہیں۔ یہ عورت کے لباس میں مختلف چہرے ہیں، عورت کی تصویر کے مختلف روپ ہیں۔ ہاجرہ ناول کا کلیدی کردار ہے۔ جس کا کھلی فضا میں پلنے والا بچپن تنگ و تاریک کوٹھری کے اندھیرے گوشوں میں پل کر روگی ہوتا رہا۔ صحت مند ماحول کے بدلے سینی ٹوریم ملا جو زندگی کی شام تک اپنی بچی کچھی مسکراہٹیں لٹاتی رہی۔ ناول سے ایک اقتباس:

''کانتا کی آنکھیں بھیگ گئیں اور گلا بھر آیا...... ''اگر ہاجرہ کو واقعی زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو کانتا کے لئے ہاجرہ کو اپناؤ اور اسے زندگی دو۔ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ تم سے پیار کرتی ہے......''!، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا

گیا۔ میں نے اپنے آپ کو خلا میں لٹکا محسوس کیا۔ مجھے احساس ہوا جیسے ایک زلزلہ آ گیا ہے اور گلمرگ کی پہاڑیاں ریزہ ریزہ ہو کر ایک ابلتے سیسے کی مانند بہہ کر میرے وجود میں سرایت کر رہی ہیں۔ جیسے تمام دیودار اور چنار ایک ساتھ اکھڑ گئے۔ سارا سینی ٹوریم جیسے ایک ساتھ گرج اٹھا...... میں دوڑتا ہوا ہاجرہ کے پاس گیا اور ایک چیخ مار کر اس سے لپٹ گیا......"ہاجرہ! تم نے اتنے برس مجھے کیوں نہ بتایا۔ یوں اندر ہی اندر گھلتی رہی۔ میں تمہارا ہوں ہاجرہ صرف تمہارا......" لیکن وہاں ہاجرہ نہ تھی۔ ایک منجمد برف کی سل تھی۔ ہاجرہ کی سانسیں دم روک کے سو چکی تھیں!......"

شکنت جسے ماں کی مہربان گود کے بدلے سینی ٹوریم کی بیمار گود ملی جسے نہ بچپن ملا نہ جوانی ملی صرف ایک روگ ملا۔ اسی روگ نے اسے تصویروں کی دنیا دی۔ وہ ایک ایسا چنار تھی جو بظاہر ہرا بھرا دکھائی دیتا ہے لیکن جس کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں۔ جو پیار کی تڑپ کے بغیر ایک شاہکار تخلیق کی متمنی ہوتی ہے۔ لیکن انجام کار محبت کا چراغ اس کے دل میں بے ساختہ جل اٹھتا ہے۔ پھر پشپا جوانی نے جسے بہکنا سکھایا وہ ایک ایسا بے رنگ و بو پھول تھی جسے سونگھنا کسی کو بھی گوارا نہ ہو۔ آشا جیسی ہونہار آرٹسٹ کو زندگی کی محرومیوں نے خاموش کر دیا اور کلپنا جس نے اپنے محبوب کو تصویروں کی دنیا دی گیت دئے اسے اس کا بچپن اور ماضی لوٹایا۔

ناول کا ایک اہم کردار جیوتی بھی ہے۔ جس کے یکے بعد دیگرے کئی چہرے ہیں۔ مکر اور شر کا یہ نمائندہ ہر موڑ پر سرگرم نظر آتا ہے۔ سنتوش نے زندگی کے ماہ و سال میں کامیابیوں کی نت نئی منزلیں سر کیں۔ وہ عرش و فرش کی آواز سے بے

نیاز حدِ پرواز سے بھی آگے نکل گیا۔ کشمیر کے صف اول کے ادیب جناب علی محمد لون اپنے ہم عصر دوست کے متعلق لکھتے ہیں6:

''غلام رسول سنتوش ایک ایسا ساگر ہے جس کی اور کئی ندیاں لپکتی دوڑتی جارہی ہیں۔ لیکن سنتوش کی پیاس پھر بھی نہیں بجھتی سنتوش نے زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کیا لیکن اس کی آتما اسی ساگر کی طرح پیاسی ہے۔ خدا کرے کہ اس کی آتما کی پیاس کبھی بجھنے نہ پائے کیونکہ ایک کلاکار کی آتما جب تک پیاسی رہے گی تب تک اس کی کلا زندہ رہے گی۔ سنتوش اس وقت بین الاقوامی شہرت کا مصور ہے۔ اس نے اب اردو کی ناول نگاری کی دنیا میں قدم دھرا ہے۔ جو اس کی اپنی پیاسی آتما کا اعجاز ہے''۔

---

1 آج کل فروری ۱۹۷۲ء

2 شیرازہ ستمبر ۱۹۶۴ء ص ۹۱

3 انتخاب اردو ادب ۱۹۷۰ء ص ۱۶۵

4 دوماہی شیرازہ افسانہ نمبر ص ۱۵۵

5 سروری کشمیر میں اردو ص ۲۴۴

6 ''سمندر پیاسا ہے'' بیک ٹائٹل

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

امیش کول

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست سیاسی اعتبار سے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ کشمیر میں ایک نئی ادبی فضا پروان چڑھنے لگی۔ اس حوصلہ افزا ماحول میں جو متعدد قلم کار سامنے آئے ان میں امیش کول کا نام نہایت معتبر حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''یاقوت'' ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا۔ ''کونگ پوش'' کی باشعور ادبی محفل میں امیش کول کے اس نقش اول نے انہیں نئے تقاضوں کا ایک اہم ترجمان بنا دیا۔ اس کے بعد ان کے متعدد افسانے شائع ہوئے۔ ''اس پار سے اس پار تک، دائرے اور مرکز اور عورت اور مرد'' ان کی اہم کہانیاں ہیں۔ چتر کاری کے فن سے بھی انہیں شغف رہا ہے۔ غالباً اسی لئے ان کی اکثر کہانیوں میں فطرت کا کردار بھی ایک ہم راز آشنا کی طرح ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے۔ قوس قزح کے رنگوں کا یہی خواب ناک امتزاج انہیں اپنے دیگر ہم عصروں سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ اپنے افسانے ''عورت اور مرد'' میں آرزوؤں کے زخم پینٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ عورت، یہ عریاں بازو، یہ چاندنی اور یہ پریشانی زلفیں......
نہیں۔ یہ پرانے پتھر کا زمانہ......ابھی انسان کھلے آسمان تلے سوئے ہیں۔

پتھر کے سرہانے بناتے ہیں اور دانتوں سے مانس کاٹ دیتے ہیں۔ زندگی
صحرا ہے اور مسکراہٹوں پہ نیل پڑ گئے ہیں......روف کے گیت فاصلے پر ہیں
اور دور لاریاں سڑک پر سے گذرتی ہیں۔ صبح ہونے سے پہلے خدیجہ جاگ
پڑی۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی جیسے دن کا جلاد اور رات کی سیاہی
ساتھ ساتھ سو رہے ہوں اور ان پر شبنم کی شراب چھڑک دی گئی ہو......ایک
عجیب سا میٹھا میٹھا خمار"۔

اس افسانے میں مظلوم عورت کی گھٹن، اس کی مجبوری اور لاچاری کی ایک لرزاں خیز تصویر ابھرتی ہے۔ اگر چہ کہیں کہیں فن کی نزاکت اور موضوع کی صداقت پر ان کے طرز بیان کا انداز غالب نظر آنے لگتا ہے تاہم مندرجہ بالا افسانہ ان کے فنی ارتقا کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مناظر سے جو مجموعی فضا پیدا ہوئی ہے اور جس بوسیدہ زندگی کی مصوری کا عکس پیش ہوا ہے وہ ہمارے اس دور کے دبے کچلے عوام کی محسوسات کا ہم راز ہے۔

ان کا ایک اور اردو افسانہ تین قدم، تین موسم ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس کی جوانی ڈھلتی جا رہی ہے۔ کہانی کار نے اس الجھن کو جس نفسیاتی باریکی سے پیش کیا ہے۔ وہ قابل داد ہے۔ یہ کہانی اس لحاظ سے بھی ایک فن پارہ قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ اس میں عمر اور ذہن کی کشمکش کو نہایت ماہرانہ طریقے پہ برتا گیا ہے۔ اس عورت کی نفسیات کے ایک باریک گوشے سے نقاب اٹھایا گیا ہے۔ نقطہ عروج کافی واضح ہے اور کہانی جیسے عنوان میں جذب ہو کر رہ گئی ہے......

امیش کول ایک چوتھائی صدی سے بھی زائد عرصے تک براڈ کاسٹنگ کی

دنیا سے وابستہ ہے۔ اس دوران ان کی کئی ایک کہانیاں اور ڈرامے شائع یا نشر ہو چکے ہیں۔ ان کی بعض اردو کہانیاں ہندی سکرپٹ میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں ''آخری لکیر اور ایک راکھشس ایک دیوتا'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ اردو میں ان کے کئی تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی مختلف اہم رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ کشمیر کے ادبی حلقوں میں ان کی آواز اعتبار اور احترام سے سنی جاتی رہی ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
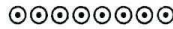
شیخ محمد اقبال

آپ ۱۹۲۸ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سری نگر میں ہی حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد آپ نے ۱۹۴۶ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ کا تقرر ڈپٹی کسٹوڈین (جموں) کی حیثیت سے ہوا لیکن آپ اس پرآشوب دور کی ہنگامہ خیزیوں سے خود کو دور نہ رکھ سکے۔ چنانچہ چیف ریفوجی آفیسر اور سکرٹری اوقاف کی حیثیت سے آپ کی خدمات قابل قدر رہیں لیکن انتظامیہ کے بعض حلقے آپ کے کام سے مطمین نہیں تھے۔ آپ کو جموں سے تبدیل کر دیا گیا۔ آپ نے سری نگر کے ایس پی کالج میں طلبہ کو تاریخ پڑھانے کے کام کو ترجیح دی۔ اس کے بعد آپ کا تبادلہ مختلف کالجوں میں ہوتا رہا۔ اسی دوران آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ آپ مشرق وسطا کے کئی ممالک میں اسٹڈی ٹور کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر اقبالؔ کی دلچسپیوں کا محور ''اسلامیات'' رہا ہے۔ ''اسلام کے سائے میں'' آپ کی ایک اہم تصنیف ہے جو ۱۹۵۸ء میں شایع ہوئی ہے۔ یہ

کتاب دراصل ان جوان اور بالغ نظر دوستوں کے لئے لکھی گئی ہے جو اسلام
اور اس کی شاندار تاریخ اور ان مٹ کارناموں سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں۔
جن کی آنکھیں غیر اسلامی نظاموں کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ ہو چکی
ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں اقبال صاحب لکھتے ہیں1:

''اس کتاب کی تکمیل سے قبل میں نے اس موضوع پہ ایک مضمون
لکھا تھا۔ جو موضع بجبہاڑہ کے سہ ماہی اسلامی اجتماع کے موقع پر پڑھا گیا۔
گزشتہ اڑھائی سال میں اس موضوع میں اضافہ ہوتا گیا اور آخر کار میں نے
پہلا مسوّدہ کتاب مرتب کیا۔ میں اس کتاب میں پیش کردہ مواد کی جدت کا
دعویدار نہیں ہوں تاہم میرا یقین ہے کہ اس انداز میں کوئی چیز اب تک اسلام
کے عام مطالعاتی لٹریچر میں میری نظر سے نہیں گزری ہے''۔

کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔کئی ایک عنوانات اس طرح ہیں۔
اسلامی انقلاب، اسلامی طرز حکومت، اسلام اور جمہوریت، اسلامی
نظام میں عورت کا مقام، کیا اسلام مانع ترقی ہے؟ ہر باب میں فاضل مصنف نے
نہایت سلجھے ہوئے پروقار انداز میں اپنا عندیہ واضح کیا ہے۔آپ کی عالمانہ نثر
سے ایک اقتباس2:

''آج مسلمان تنظیمی روح سے بیگانہ ہے اور اپنا اصلی مقام کھو چکا
ہے۔اب جبکہ اس میں وہ خداداد مقناطیسی قوّت موجود نہیں۔اسلام کی عظمت
اور مسلم رہنماؤں کے بلند بانگ دعوے غیر مسلموں کے دلوں میں گھر نہیں
کرسکتے۔ یہ بات اس وقت ممکن ہوسکتی ہے جب مسلمان اپنے کریکٹر کو

اسلامی قالب میں ڈھالیں۔ دنیا کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور شیرازہ بندی کا واحد ذریعہ وہی پیغام ہے جو اسے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ سے پہنچا ہے۔ موجودہ دور کی ترستی ہوئی دنیا اسلام کی آغوش میں آ کر ہی مطمین رہ سکتی ہے۔"

شیخ محمد اقبال ایک اچھے مورخ بھی ہیں۔ آپ کی کتاب "تاریخ ہند" برصغیر کی تاریخ کا ایک نئے زاوئے سے مطالعہ کرتی ہے۔ یہ کتاب لگ بھگ چھے سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بیشتر مورخین مسلمانوں کے ادوار کا جانب دارانہ مطالعہ پیش کرتے رہے ہیں لیکن یہ کتاب ان ادوار کا نہایت جرات مندی سے ایک بے باک اور حقایق پر مبنی جایزہ پیش کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی مستحسن کاوش ہے۔ تاریخ پر آپ نے کئی کتابیں انگریزی میں بھی تحریر کی ہیں۔

"شہیدوں کے سردار" ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ایک اور اہم تصنیف ہے۔ یہ تاریخ اسلام کے محبوب ترین شہیدوں کی شہادت اور اس کے فلسفہ پر مبنی ہے۔ شہید کربلا کی عظیم شہادت کا اس کتاب میں سیر حاصل جایزہ لیا گیا ہے۔

---

1 پیش لفظ؛ اسلام کے سائے میں

2 اسلام کے سائے میں؛ صفحہ نمبر ے

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

خواجہ ثناء اللہ بٹ

آپ ۱۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اپنا آبائی پیشہ تجارت اپنانا چاہا لیکن فطرت نے آپ کو ایک اور ہی شعبہ میں اپنی نمایاں کارگزاری کے لئے منتخب کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۵۲ء میں مظفر آباد سے ہفت روزہ ''کشمیر'' نکالا۔ اس پرچے کی بے لاگ پالیسی ارباب اقتدار کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ نتیجے کے طور پر مارچ ۱۹۵۷ء میں آپ کو اپنے دیگر رفقاء سمیت گرفتار کیا گیا۔ بعد میں پاکستان کی مسلح فوج نے آپ کو حد متارقہ جنگ کے اس طرف اپنے آبائی وطن میں دھکیل دیا۔

جون ۱۹۵۷ء میں آپ نے سرینگر سے ہفت روزہ ''آفتاب'' شائع کیا۔ جس کو چند ماہ بعد روزنامے میں تبدیل کیا گیا۔ یہ روزنامہ آج تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا ہے اور اپنی اشاعت کی اس طویل ترین تاریخ کے ہر بلند و پست میں بلاشبہ عوام کے دل کی دھڑکن بنا رہا ہے۔ لگ بھگ پینتیس برس قبل آپ نے آفتاب کی شکل میں جو پودا لگایا تھا آج وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ اس عظیم درخت کی گھنی چھاؤں میں وادی کے نہ جانے کتنے ادیبوں نے جنم لیا اور جوان ہو گئے۔

کتنے قارئین نے اس کے مضامین کا مطالعہ کیا اور ان کی مدد سے اپنے شعور کی تربیت کی۔ اس طویل دور میں آپ کی ہمدردیاں حاصل کرنے یا آفتاب پہ کسی خاص مکتب فکر کی لیبل چسپاں کرنے کی بہت کوششیں کی گئی۔ لیکن خوابہ صاحب نے ایک معقول صحافی کی طرح ان اشتعال انگیزیوں کا مستحسن طریقے پہ مقابلہ کیا اور ''آفتاب'' کی آزادی پہ آنچ نہیں آنے دی۔ تاریخ کے تاریک ترین ادوار میں بھی اس جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرنا آپ کا ہی حصہ ہے۔ کشمیر میں آفسیٹ پرنٹنگ پہ اخبار شائع کرانا بھی آپ ہی کی اختراع تھی۔ آپ کو بلاشبہ ریاست جموں وکشمیر میں صحافت کا Trend Setter قرار دیا جاسکتا ہے۔ زبان وبیان پہ آپ کا ملکہ ہے۔ آپ کی شگفتہ تحریر کے خستہ رنگ ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' سے بہ خوبی عیاں ہوتے ہیں۔ آپ یہ کالم ایک چوتھائی صدی سے روزانہ لکھتے رہے ہیں لیکن اس کی تازگی اب بھی قائم ہے۔

ایک منفرد اور معقول صحافی کے علاوہ آپ ایک اچھے محقق بھی ہیں۔ آپ نے کشمیر کی تیس سالہ سیاسی تاریخ کے واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔ آپ کی یہ کتاب ''کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک'' کے نام شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب جن اہم امور پر بحث کرتی ہے۔ ان میں ۱۹۵۳ء کا خونی انقلاب، آزاد کشمیر میں مسلح بغاوت، کشمیر سازش کیس، موئے مبارک ایجی ٹیشن جیسے سلگتے امور شامل ہیں۔ کتاب میں ان سارے معاملات پہ ایک نئے انداز سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔ آپ کا طرز بیان اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ یہ صرف سنی سنائی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ عینی مشاہدہ ہے۔ آپ نے ایک سچے مورخ کی طرح نہ کسی سیاسی مکتب فکر کی مخالفت کی ہے اور نہ بے

جا حمایت۔ آپ کا انداز کھرا اور دو ٹوک ہے۔ کتاب میں فن خوشنویسی کا حسین مظاہر کیا گیا ہے۔ طباعت بھی نہایت مناسب ہے۔ اس کے بعد توقعات کے برعکس آپ کی کوئی اور کتاب سامنے نہیں آئی اور آپ کی ساری توجہیں ساری کاوشیں اور ساری ریاضتیں اپنے محبوب روزنامے کو سجانے سنوارنے میں مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

یہاں ہم خواجہ ثناءاللہ بٹ کے معروف ومقبول روزنامہ کام ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' سے چند نمونے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

''سنا ہے کہ...... اپنے شہر ناشاد کے لوگ آج کل میچ خوب کھیلتے ہیں۔ ہاکی کا میچ ہو یا فٹ بال کا سرینگر سٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب یہاں اسی قسم کے میچ پسند کئے جاتے ہیں۔ اب نہ تو لوگوں کو کسی سیاسی میچ میں دل چسپی ہے اور نہ سماجی برائیوں کے میچ کی طرف توجہ دینے کی فرصت...... سیاسی کھلاڑیوں نے بھی اپنے عوام کے دلوں کا حال بھانپ لیا ہے۔ اس لئے وہ آپس میں میچ کھیلنے کی بجائے چپکے سے تماشائیوں کی صف میں جا بیٹھتے ہیں اور جب ان کا جی چاہے نمائش میں جا کر تقسیم انعامات کی رونق بڑھاتے ہیں اور کبھی کبھی مچھلیوں کا شکار کھیلنے جاتے ہیں۔ خدا معلوم سچ کیا جھوٹ کیا ایک صاحب نے بتایا شہر میں ایک جگہ چرسیوں کو اپنے تکئے کا صدر منتخب کرنا تھا تو انہوں نے ایک لیڈر کو اپنی اس تقریب پر

بلایا۔ چنانچہ لیڈر صاحب وقت مقررہ پر تکئے میں پہنچے۔ ان کے سامنے چرسیوں نے اپنے صدر کا انتخاب کیا اور اس لیڈر کے ہاتھ سے اپنے نئے صدر کی دستار بندی کرائی۔ اس کے بعد چرسیوں نے گستابہ دی گریٹ سے اس لیڈر کی خاطر تواضع کی اور مجلس برخاست ہونے کے بعد دم مارو دم کے خصوصی اجلاس میں اس لیڈر کی جمہور نوازی کو زبردست خراج تحسین ادا کیا گیا...... میں نے جیسا سنا بالکل ویسا پیش کر دیا آگے حضور مالک ہیں''۔

اے کاتب تقدیر بتا کیا میں نے کیا ہے؟[2]

''اپنے لوگ بھی بڑے غضب کی مخلوق ہیں کہتے ہیں چلو اگر خوراک پہ سبسڈی کم کر دی گئی ہے......تو ٹھیک ہے لیکن اس بجلی کو کیا ہو گیا؟ ایسی پتلی حالت تو پچھلے کئی برسوں کے دوران بھی نہیں تھی۔ جتنی آج ہو رہی ہے۔ ریڈیو سے ترقیاتی پروجیکٹوں کے وجد آفرین نغمے نشر ہوتے ہیں۔ لیکن گھر گھر میں اندھیرا چھایا ہوا ہے اور جب اس گھپ اندھیرے اور موم بتی کی لائیٹ میں ٹرانسسٹر سے بڑے بڑے ترقیاتی پروجیکٹوں کے مدھر گیت سنائی دیتے ہیں تو ایک غریب شہری کبھی موم بتی اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے اور پھر دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ......کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ترقی یافتہ ہو چکا ہوں اور مجھے خبر ہی نہیں''۔

اللہ خیر کرے[3]

''دلیجیو، دوڑیو پکڑیو اپنے سیکنڈ کلاس یعنی درجہ دویم کے لیڈروں کی

دھوم مچ رہی ہے۔ابھی یہاں ابھی وہاں۔نہ جانے پھر کہاں ہوں گے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ولولہ انگیز تقریریں عوام کو بہت پیاری لگ رہی ہیں سنا ہے۔ اگلے دن جب آنجہانی محاذ رائے شماری کے سکرٹری جنرل اور بقید حیات نیشنل کانفرنس کے کرت والڈھیم آف بھدرواہ درقصبہ اسلام آباد پہنچے تو وہاں ایشائے کوچک کے بنے بنائے سرداروں اور مغل شاہسواروں کے نمک خواروں نے بھدرواہی صاحب کا نہایت پُرتپاک استقبال کیا۔ چنانچہ بھدرواہی صاحب نے جب دربار عام میں اپنی شعلہ بیانی سے کام لیتے ہوئے بجلی کا کڑکا سا دکھایا تو اس سے ایک طرف تو اسلام آبادی عوام کی جھولیاں شالی سے بھر گئیں۔ پھر بھدرواہی صاحب جب سوپور کی طرف کوچ کر گئے تو وہاں دریائے جہلم کی لہروں میں تیزی آ گئی اور پانی کی موجیں کنارے کراس کر کے بھدرواہی صاحب کا استقبال کرنے سڑک پر آ گئیں......اللہ خیر کرے اور اہل شہر کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

---

1 کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ تک ؛ پیش لفظ

2 روزنامہ آفتاب ۹/اپریل ۱۹۷۶ء

3 روزنامہ آفتاب ۱۶/جنوری ۱۹۷۶ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

شمیم احمد شمیم

تہذیبی اور ادبی حلقوں میں راسخ فنی اظہار کی جگہ خودستائی اور خودفریبی کے بت کدوں نے لے لی ہے۔ اچھے ادب کی جگہ آج سائیکوفینسی نے لے لی ہے۔ خود ہی آئینہ اور خود ہی عکس کا اصول ادبی احتساب کی کسوٹی بن چکی ہے۔ جن کے پاس سنگھاسن ہے ان کے اردگرد مصاحبوں کے گروہ ہیں جنہوں نے مفاد پرستی کے بہت سے پنجرے بنا رکھے ہیں۔ ان پنجروں میں الیوژن کے طوطے اپنی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سارا تماشہ بڑا پُر فریب ہے۔ ان رجحانات کے خلاف پچیس برس قبل ایک نوجوان نے یلغار کا طبل بجایا تھا۔ وہ نوجوان ایک شعلہ تھا، ایک للکار تھا، ایک تلوار تھا۔ اس نوجوان نے بغاوت کو اپنے خون کی زبان دی۔ اس کے قلم کی جادو داں تاثیر نے خودفریبی کے ذرہ بکتر تار تار کر ڈالے۔ اس کی بے باک تحریریں اس عہد کی مزاج داں تھیں جن سے اس عہد کی صحافت اور ادبی کے سوتے پھوٹتے تھے۔ یہ دانشور ہمارے عہد کی جمالیات کا سرچشمہ تھا۔ یہ نوجوان شمیم احمد شمیم تھا۔

فکری بصیرت کا یہ ستارہ شوپیاں کے ناسنور گاؤں میں مولوی عبداللہ وکیل کے تیسرے بیٹے محمد یعقوب کے گھر میں ۱۹۳۴ء کو طلوع ہوا۔ چار پانچ برس کی عمر میں

ہی انہیں قرآن مجید احادیث اور روایات کے اس اسلحہ سے لیس کیا گیا جس سے مرزا صاحب کے مسیح موعود ثابت کرنے کی جنگ لڑی جاسکتی تھی۔ گیارہ برس کی عمر تک وہ اچھے خاصے مولوی ہو گئے۔ لیکن پھر اہل ناسنور نے ان کے والد کا سوشل بائیکاٹ کر کے ان کے کنبے کو شوپیاں منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں انہوں نے تخلص رکھ کر شاعری شروع کر دی۔ شخصیت کے خدوخال بتدریج ابھرنے لگے۔ میٹرک پاس کر کے سرینگر کے ایس پی کالج میں داخلہ لیا تو اس دیہاتی وضع قطع کے منحنی سے لڑکے نے کالج کے میگزین ''پرتاپ'' میں بعض پروفیسروں کے خاکے لکھ کر اپنے قلم کی توانائی کا لوہا منوالیا۔ اس کے رگ وریشے میں بغاوت کی مقدس آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ ایک محشر خیال تھا۔ ایک جہانِ آرزو۔

بی اے کا امتحان پاس کرتے ہی پروفیسر میر نصر اللہ کی وساطت سے محکمہ اطلاعات میں ملازمت مل گئی۔ آپ کو ماہنامہ ''تعمیر'' کی ادارت سونپی گئی۔ یہ ایک صحافی کی ہنگامہ خیز زندگی کا آغاز تھا۔ آپ کی نادر ادبی تخلیقات کی وجہ سے ''تعمیر'' کے ان شماروں کو آج بھی سند کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں آپ نے جو تنقیدی مضامین تحریر کئے وہ فکر انگیز ہیں۔ آپ کے مشاہدات وتاثرات بصیرت و بصارت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر گہری نظر، معمولی سے معمولی واقعہ کو اپنی باریک بین نظروں کی گرفت میں لے کر کسی شخصیت کے اندروں تک رسائل حاصل کرنا، الفاظ کا موزوں ترین استعمال اور زندگی کی شگفتگی سے لبریز نثر۔ سبھی کچھ آپ پر گویا ختم ہے۔ ''کشمیری ادب میں رومانوی رجحانات'' کو ایک تحقیقی وتنقیدی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس تفصیلی جائزے میں

آپ نے اختر محی الدین کے کشمیری افسانے ''آدم چھ عجب ذات'' کا ہر پہلو اجاگر کیا ہے۔ وہ قاری کو اس افسانے، اس کے پس منظر، اس کے موضوع، تکنیک اور فلسفہ کے ساتھ بین الاقوامی رجحانات کی آگہی بھی دلاتا ہے۔ وہ اپنی بے پناہ فہم و فراست سے ایک چھوٹے سے افسانے کو افکار و اقدار کی نئی کائنات سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس مضمون سے ایک اقتباس:

''کشمیری زبان میں کسی افسانے پر آج تک اتنی متضاد رائیں قائم نہیں ہوئی ہیں۔ بعض ادبی محتسبوں نے افسانے کو تمسخر کا نشانہ بنایا۔ کچھ ''ترقی پسند'' اختر پر رجعت کا الزام عائد کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے اور چند ''خدادوست'' بزرگوں نے اختر کے اس افسانے کو فلسفہ تصوف کی تفسیر سمجھ کر مصنف کے حق میں دعائے خیر کی۔ لون اور ٹینگ کے سوا کسی اور صاحب نے افسانے کو نہیں سراہا...... ناقدین اور معترضین نے اپنے تجزیے کی ساری عمارت ایک غلط بنیاد پہ قائم کی ہے اور جب ''خشت اول'' ہی کج ہو تو دیوار کی کجی ایک منطقی نتیجہ بن جاتی ہے۔ دراصل ایک رومانوی افسانے کو حقیقت نگاری کے مقررہ معیاروں پر پرکھنے سے گمراہ کن نتائج اخذ کئے جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سائنسی تنقید کی اساس عقلیت اور پختہ سماجی شعور پر ہے۔ لیکن ہر صنف ادب کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ادب میں رومانوی تحریک کا ارتقا اگرچہ اس وقت میرا موضوع نہیں۔ لیکن یہ اس لئے ناگزیر ہے کیونکہ افسانے کے رومانوی کردار کو صرف اسی صورت میں واضح کیا جاسکتا ہے......''

اپنے اسی مضمون میں افسانے کے مرکزی کردار پہ بحث کرتے ہوئے

وہ لکھتے ہیں:

"Nostalgia سے پیدا شدہ جذبات انتہائی فطری ہیں۔ پورے چال سال رمضانا ان جذبات کو اپنے سینے میں جوان کرتا رہا اور رفتہ رفتہ ان کی شدت جنوں کا رنگ اختیار کر گئی۔ وہی رمضانا جو اونچے اونچے پہاڑوں اور ڈل کو قید خانے سے تعبیر کرتا تھا۔ اب اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ رمضانا کے دل میں ان جذبات کا پیدا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا ماں کے دل میں اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کی محبت کا طوفان اٹھ آنا۔ اس فطری کیفیت کو رمضانا کی رومانیت نے جنون کی سرحدوں سے ملا دیا۔ Romantists تو بہر حال Abnormal ہوا کرتے ہیں۔ رمضانا نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر ایک نئی دنیا آباد کر لی جہاں وہ حسن فطرت کے چند مظاہر کی پرستش کرتا ہے گویا رمضانا کی رومانیت نے اپنی آسودگی اور اپنے اظہار کے لئے جذب وشوق ایک پیکر تراشا"۔

نفسیات کی یہ تہہ در تہہ گرہیں کھولنا اور قاری کے شعور کو بالیدگی کی نئی رفعتوں تک پہنچانا آپ کے تنقیدی مضامین کا خاصا رہا۔ اسی زمانے میں آپ کے بعض دیگر اہم مقالے بھی معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ جن میں کشمیری زبان وادب کے چند مسائل "ہمارا ثقافتی وفد" "کشمیری ناول" بھی شامل ہیں۔ "فیض کے ساتھ ایک شام" آپ کا ایک اور اہم ادبی مضمون تھا۔ ان سبھی مضامین میں آپ کا بے خطا حربہ وہی موثر اسلوب نگارش ہے جس کے نشان اردو ادب و صحافت میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔

آپ کے سیمابی طبیعت نے آپ کو ملازمت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔
آپ علی گڈھ چلے گئے اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے سرینگر کی عدالت میں
پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۶۳ء میں جالب صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی جن کے
بطن سے آپ کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ہفت روزہ ''آئینہ'' شروع
کیا۔ انہوں نے اس اخبار کو ہمیشہ اپنا عظیم ترین اثاثہ سمجھ کر اس کی قدر و منزلت
بڑھانے کے لئے غیر معمولی محنت، استقلال اور عزم کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اس
اخبار کے کالموں کو اپنی قلمی یلغار اور موج زن تڑپ اور طلب کا مقبول ذریعہ اظہار
بنایا۔ آپ کے دست راست محمد یوسف ٹینگ ''آئینہ'' کے اس سنہری دور کا یوں
تذکرہ کرتے ہیں1:

''...... میں ان کے ساتھ شام کو بیٹھ کر ''آئینہ'' کی ترتیب میں جٹا
رہتا تھا۔ لیکن ان کی تحریر کی خوشبو اس طرح آہستہ آہستہ کھلتی تھی کہ جب صبح کو
اخبار طباعت کی بھٹی سے نکل کر میرے ہاتھوں میں آجاتا تو میں حیران رہ جاتا
تھا۔ یہ بات جیسے سچ لگتی ہی نہ تھی کہ یہ اخبار ہمارے دور افتادہ شہر سے نکلتا
ہے۔ اس کی میٹھی اور کڑوی، کراری اور کسیلی شوخ وشنگ، خستہ خستہ Crisp اور
برجستہ تحریریں پڑھ کر مجھے اپنے اوپر رشک آنے لگتا کہ برصغیر کے دوسرے
شہروں کے اخبار بین اتنے تیز وطرار، طوفان بدوش اور شرربار اخبار سے اپنی
آنکھوں اور ذہنوں کی ضیافت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب یہ شعلہ چھپ گیا تو
محسوس ہوا کہ یہ صبح کاذب کا بھرم تھا......''

آئینہ کے شخصیات نمبر کو شہرت عام اور بقائے دوام کا درجہ حاصل ہوا۔ اس

میں آپ نے سرکردہ اصحاب کے قلمی چہرے پیش کئے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ایسے مرقعے اردو میں بہت کم لکھے گئے یں۔ وہ اپنی باریک بینی اور مردم شناسی سے بعض قد آور شخصیات کو محض چند الفاظ میں سمیٹ لینے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ مولانا مسعودی کا خاکہ یوں رقم کرتے ہیں:

''موئے مقدس کی تحریک کے دوران تین نعروں نے جنم لیا۔ سازش کو ننگا کرو۔ اصلی مجرم کو پیش کرو اور مولانا مسعودی زندہ باد۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے سازش کو ننگا کرنے کی بجائے اسے کپڑے پہنائے گئے۔ اصلی مجرموں کو پیش کرنے کی بجائے نقلی مجرموں کو بھی رہا کر دیا گیا اور مولانا مسعود زندہ باد ہونے کی بجائے ایک سوالیہ علامت ہو کر رہ گئے......''

ایسا لگتا ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اس بات کے اظہار کے لئے یاران نکتہ داں کو صفحوں کے صفحے سیاہ کرنے پڑتے لیکن شمیم نے صرف تین جملوں میں سب سے موثر طریقہ پر ساری داستان بیان کی۔ وہ شخصیات کے کمزور پہلوؤں کو بھی اپنے خاکوں میں پیش کرنے کا ایسا ڈھنگ جانتے تھے کہ پڑھنے والا ان کمزوریوں کے باعث اکثر متعلقہ شخصیت سے متنفر نہیں ہوتا تھا۔ زبان و بیان پر ان کی بے پناہ قدرت ان کی نثر کی ہر سطر سے صاف عکس ریز ہوتی تھی۔

ان کا مستقل کالم ''چراغ بیگ'' ایک ادب پارہ تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کے الفاظ کا انتخاب جملوں کی ترکیب، عبارت کی بندش اور مضامین کی ترتیب مل کر ان کی تحریر کو واضح بناتے تھے۔ وہ الفاظ کو ایک ماہر صناع کی حیثیت سے استعمال کرتے۔ ان کے دلائل محکم ہوتے اور پوری تحریر میں بے پناہ نظم وضبط پایا جاتا تھا۔

وہ قاری کو قدم بہ قدم دلیل کی قوت سے اپنے ہمراہ لے کر چلتے اور قاری بے اختیار کہہ اٹھتا۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شمیم یکم مئی ۱۹۸۰ء کو اس دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا۔ پینتالیس سال کی عمر میں۔ جب اس کی ذہنی صلاحیتیں اپنے شباب پر تھیں اس کے پُر جہاد ماہ و سال سے آ گہی رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کی موت کے ساتھ نہ جانے کتنے طوفانی خواب اور نہ جانے کتنے کھلنے والے باب ختم ہو گئے۔ اہل سیاست اگر اس بُت شکن بے باک صحافی کے کارناموں سے آج انکار بھی کریں لیکن ادبی حلقوں میں آپ کی گراں قدر عطا کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

---

1 آداب صحافت: جان محمد آزاد: ص ۱۰

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد یوسف ٹینگ

ٹینگ صاحب ۱۹۳۵ کو ضلع پلوامہ کے شوپیاں علاقے میں پیدا ہوئے۔ شوپیاں کے پاس ہی اہرہ بل کی آبشار ہے۔ اسرار کی اس طلسماتی دھند میں ایک حساس فن کار کی تہذیب کا غیر شعوری عمل لحظہ بہ لحظہ مکمل ہوتا رہا۔ سیلانیوں کی اس جنّت کے ساتھ اپنے لڑکپن کے ماہ وسال کا وہ اِن الفاظ میں ذکر کرتے ہیں 1۔

"اہرہ بل کی آبشار....... ایک دشوار گزار جنگل میں ساز فطرت کے نقرئی گھنگرو باندھ کر صدیوں سے کسی مست شباب کی طرح رقص کر رہی ہے۔ اس کی فسوں آمیز اور پر اسرار منظر بندی اس کے جادوئی حسن کا بنیادی زینہ ہے۔ تماشائی تخلیق فطرت کے اس ست رنگی تماشے میں کھو کر خود رنگ اور نور کے اس سمندر کا ایک قطرہ بن جاتا ہے۔"

ان کے اندر کا ادیب اور فن کار رنگوں کی اس برسات میں پوری طرح بھیگ گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ایام طالب علمی کے دوران آپ نے پنڈت نہرو اور خان عبدالغفار خان سے ملاقات کی۔ آپ ان ایام میں ینگ بوائز ایسوسی ایشن شوپیان کے صدر تھے لیکن تعلیم سے فراغت حاصل کرتے ہی آپ کے اندر کا وہ تخلیقی ساحر

ایک بار پھر بیدار ہوا تھا۔ اتفاق سے آپ کو ماہنامہ ''تعمیر'' کی ادارت کا کام تفویض کیا گیا اور اس طرح زبان برف سے شعلہ بیانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ تعمیر کے صفحات پر کچھ کمالات اور کرامات کو سخن کا ملبوس پہنایا گیا۔ یہ لہجہ نیا تھا، یہ آہنگ نئی تھی، یہ آواز نئی تھی۔ یہاں الفاظ کی خوشبوں میں گزرے ہوئے موسموں کی مہک تھی یہاں انداز اور اسلوب کی شادابیت کچھ اس طرح سے مسحور کر کے رکھ دیتی تھی کہ اختتام قاری کے لئے بلائے جان ثابت ہوتا تھا۔ زبان کو اپنے احساس کی شدت سے آپ نے جس طرح شہد کا چھتہ بنا دیا اس سے تعمیر ملک کے اعلاترین اردو جراید میں شمار ہونے لگا۔ ملک کے اطراف و اکناف کے صحافتی حلقوں میں آپ کی نگارشات کا اعتراف کیا جانے لگا۔

۱۹۶۱ء میں آپ کو ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر اننت ناگ تعنات کیا گیا۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ آپ اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر محکمہ اطلاعات کے سربراہ کے عہدے تک بہت قلیل عرصے میں پہنچ جائیں گے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ کلچرل اکیڈیمی کے ادبی جریدہ ''شیرازہ'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آپ نے مرحوم عبدلاحد آزاد کی معرکتہ الآرا کتاب ''کشمیری زبان اور شاعری'' کو شایان شان طریقے پر شائع کرایا۔ اس دفتر منتشر کی شیرازہ بندی دراصل آپ کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد آپ نے مرحوم ولی اللہ متو کی ''گل ریز'' کو مرتب کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی تحقیقی مضامین لکھے اور کئی نادر تاریخی نمونے بازیافت کئے۔

آپ ایک بالغ نظر محقق اور بے لاگ نقاد کی حیثیت سے ملک بھر میں معروف ہوئے۔ آپ نہ صرف اردو ادب پر اپنی گہری نظر کے ثبوت فراہم کرتے

رہے بلکہ آپ کی نگاہ کشمیری ادب پر بھی بہت دور تک ہے۔ ۱۹۷۳ء میں ٹینگ صاحب کو سکریٹری کلچرل اکیڈیمی کے عہدے پر متعین کیا گیا۔ شیرازہ کی اپنی طویل ادارت کے زمانے میں آپ نے اس رسالے کے بعض خاص نمبر ترتیب دیئے، جن سے برصغیر کے ادبی حلقوں کے صحرا میں تخلیق کی ایک شیتل اور گرج دار ندی بہہ نکلی۔ ان میں غالب نمبر، ثقافت نمبر، اقبال نمبر، مہجور نمبر وغیرہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس رسالے نے آپ کی تعمیری ادارت میں نئی منزلیں سر کیں۔ اس کا ارتقا ملک میں اردو ادب کی مجموعی پیش رفت کے لئے فال نیک ثابت ہوا، جس سے ہجوم تیرہ شبی میں نشان راہ متعین ہوتے رہے۔ شیرازہ نے ایک ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل کی لیکن اسے اتنی بلندی اور رفعتوں تک لے جانے کے پس منظر میں ٹینگ صاحب کی بے پناہ عرق ریزی تھی۔ پھر فن، تمدن اور زبانوں سے متعلق اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت میں بھی آپ نے بعض مستحسن اقدامات کئے جن سے ریاست میں ادبی سرگرمیوں میں ایک نئی روح اور ایک نئی وسعت پیدا ہونے لگی۔

اپریل ۱۹۷۵ء میں آپ کو ناظم اطلاعات مقرر کیا گیا۔ آپ نے تعمیر اور کشمیر ٹوڈے جیسے رسائل کا برسوں بعد پھر سے اجراء کیا۔ آپ کی نگرانی میں یہ ڈوبے ہوئے تارے ایک بار پھر پوری آب و تاب سے آسمان صحافت پہ چمکنے لگے۔ آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ خبر نامہ مکتوب بھی شروع کیا، جس میں سیاسیات کے علاوہ ادبی اور ثقافتی مضامین اور سرگرمیاں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ انتظامیہ میں اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آپ اپنے بنیادی فریضے سے اس دوران بھی غافل نہیں رہے۔ آپ کے تنقیدی اور تحقیقی جائزے ریاست اور بیرون ریاست کے معتبر

رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اس دوران آپ مرحوم شمیم احمد شمیم کے اخبار ''آئینہ'' کی ادارت میں بھی معاونت کرتے رہے۔ اس زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئے وہ یوں تحریر کرتے ہیں2:

''یکم مئی ۱۹۸۰ء کو صبح ساڑھے دس بجے سرینگر میں شاید اس صدی کے کشمیر کی سب سے حسرت ناک اور امکان شکن موت واقع ہوئی۔ اس روز شمیم احمد شمیم کے نفس کا شعلہ بجھ گیا۔ اس دہکنے والے انگارے کی گرمی اور روشنی کے واقف کاروں کو معلوم ہے کہ ان کے ساتھ کتنے طوفانی خواب اور کتنے کھلنے والے باب ختم ہو گئے۔ اپنے زمانے کے اس پرکشش گل فام کے اٹھ جانے سے شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا یا نہیں اس کی بات چھوڑ دیجئے۔ ہاں انیسوی صدی کے اواخر میں سرینگر میں اسی نوعیت کی ایک موت ہوئی تھی۔ واعظ یحییٰ شاہ کی جواں مرگی اتنی المناک رہی کہ اس کی جلن سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر دلوں میں آج بھی ایک ہوک اٹھاتی ہے۔ بہر حال میں شمیم کے ساتھ شام کو بیٹھ کر آئینہ کی ترتیب میں جٹا رہتا۔ لیکن تحریر کی خوشبو اس طرح آہستہ آہستہ کھلتی تھی کہ جب صبح کو اخبار طباعت کی بھٹی سے نکل کر میرے ہاتھوں میں آجاتا تو میں حیران رہ جاتا تھا۔ یہ بات سچی لگتی ہی نہ تھی کہ یہ اخبار ہمارے دور افتادہ شہر سے نکلتا ہے''۔

یہ بلاشبہ ایک جینیس کے جادو صفت قلم کا اعجاز ہوسکتا ہے۔ یہ اظہار کس قدر باریک بین ہے کس قدر تخیلی ہے اور کس قدر جامع ہے۔ آپ کے جتنے بھی اسالیب نثر دستیاب ہیں وہ محمد یوسف ٹینگ کے تخلیقی سسٹم سے گزر کر ہر رنگ کو اس کے پورے Spectrum میں دکھا دیتے ہیں۔ ''شناخت'' ایک ایسی ہی قوس قزح ہے جس

میں کشمیریات کے سارے رنگوں اور آہنگوں کو ان کی پوری صوتی گہرائی اور حسیاتی تجربے کی گرفت میں لے کر قاری کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس کراماتی اظہار میں وہ تعطر بھرا ہے کہ شاعری اس نثر پر قربان کی جا سکتی ہے۔

''شناخت'' محمد یوسف ٹینگ کے انیس تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا دو سو صفحات پر مشتمل مجموعہ ہے۔ مصنف کے یہ مضامین پچھلے پچیس برسوں کے دوران ریاست اور بیرون ریاست کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ہفت روزہ آئینہ کی ۷؍جون ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں مصنف کی شخصیت اور فن پر شمیم کی جو ناتمام سطور شائع کی گئیں تھیں۔ کتاب میں ان ہی چند سطور کو ''پیش لفظ'' کے طور شامل شاعت کرلیا گیا ہے۔ شناخت کے بیشتر مقالات کا تعلق کشمیر یا کشمیری ادب سے ہے۔ قرآن کا نسخہ فتح اللہ ہو یا علامہ اقبالؔ کی شاعری، محمد دین فوقؔ ہوں یا غنی کاشیری سب ہی موضوعات کا سنگم کشمیر اور کشمیریات سے مصنف کی بے پناہ دلچسپی ہے۔ مصنف کے قلم کا ویری ناگ چونکہ برسوں سے سنگلاخ اور بنجر دھرتی میں عرفان وآگہی کے گل لالہ کھلاتا رہا ہے۔ سو اس لحاظ سے یہ مجموعہ کشمیریات کا ایسا جلوہ صد رنگ ہے جسے مصنف کی تنقید، تحقیق اور تبصروں پر مشتمل شگفتہ تحریرات نے خیاباں خیاباں ارم بنا دیا ہے۔ مصنف کے چھوتے ہی لفظ گویا ہیروں کی طرح جگمگانے لگتے ہیں۔ فقرے جیسے آڑو اور سیب کی شاخوں کی طرح پھولوں سے ڈھک جاتے ہیں اور انداز بیان جیسے کونگ وٹن کے جنگلوں کی طرح گھنا پُر اسرار اور طلسم خانہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ قلب ونگاہ کے سامنے وسعت خیال تک ایک ایسی دھنک پھیلتی ہے جس کی روشنیوں میں قاری حیران و پریشان رہ جاتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے

وہ کچھ پڑھ نہیں رہا ہے۔ بلکہ ایک نثر نگار کی صناعی کا معجزہ دیکھ رہا ہے......

اس مجموعہ کے مضامین۔ سے واضح ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کی دلچسپیوں کا دائرہ کس قدر وسیع اور متنوع ہے۔ وہ بیک وقت مختلف علوم پر کس قدر عالمانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ادب اور تاریخ کے علاوہ عمرانیات، اساطیر، زبان شناسی، آثار قدیمہ اور صحافت کے موضوعات پر ان کی اہلیت بلاشبہ مستحسن ہے۔ مثلاً قرآنیات کی نادر دریافت جیسے مقالے میں مصنف کی تحقیقی وسعتوں کا پورا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں وہ ایک پختہ کار محقق کی طرح اپنی بالیدگی اور بصیرت کا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ایک مؤرخ ومحقق کی حیثیت سے آپ کی دریافتیں راسخ عقیدے کا عندیہ دیتی ہیں۔ آپ کے عرق ریزی آپ کو جس نتیجے یا تصور کی طرح گامزن کرتی ہے۔ وہ اس کا برملا طور اظہار اور اعتراف کرتے ہیں۔ حقائق پہ افسانوں کا ملمع چڑھانے کے قائل نظر نہیں آتے۔ آپ کے اسلوب کی یہی بے ساختگی آپ کو ایک منفرد حیثیت بخشتی ہے۔ وہ حق بات کو ڈنکے کی چوٹ کہنے میں یقین رکھتے ہیں اور لگی لپٹی سے احتراز کرتے ہیں۔ آپ کی تحریر کا یہ کھرا پن اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ زیر بحث موضوع کے قابل قبول مباحث کو ابھارا جائے۔ اس طرح کی راست بازی سے جو استدلال پیدا ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت کے سامنے الف لیلوی داستانوں کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے۔

ان مقالات کے مطالعہ سے تاثر ابھرتا ہے کہ مصنف کی زندگی قرطاس وقلم اور کتاب ومطالعہ کی زندگی ہے۔ آپ کا مطالعہ صرف اردو ادب تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ انگریزی، کشمیری اور فارسی ادب پر بھی آپ کی گہری نگاہ ہے۔ فارسی اور اردو

اشعار کے نگینوں سے اپنی نثر کی عبارتوں کو ایسے منقش کر کے رکھ دیتے ہیں جیسے یہ اشعار اسی موقع محل کی مناسبت سے ودیعت ہوئے ہوں۔ ایک طرف آپ کی فراست وبصیرت نما نثر اور دوسری طرف عظیم شعراء کی شعری سحر کاری گویا عبارت دو آتشہ ہو کے رہ جاتی ہے۔ ایسی معیاری اور معتبر نثر کو محمد یوسف ٹینگ کی دریافت سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔ اس کتاب پر ریاست اور بیرون ریاست کے مقتدر ناقدین نے اظہار خیال کر کے اس ذی شان نثری رجحان کی پذیرائی کی ہے۔ پروفیسر رحمان راہی اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں4:

''ادبی تنقید کے تعلق سے تو ٹینگ صاحب کا طلوع وظہور مسلسل اوج پذیر اور وسعت گیر رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں آفاقی شاعری کیا ہے؟ جاوید نامہ میں اقبالؒ کی ذہنی بغاوت اور کشمیری شاعری میں جدید رجحانات جیسے مقالات اس بات کا اعلان ہیں کہ ٹینگ صاحب کی ذات میں بالخصوص کشمیری شاعری کو ایک حساس اور جرأت مند پارکھ ملا ہے۔ شناخت کا مطالعہ اس کے مصنف کی کشمیری الاصل ذات کو قارئین کے سامنے آئینہ کی طرح پیش کرتا ہے۔ ہاں، ایک بات غبارِ خاطر بن جاتی ہے۔ ٹینگ صاحب اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں ہمیشہ توازن برقرار نہیں رکھ پاتے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی صحافی ذات ان کی ناقد شخصیت پر غالب آجاتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کے بعض مقالات کی سرخیاں اس قدر سنسنی خیز نہ ہوتیں نا ہی وہ اپنی ندرت کا خود اعلان کرتیں۔ ٹینگ صاحب استعاراتی بیان کے بڑے رسیا معلوم ہوتے ہیں۔ بسا اوقات یہ انہیں زیب بھی دیتا ہے لیکن کبھی کبھی یوں بھی

ہوتا ہے کہ وہ اپنے استعارے کو سہار نہیں پاتے۔ چنانچہ استعارہ بکھیر کر بیان کے بکھراؤ اور کبھی کبھی اس کی ژولیدگی کا سبب بنتا ہے''۔

عابد پشاوری5 اس مجموعے کو گلستان ادب قرار دینے کے بعد اس کے خاروں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

''کاتب حضرات کی مہربانیوں سے کس کو مفر ہے؟ اس مجموعے میں کاتب نے بیشتر جگہ اعراب وعطف واضافت لگا کر مصنف کی رسوائی کا اچھا خاصا سامان فراہم کردیا ہے۔ بے شمار اشعار نثر کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ چونکہ مصنف نے اشعار حافظے کی مدد سے نقل کئے ہیں ان میں کہیں کہیں نادانستہ تحریف ہوگئی ہے۔کم از کم ایک شعر جس میں لاکھوں برسوں کی حوریں.....غالب سے منسوب ہوگیا ہے۔حالانکہ یہ داغ کا شعر ہے''۔

نشاط انصاری نے بھی کتاب پر اپنے مخصوص انداز میں نقد ونظر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''شناخت کا صحیفہ ٹینگ کے اٹھارہ مضامین کا وہ سبد گل ہے جس کا ایک ایک سمن اپنی تحریرانہ بہار کی منہ بولتی تصویر ہے۔اس شناخت کی کتابت اگر چہ محمد صدیق ایسے نامور خوش نویس سے کروائی جاچکی ہے۔لیکن لگتا ہے کہ ان کی نستعلیق قلم وخط پر پیرانہ سالی نے اپنا سال خوردہ سایہ قبل از وقت ڈال دیا ہے۔جب ہی تو ایک ہی کتاب کی کتابت میں چار خط کے چار مختلف روپ نظر آتے ہیں۔اس کے شروع میں تتمہ تک املا، انشا اور کتابت کی لگ بھگ

پچاس غلطیاں کر کے وہ اپنی سہل انگاری پر گویا مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں"۔

تاہم یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ ان بکھرے ہوئے مقالات کی یہ شیرازہ بندی کشمیر میں اردو نثر کے ارتقاء میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اشاعت سے فاضل مصنف کی انفرادیت کا نقش بھی نمایاں ہو گیا ہے اور اہل کشمیر کو ان کے ادبی ورثے کی حسی بازگشت بھی سنائی دی ہے۔

---

1 شاعر کرشن چندر نمبر ص ۶۳۶

2 آدابِ صحافت: جان محمد آزاد ص ۱۱

3 ماہنامہ شیرازہ اگست ص ۷۸

4 شیرازہ نومبر ۱۹۸۹ء ص ۱۳۱

5 نشاط انصاری دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۷۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

بنسی نردوش

ان کا اصلی نام بنسی لال ولی ہے۔ لیکن انہوں نے دونوں لال اور ولی کو تیاگ کر ''نردوش'' پہ قناعت کیا ہے۔ بنسی نردوش بڈی یار سرینگر میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پنڈت شیام لال ولی تھا۔ جو ادبی حلقوں میں تیرتھ کاشمیری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ سرینگر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نردوش اخبار نیا زمانہ (جالندھر) کے حلقہ ادارت میں شامل رہے۔ یہ اخبار اپنے ترقی پسند نظریات کی وجہ سے خاصا معروف تھا۔ بعد میں آپ اخبار شیر پنجاب (امرتسر) اور خدمت (سرینگر) سے بھی وابستہ رہے۔ کشمیر کے صحافی حلقوں میں آپ نے اپنے زور قلم کی وجہ سے اپنی شناخت پیدا کی۔ امر سنگھ کالج سرینگر کے میگزین ''لالہ رخ'' کے کشمیری حصہ میں بشیر احمد بشیر آپ کی شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں1:

''انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ حضرت افسانہ تو کیا قلم کو سلیقے سے پکڑنے کا شعور نہیں رکھتے ہوں گے لیکن اسے کیا کیجئے کہ انہوں نے اپنے

قلم کی توانائی سے آج قلیل مدت میں ہی ادبی دنیا میں اپنا منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔ اگر کوئی صاحب ان سے پوچھ بھی بیٹھے کہ صاحب یہ فائٹر کی رفتار سے کہاں بھاگم بھاگ کررہے ہو۔ جاؤ پہلے کسی استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرو تو نردوش کوئی جواب نہیں دیتے اور عرش وفرش کی آواز سے بے نیاز برابر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے اقارب مین سوٹ بوٹ والے جنٹلمین بھی ہیں اور خاکی وردی والے چپراسی بھی۔ ہر شخص ان کے حسن سلوک کا معترف ہے......"

بنسی نردوش نے بھی اپنے دیگر متعدد ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح اردو میں لکھنا شروع کیا۔ آپ کے اس زمانے کے افسانوں میں "ترقی پسند تحریک" کا گہرا اثر موجود تھا۔ آپ کے یہاں افسانہ قدیم روایتوں سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کشمیر کے متوسط گھرانوں کی زندگی اور اس کے کرب کو ایک چابک دست فن کار کی حیثیت سے پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ آپ کے افسانوں کے مجموعے "تارسوت" کے بیشتر افسانے کشمیریت کے زندہ جاوید پیکر ہیں۔ ان میں عصری آگہی کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ شیرازہ کے جولائی ۱۹۶۲ء میں آپ کا افسانہ "سناٹا" ان ہی اقدار سے معمور ہے۔ اس میں انہوں نے انسانی وجود کی تہہ در تہہ سچائیوں کو اپنے تخلیقی انہماک سے نہایت معنی خیز بنادیا ہے۔ محی الدین اور اس کی بیوی ہاجرہ میں روزانہ ان بن رہتی ہے اور جھگڑے ہوتے۔ محی الدین ہاجرہ سے الفت کی وہی ترنگ پانے کا متلاشی تھا جو شادی سے پہلے تھی۔ لیکن محبت تو صرف

آزاد فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ جہاں قدم قدم پہ بندشیں ہوں وہاں محبت دب کر ازدواجی زندگی کا خون کر دیتی ہے۔ ہاجرہ کولہو کے بیل کی طرح سارا سارا دن گھر کا کام کرتی۔ ساس کی کڑوی باتیں اور شوہر کی تکرار بھی سنتی۔ صبح سے شام تک گھر میں نوکروں سے بدتر زندگی گزارتی۔ لیکن اس پر بھی محی الدین اس سے محبت کا عملی ثبوت مانگتا۔ مایکے بھاگ جاتی تو وہاں بھی قرار نہیں آتا تھا۔ زندگی کی کشمکش سے ہار کر آخر ایک دن وہ ابدی نیند سو جاتی ہے۔ محی الدین کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ خوشیاں اس سے روٹھ جاتی ہیں۔ آخر ایک دن جب اس کی دوسری شادی کی تیاریاں دیکھ کر محلے والوں کو اس کی ریاکاری کا یقین ہونے لگتا ہے۔ وہ ایک شام خاموشی سے اپنی آنکھیں موند لیتا ہے اور منوں مٹی تلے دفن ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں احتساب اور احتجاج کے عناصر سے فن کی نئی راہیں روشن ہوئی ہیں۔

''اجل'' 2 نردوش کی ایک اور کہانی ہے۔ یہ جنگل کے کمپارٹمنٹ میں کام کرنے والے مزدوروں اور آرہ کشوں کا افسانہ ہے جو ایک روز گھٹاؤں کے اندھیارے میں گھر جاتے ہیں۔ بادلوں کی کڑک سے آکاش اور پاتال لرز اٹھتے ہیں۔ مزدوروں کی ہاہاکار سے ہر سمت بھاگم بھاگ مچ جاتی ہے۔ مزدوروں سے کام لینے والے میٹھ سودہ کاک دوسرے مزدوروں کے ہمراہ اس جھونپڑی میں پناہ لیتا ہے جہاں ممدو کی ماں سب کے لئے کھانا پکاتی ہے۔ اس اندھکار میں سودہ کاک مزدوروں کو صلاح دیتا ہے کہ چونکہ اجل ان میں سے کسی ایک کے سر پر کھیل رہی ہے۔ اس لئے کسی سب لوگ ایک ایک کر کے جھونپڑی کے باہر جلے ہوئے پیڑ تک

جائیں جس کو مرنا ہوگا وہ اپنی باری پر مر جائے گا۔ باقی لوگ بچ جائیں گے۔ سبھی اپنی اپنی باری پر نکلتے ہیں اور واپس آتے ہیں۔ ممدو باہر جانے کے لئے تیار نہیں لیکن مزدور گھسیٹتے ہوئے اسے باہر دھکیل دیتے ہیں۔ اس کی بوڑھی ماں سینہ کوٹتی ہوئی اس کے پیچھے لپکتی ہے۔ اسی وقت بجلی چمکتی ہے اور جھونپڑی راکھ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کہانی پہ شمیم احمد شمیم کے تاثرات3:

''......بنسی نردوش کے ہر افسانے میں داستان کا رنگ ہے۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں داستان گو ہوتے اور ان کی تخلیقات کا داستان کا شرف پاتیں تو اسے ہم ان کی خوش قسمتی سمجھتے لیکن...... افسوس یہ ہے کہ وہ داستان گو بھی نہیں ہیں۔ وہ تاریکی میں تیر مارتے ہیں......''

ریڈیو سے اپنی سرگرم وابستگی کے طویل ماہ وسال کے دوران آپ نے متعدد ڈرامے لکھے۔ آپ کے کئی ایک ڈرامے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ''ایک رات کا مہمان4'' آپ کا ایک اچھا ڈرامہ ہے۔ یہ کمیونسٹ آمریت پر ایک گہرا طنز ہے۔ یہ ایک محبوب شاعر اور گمنام سپاہی کی بیوہ کا ڈرامہ ہے۔ اس عظیم شاعر کو محض امن اور دردمندی کے گیت گانے کی پاداش میں سنگینوں کے اندر بند کیا گیا۔ آپ کے انشائیے اور مضامین اعلیٰ درجے کی نگارشات ہوتی ہیں۔ میر غلام رسول نازکی کا سوانحی خاکہ نہایت سگفتہ اور شستہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ صادق صاحب کے کردار کا خاکہ بھی5 آپ کا وسیع معلومات اور نکھری ہوئی علمیت کا عکاس ہے۔ اس طویل مقالے میں جمہوری طرز فکر کے مشعل بردار کی زندگی کے بعض تاریک گوشوں پر پہلی

بار روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ آپ کے انداز بیان کی بے ساختگی کا اعجاز ہے کہ آپ کی نثر پڑھتے ہوئے ایک طلسم سا بندھ جاتا ہے۔ یہ طلسم فنی لحاظ سے مستحسن بھی ہے اور آپ کی فہم و فراست کا غماز بھی۔

---

1 لالہ رخ (دسمبر ۶۲) کشمیری حصہ صفحہ ۳۲

2 شیرازہ جنوری ۱۹۶۳ء

3 آئینہ تیسرا یادگار نمبر صفحہ ۶۰

4 انتخاب اردو ادب ۱۹۴۷-۱۹۷۱ء صفحہ ۳۲۶

صادق نمبر دو ماہی شیرازہ صفحہ ۵۶

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

غلام نبی خیال

متنوع صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ایک اچھے انشا پرداز کے علاوہ ایک خوش آہنگ شاعر اور ایک بے باک صحافی بھی ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد سبھی مقامی اردو ادیب جس رسالے میں اپنی نگارشات فخر کے ساتھ شائع کراتے تھے۔ اس رسالے ''کونگ پوش'' کے ۱۹۵۰ء کے زمانے میں وہ دو برسوں تک ایڈیٹر رہے۔ یہ ان کی ادبی صلاحیتوں کا ایک واضح اعتراف بھی تھا اور ناقدانہ فکر و نظر کی ایک کسوٹی بھی......! ان ہی ایام میں ان کے کئی افسانے ایک مقبول فلمی رسالے ''چترا'' میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں انہوں نے مرزا عارف کے اشتراک سے ادبی رسالہ ''گل ریز'' کی بازیافت کی۔ خیاؔل نے کشمیری میں اخبار (وطن) نکالنے کا بھی تجربہ کیا۔ لیکن اس کا متوقع خیر مقدم نہیں ہوسکا۔ اس کے بعد وہ ہفتہ وار ''محاذ'' کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ اس ہفتہ وار کا ان ہی کی باصلاحیت ادارت میں ''شیر کشمیر نمبر'' شائع ہوا۔ جو آج بھی اپنی ترتیب و تہذیب کے لئے معروف ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی رحلت پر انہوں نے ملک اور بیرونِ ملک کی ممتاز شخصیات کے تعزیتی پیغامات کے ایک مجموعے ''گلدستہ'' کی ترتیب و تدوین کی۔

اس کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''ستمبر ۱۹۸۲ء کے اوائل میں جب وادئ کشمیر کے جانثار دہقان خون اور پسینہ سے سینچی ہوئی دھان کی لہلہاتی بالیوں کو اپنے کھیتوں میں پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب خیابانوں اور گلستانوں کی روش روش سے فضا میں تحلیل ہونے والی رنگارنگ اور گوناگوں پھولوں کی مہک سارے ماحول کو عطر بیز بنا رہی تھی اور جب وسیع و عریض باغوں میں سرخ سیبوں سے لدی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں سرخوشی اور سرمستی میں جھوم رہی تھی تو وادئ کشمیر پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی......''

اس دوران وہ اپنے ادبی کاروان، اپنے ہم عصروں کے ہمران شانہ بہ شانہ جانب منزل رواں دواں رہے۔ اس کارواں کے دوش بدوش چلنے کے باوجود خیالؔ نے اپنے لئے نئی راہیں بھی تلاش کر لیں ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین آج کل، نگارش، تعمیر اور شیرازہ میں پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ کشمیری ادب پر ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ ''مخدوم محی الدین اور کشمیر1'' ''ارسطو اور فن شاعری2'' ''کشمیر زبان کی مثنویاں'' ان کے بعض اہم تحقیقی مطالعے ہیں۔ ان میں ان کی جدت اور فکر کی وسعت کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ بلبلؔ اور محمود گامیؔ کے فکر و فن پر انہوں نے کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے جو کتابیں ترتیب دیں ان میں خیالؔ کے سیر حاصل مقدمات ایک کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہ مقدمات تنقید سے زیادہ تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ بلبلؔ کے سام نامے کا فارسی سام ناموں کے پس منظر میں مطالعہ و موازنہ ان کی بے پناہ عرق ریزی کا غماز ہے۔

آپ نے کشمیری ادب پر اردو میں اپنے مضامین کا ایک مجموعہ ''ادبیات کشمیر ترتیب دے کر اسے خیابان کشمیر کے عنوان سے شائع کرایا جس عرق ریزی سے آپ نے کشمیریات کی مختلف جہتوں پر شستہ اور معیاری زبان میں اظہار خیال کیا ہے وہ بلاشبہ لایق تحسین ہے۔ خیال صاحب نے گزشتہ صدیوں کے دوران تخلیق ہونے والے کشمیری شعر و ادب کو اپنی دھڑکنوں میں بسا کر اس کے بعض درخشندہ ابواب کو اردو میں منتقل کرنے کی پیہم کوششیں بھی کی ہیں۔ اس طرح آپ نے کشمیری ادب کی ہر کروٹ کے نشانات صحرائے وقت پر نقش کئے ہیں۔ ان ترجموں کو دیکھ کر یہ خوشگوار انکشاف ہوتا ہے کہ غلام نبی خیال کے روپ میں دراصل ایک فرد نہیں بلکہ ایک اصطلاح ساز انجمن سرگرم عمل رہی ہے جس نے زبان و ادب کے خزینے میں گرانقدر اضافے کئے ہیں۔ آپ کی یہ عہد آفرین کوششیں نا قابل فراموش ہیں۔ ناچیز اس قدر بڑی شخصیت پہ اظہار خیال سے خود کو معذور محسوس کرتا ہے۔ بقول نظیری

کہ نو پروازم و شاخِ بلند آشیاں دارم

---

1 شیرازہ جلد ۱۴ شمارہ ۵،۶

2 تعمیر مارچ ۱۹۷۶ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

موتی لال ساقیؔ

موتی لال ساقیؔ ماہنور (رانگر) کے رہنے والے تھے۔ آپ کا جنم ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ آپ کے پتا جی کا نام پنڈت مدسودھن راز داں تھا۔ وہ پولیس محکمے میں سارجنٹ تھے۔ لیکن جب ان کا انتقال ہوا اس وقت موتی لال ساقیؔ صرف دو برس کے تھے۔ پنڈت تارا چند بسمل 1 ساقیؔ صاحب کے ماموں رہے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ ریڈیو کشمیر (سرینگر) سے منسلک ہوگئے۔ اس زمانے میں آپ کشمیری کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھتے رہے۔ آپ کے مضامین، تنقیدی جائزے اور تبصرے زیادہ تر خدمت کی خصوصی اشاعت میں پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ اس ابتدائی دور میں آپ کے بعض مضامین کے عنوان اس طرح ہیں2:

''تارا چند بسملؔ، صمد میر، کشمیری زبان و ادب، عبدالاحد آزادؔ، مہجورؔ اور ان کی شاعری کشمیری شاعری پر جاگیرداری کا اثر کشمیری زبان کا رسم خط ہماری کلاسیکی موسیقی وغیرہ......''

کشمیریات سے آپ کی دلچسپی برابر بڑھتی رہی۔ آپ اس محبوب

موضوع کے ہر رنگ اور ہر آہنگ پہ بلا تکان مضامین لکھتے رہے۔ آپ کا ہر مضمون موضوع سے آپ کی جنوں کی حد تک وابستگی اور بے پناہ عرق ریزی کا غماز ہوتا۔ اپنے مافی الضمیر کے زیادہ بہتر اور بھرپور اظہار کے لئے آپ نے ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں آپ کے اندر کا بے باک محقق بیدار ہوا تھا۔ آپ نے نئے چونکا دینے والے تحقیقی مضامین کے انبار لگا کر اپنی خداداد صلاحیتوں کالوہا منوایا۔

آپ نے متعدد شگفتہ اور دل آویز خاکے تحریر کئے ہیں۔ یہ خاکے دراصل ان شخصیات کے سوانح شخصی مرقعے ہیں ان میں متعلقہ شخصیات کے ساتھ ان کا ماحول ان کی معاشرت اور ان کے افکار ابھر کے سامنے آتے ہیں۔ غلام مصطفیٰ شاہ بخاریؔ جیسے گم نام شاعر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ آزادؔ صاحب کی نامکمل تحقیق میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں 3 نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر آزادؔ مرحوم کی رسائی شاہ صاحب کے اس کلام تک نہیں ہوسکی جو آج تک محفوظ ہے۔ یہ کلام عشق و محبت کا وہ اتھاہ سمندر ہے جس میں آج تک ہر کسی نے اپنی بساط کے مطابق دل کی صراحی کو بھر لینے کی سعی کی اور اپنے سینے کے زخموں کی آبیاری کی ہے۔ عشق کی یہ ترنگ مختلف روپ دھار لیتی ہے۔ کوئی اسے مجاز کی نظروں سے دیکھتا ہے اور کوئی عشق الٰہی کے سرمدی نغمے گا کر اپنے دل کو تسکین دیتا ہے۔

خاک کشمیر کے جیالے فرزند اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے متمنی محمد الدین فوقؔ پر لکھے ہوئے اپنے مضمون فوق اور تحریک حریت کشمیر میں رقم طراز ہیں۔

"فوق صاحب کو اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ انہوں نے ہمیشہ

ضمیر کی آواز کو مقدم جانا اور سچائی کا ساتھ دیا۔ ان کی تحریروں نے ریاست کے تعلیم یافتہ طبقے میں جذبہ آزادی کو ایک صحت مند سمت عطا کی۔ انہوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کا بیڑا عین جوانی میں اٹھایا تھا اور تادم حیات وہ اس بیداری کی لہر کو تیز سے تیز تر کرنے کے در پے رہے"۔

کامگار کشتواڑی کے متعلق اپنے سیر حاصل مضمون میں شخصیت نگاری کا یہ فن صاف جھلکتا ہے۔ لکھتے ہیں5:

"رساؔ جاودانی کے بعد کامگار صاحب بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ کشمیر صغیر کے گرد و نواح مین اب صاحب نظر لوگوں کا قافلہ سمٹتا نظر آ رہا ہے۔ رسا اور کامگار صاحب نے ایک روایت کے تسلسل کو بنائے رکھا تھا۔ لیکن آج ان لوگوں کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی ایک روایت مرگئی اور ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئی۔ پشتوں پہلے کامگار صاحب کے اجداد کشمیر کو چھوڑ کر کشتواڑ کی زعفران زار اور عطر آگیں وادی میں آباد ہو گئے تھے۔ مگران کے کشمیری طرز حیات میں سر مو فرق نہیں آیا تھا۔ وہی رکھ رکھاو وہی وضعداری، لہجے کی نرماہٹ کامگار صاحب کی شخصیت میں یہ سبھی چیزیں سمٹ کے آ گئی تھیں۔ ان کا گول گول چہرہ بات کرتے وقت ایسے کھل اٹھتا تھا جیسے گلاب یکا یک کھل اٹھے ہوں۔ سفید ڈاڑھی سر پر سفید رنگ کی پگڑی اور پھیرن پہنے کامگار صاحب کا نورانی چہرہ دیکھ کر فرشتے کا گماں ہوتا تھا......"

اس صنف میں آپ کے جو دیگر مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں رسا صاحب5، پریم چند7، سبھر امنیم8 توشخانی صاحب اور متعدد دیگر مضامین شامل ہیں۔

ساقی صاحب نے جس شعبے میں گزشتہ چوتھائی صدی سے ایک بے مثال قلمی جہاد کا آغاز کیا ہے وہ تحقیق کا شعبہ ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے آپ کی بصارت اور بصیرت قابل داد ہے۔ تاریخ کے دھندلکوں میں عقابی نگاہ ڈال کر حقیقت کو کھوج نکالنے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔ گم گشتہ ماضی کے صحراؤں میں آپ کے نقش پائے جستجو ایسے نخلستان ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

''کشمیر کی راجدھانیاں9'' ایک ایسا ہی تحقیقی مقالہ ہے جس کی حیثیت اب ایک معتبر دستاویز کی سی ہے۔ یہاں وہ سرینگر کے آباد ہونے سے پہلے اور بعد کی راجدھانیوں کا دلچسپ جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اس جائزے میں چندر پور، سرینگری داموودرسدا، پرہاس پورہ، جے پور، اونتی پور، اور بڈشاہ کی راجدھانی زینہ ڈب کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہیں۔ کشمیر میں مسلمان بادشاہوں کے سکے10 ایک دوسرا ایسا مضمون ہے۔ یہاں وہ شاہمری سلاطین کے سکوں کا پہلی بار مطالعہ کرتے ہیں۔ درانیوں کے سونے اور چاندی کے سکوں پر اپنے طویل بحث کے دوران آپ لکھتے ہیں۔ درانیوں کے وہ سکے جن پر ٹکسال کا نام کشمیر درج ہے۔ وہ سرینگر میں ڈھالے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۷۶۲ء کے بعد زمان شاہ نے بھی کشمیر میں چاندی اور تانبے کے سکے کافی تعداد میں ڈھالے تھے۔ خطہ کشمیر کی ٹکسال میں ڈھالی گئی مہر ۱۶۸/رتی وزن کی شاہ نورالدین کے نام پر جاری کی گئی۔ شاہ نورالدین کے نام کے سونے کا سکہ بھی یہاں ڈھالا گیا ہے۔ درانی دور کے اس واحد خوب صورت سکے کا وزن ۲۲۴/رتی تھا۔

مجسمہ سازی، موسیقی، مصوری اور فن تعمیر کے موضوعات پر بھی ساقی صاحب نے کام کیا ہے۔ آپ کا مضمون ''کانسی کے مجسمے 11، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مضمون سے ایک اقتباس:

''مجسمہ سازی۔ کے شعبے میں کشمیریوں کا اثر کشمیر ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ حسن کاری کی اس زوردار رو نے ہماچل پردیش سوات، لداخ اور تبت اور بعض صورتوں میں اس سے بھی آگے اپنے آپ کو پھیلا دیا۔ کانسی کے کشمیری مجسموں کو مورتیوں کے لطیف فن میں ایک الگ مرتبہ حاصل ہے جو فن کاری کشمیر کاری گروں نے پتھر اور دھاتوں میں دکھائی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل یہ کاریگری لکڑی کی تعمیرات میں بھی دکھائی گئی ہوگی''۔

چنار 12، پر اپنے مضمون میں آپ نے چنار کے ساتھ کشمیری محاورات اور لوک گیتوں کا دلچسپ امتزاج پیش کیا ہے۔ اسی طرح ''ہندوستانی تہذیب اور گوجر 13، لل واکھیہ اور اس کا پس منظر 14، کشمیر کا ماضی...... نئے گوشے 15، شادی بیاہ کے گیت، آزاد کے نام خطوط اور ریاست میں تاریخ نویسی کی روایت'' بعض ایسے مضامین ہیں جو آپ کے عمیق مشاہدے کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ کشمیری انسائیکلوپیڈیا کے فن تعمیر کے حصے کی ترتیب وتہذیب میں آپ کا بھی گرانقدر حصہ رہا ہے۔ اس معرکۃ الآرا تصنیف کے بیشتر حصہ کا اردو ترجمہ بھی شیرازہ میں مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ یہاں گم شدہ ماضی پہ چھایا کہرا چھٹ جاتا ہے اور فن تعمیر کے نادر نمونے تیز اور شفاف روشنی میں صاف نظر آتے ہیں۔

موتی لال ساقی برسہا برس ریاست اور بیرون ریاست کے معتبر رسائل میں اہم کتابوں پہ تبصرے بھی لکھتے رہے ہیں۔آپ کے نقد ونظر کا ادبی حلقوں میں احترام کیا جاتا ہے اور آپ کی آرا کو حرف آخر کی حیثیت دی جاتی ہے۔

آپ کے نقش ہائے رنگ رنگ کی اگر شیرازہ بندی کی جائے تو نیرنگیوں کا ایک سحر انگیز گلدستہ تیار ہوگا۔آپ کی ہلکی پھلکی مختصر اور سادہ تحریریں آپ کا غیر جذباتی علمی نثر کشمیریات کے ایک نئے دبستاں کی نوید ثابت ہوگا۔وہ اپنے باغ و بہار انداز میں اپنی ذہنی صلاحیتوں سے خط کشمیر کی علمی، ادبی اور ثقافتی مجلسوں کو گرمائے رکھتے رہے۔اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ان کی شگفتہ مزاجی اور حاضر جوابی ان کے حلقہ احباب کے لئے ہر بلند و پست میں ایک سہارا بنی رہی ہے 16۔

ہاں مگر اپنی فقیری میں غنی ہیں ہم لوگ

---

1 بسمل کا نثری سرمایہ ابھی بھی اندھیرے میں ہے۔بقول ساقی صاحب تحقیق کے تئیں ہمارا رویہ محققانہ نہیں بلکہ صحافانہ رہا ہے۔اس روئے کی وجہ سے نہ جانے کتنے تارا چند بسمل لاعلمی کے اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں۔المیہ یہ ہے کہ ایسی شخصیات کے پسماندگان بھی تعاون واشتراک سے احتراز کرتے ہیں۔(ج،م،ا)

2 کشمیر میں اردو: سروری

3 شیرازہ مئی ۶۵ صفحہ ۸۱

4 شیرازہ فوق نمبر

5 شیرازہ جولائی ۱۹۸۷ء

6 شیرازہ مئی ستمبر ۱۹۷۹ء صفحہ نمبر ۲۳

7 شیرازہ پریم چند نمبر

8 شیرازہ دسمبر ۱۹۸۲ء صفحہ نمبر ۷

9 ہمارا ادب جموں و کشمیر نمبر ۸۲، ۸۳ صفحہ نمبر ۴۲

10 ماہنامہ تعمیر جنوری ۱۹۸۲ صفحہ ۱۹

11 شیرازہ کشمیری عجابیات نمبر صفحہ ۲۱

12 شیرازہ کشمیری عجابیات نمبر صفحہ ۱۷

13 ماہنامہ شیرازہ جلد ۲۳ شمارہ ۶، ۷ صفحہ ۶۹

14 شیرازہ لل دید نمبر صفحہ ۵۶

15 تعمیر اپریل ۱۹۸۸ صفحہ ۷

16 ساقی صاحب گزشتہ سال داستان کہتے کہتے ابدی نیند سو گئے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
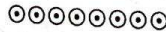
سید علی گیلانی

ماہنامہ ''طلوع'' کے ساتھ آپ کی ادبی زندگی کا طلوع ۱۹۶۹ء کے آس پاس ہوا تھا۔ اس ادبی رسالے کے شعاعیں اپنی بے داغ روشنیوں سے ظلمت کو اجالے میں تبدیل کرتی رہی ہیں۔ یہ تاریکیوں کے درمیان صلاح و فلاح کی تنہا کرن تھی۔ اس رسالے میں سید علی گیلانی کی تحریریں پہلی بار پڑھنے کو ملتی ہیں۔ تصنع سے پاک یہ بے ریا نگارشات اس بات کا عندیہ دیتی ہیں کہ ادب عافیت کوشی کی مدھم لوری نہیں ہے بلکہ صدائے احتجاج کی آواز بھی ہے۔ بعد کے برسوں میں بھی آپ اپنے عہد کی صلی روح کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی محسوسات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے رہے۔

''روداد قفس'' کے عنوان سے آپ کی خودنوشت سوانح کی جلد اول ۱۹۹۲ء میں شایع ہوئی۔ الہدیٰ پبلشنگ ہاوس کے زیر اہتمام ۱۹۹۳ء میں اس معرکتہ الآرا آپ بیتی کی دوسری جلد بھی زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آ گئی۔ سینکڑوں صفحات پر پھیلی یہ ضخیم کتاب گیلانی صاحب کی اسلام پسندانہ انقلابی شخصیت کا احاطہ

کرتی ہے۔ یہ آبلہ پائی کے سفر کا احوال ہے۔ یہ مجروح انا کا سفر ہے لیکن شب کے ملال کی بات محض ان کا ذاتی احوال بنکر نہیں رہتی واقعات مشینی انداز میں بیان نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان میں ایک آفاقیت سموئی نظر آتی ہے۔ اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں1:

''جیل کی تنگ وتاریک کوٹھری میں یہ جو یادوں کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ یہ جیل کی زندگی کا ایک غیر منفک جز ہے یہاں یادیں اکثر تازہ ہو جاتی ہیں۔ خوشگوار یادیں راحت وانبساط کا موجب بنتی ہیں اور تلخ یادیں تلخابہ زندگی میں اور زیادہ تلخی پیدا کر دیتی ہیں۔ دونوں قسم کی یادوں کے ساتھ خواہی نخواہی نبھانا پڑتا ہے۔ کیوں کہ جیل کی چار دیواری سے باہر آپ کو جب یادیں گھیر لیتی ہیں تو آپ محفل بدل دیتے ہیں۔ زماں ومکاں میں حسب منشاء تغیر پیدا کر دیتے ہیں مگر جیل کی زندگی میں ایک ہی علاج ہے کہ آپ کو اپنے مقاصد کا استحضار رہے......''

مصنف نے ذیلی سرخیوں سے حالات وواقعات بیان کرنے کی کوشش ہے۔ صرف پہلی جلد میں ایسی دوسو سے زائد سرخیاں ہیں اظہار کے وسائل پر خلاقانہ گرفت کے ساتھ ساتھ گیلانی صاحب کی انفرادی نثریت بھی اکثر جگہوں پر ابھر آتی ہے۔ مثلاً معاشرے میں ''صحافی کا مقام'' پر بحث کرتے ہوئے آپ یوں تحریر کرتے ہیں2:

''قلم کا مقابلہ قلم سے ہونا چاہئے۔ بندوق کے مقابلے قلم اور قلم کے مقابلے میں بندوق دونوں میں عدم توازن ہے اور کسی شے کا اپنے محل

وقوع کے خلاف استعمال ہونا ہی ظلم کہلاتا ہے اور اسی ناروا ظلم سے آج کی ساری دنیا بھر چکی ہے۔ ہمیں اس میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔"

اپنے لاک اپ کا مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میری دنیا پانچ قدم کی دنیا ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تھکاوٹ بھی آجاتی ہے اور گھومنے پھرنے کی عادی ٹانگیں سن بھی ہو جاتی ہیں۔ میں کھڑے ہو کر اس مختصر سی جگہ میں چلنے کی مشق کرتا ہوں۔ پانچ قدم چل کو رسوئی کی حد بندی آجاتی ہے۔ دو تین قدم اور گنجایش نکل سکتی ہے۔ مگر اس جگہ پر سڑے ہوئے کمبل ڈھیر کر کے رکھ دئے گئے ہیں مجبوراً پانچ قدم کے دایرے میں ہی آپ کو کولہو کے بیل کی طرح میلوں کی مسافت طے کرنا ہے۔ اندرونی حصے میں کہیں رونے چیخنے چلانے کہیں گالی گلوچ کہیں تڑاخ تڑاخ کی آوازیں آرہی ہیں۔ کہیں اونچی آواز سے سوالات کی بوچھاڑ اور کہیں دھیمی آواز میں لڑکھڑاتی زبان سے لرزتی صدائیں......"

آپ کا لہجہ خطابت شعریت اور ادبیت سے لبریز ہے۔ اشعار آپ کے اسلوب میں تحلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ سید علی گیلانی ایک باکمال خطیب و مقرر ضرور ہیں لیکن آپ کی اردو انشا میں اس درجہ کی تکملیت نہیں تاہم "روداد قفس" میں آپ نے جس انداز سے اپنے مشاہدات و تجربات الفاظ کے مرمر میں تراشے ہیں وہ اس بات کے عکاس ہیں کہ آپ کی تحریروں میں خطیبانہ جاذبیت کے علاوہ بلا کی روانی شوخی اور سحر آفرینی ہے۔

ہر ایک حرف کے ماتھے پہ خون جاری ہے
یہ لفظ کون سی کرب و بلا سے گزرے ہیں

---

1 رودادِ قفس جلد اول صفحہ ۴۴
2 رودادِ قفس جلد دوم صفحہ ۵۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مخمور حسین بدخشی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب اور محقق تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد ریاست کے ثقافتی نشاۃ الثانیہ کے دور میں انہوں نے کشمیر کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنے میں بے لوث کام کیا۔ مخمور حسین ایسے ہی ایک ادیب تھے۔ ڈاکٹر زور نے اس گم گشتہ فن کار کی صلاحیتوں کو پہچان لیا اور اس کی حوصلہ افزائی کے لئے ہمہ تن توجہ دی۔ خود بدخشی صاحب ڈاکٹر زور سے اپنی پہلی ملاقات کی یادیں تازہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں1:

"ڈاکٹر صاحب مجھ سے بحیثیت ایک استاد اور میں ان سے بحیثیت ایک شاگرد اس وقت ملا جب ستمبر ۱۹۶۱ء کو میں نے جموں و کشمیر یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ جب میں انٹرویو کے سلسلے میں ان کے پاس آیا تو وہ گاندھی ٹوپی اور شیروانی پہنے میز پر بازو لٹکائے طلبہ سے مختلف قسم کے سوالات کر رہے تھے۔۔ مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کبھی کچھ لکھا بھی ہے؟ "جی میں افسانے لکھتا ہوں"۔ "کہیں چھپ بھی گئے ہیں آپ؟" میں نے بعض رسائل کے نام بتائے۔ "آپ مجھے اپنی کہانیاں دکھا دیجئے" اور پھر

جب میں چند روز بعد انہیں کہانیاں دکھائیں تو دو ایک روز کے بعد مجھ سے یونیورسٹی ہی میں ملے اور کہا...... مخمور صاحب! میں نے آپ کی کہانیاں دیکھ لی ہیں۔اب آپ انہیں ترتیب دے دیجئے۔ کتاب کا عنوان مقرر کیجئے اور میں آپ کے مجموعے کو ''ادارہ ادبیات اردو'' سے چھاپ دوں گا''۔

اور یہی ہوا...... مخمور حسینؔ کے افسانوں کا یہ پہلا (اور غالباً آخری) مجموعہ ''نیل کنول مسکائے'' کے عنوان سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ مخمور حسین کے بیشتر افسانے اس بات کے غماز ہیں کہ انہیں کہانی بننے کا فن آتا ہے ان کا انداز بیان بھی نہایت دلچسپ اور دل نشین ہے۔ انہیں منظر نگاری کے فن میں بھی خاصی مہارت ہے اور وہ نہایت روانی سے مناظر کی سحر کاری کا ایک شاہکار نظروں کے سامنے لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانے ''وادیوں کی رانی 2'' سے ایک اقتباس:

''دیوار پر لگے کلاک نے رات کے گیارہ بجائے۔ وادی سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میرے کمرے کی کھڑکیوں پہ لگے شیشوں پر دھیمی دھیمی سی روشنی پڑی۔ میں نے ہولے سے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ دو آدمی پہاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے کے کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی۔ میں نے پہاڑی کی طرف دیکھا وہاں چراغ بدستور جل رہا تھا...... پھر خاموشی کی چیرتی ہوئی گولی کی صدا پہاڑی سے بلند ہوئی...... تب سے بہت دن بیت گئے۔ گلمرگ پر بہار آ گئی۔ بوڑھے چنار کی ٹہنیوں پر نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ جھرنے کے نیلے پانی میں نکھار آ گیا اور پورے تین ماہ بعد بوڑھے ہرکارے کا جوان بیٹا دلہا بن کر فاطمہ کو لانے جا رہا

تھا۔ دھرتی کا بیٹا وادی کی رانی کو لانے جا رہا تھا''۔

اکثر ناقدین نے ''انتظار، کاغذ کے پھول اور ہار جیت'' جیسے افسانے پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ مخمور حسین کے ان افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت کی روح ضرور جھلکتی ہے۔ لیکن اپنے خیالات میں ایک جامعیت لانے کے لئے انہوں نے کسی گہرے نفسیاتی فن کا سہارا نہیں ڈھونڈا۔ اگر وہ واقعات کو ان کے سطحی روپ کے علاوہ گہرے سماجی اور نفسیاتی پس منظر میں بھی دیکھتے تو ان کے فن کی تاثیر دو آتشہ ہو جاتی۔ لیکن ان کے بیشتر افسانوں میں سادگی اور زبان و بیان کا سکون آمیز انداز چھایا رہا۔ مخمور حسین کے ان افسانوں کی یہ مشترک قدر ہے کہ انہی ان کا کلایمکس افسانہ بننے نہیں دیتا۔ وہ اکثر نہایت بے نیازی سے افسانے کو ختم کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کہانی کا یہ کلایمکس خود کہانی کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ''انتظار'' کا اختتامیہ اس ناخوشگوار رجحان کا عکاس ہے۔ تاہم مخمور صاحب نے اس ارتقائی دور میں اپنی مفید ادبی سرگرمیوں سے اردو ادب کی جو خدمت کی اسے فراموش نہیں کیا سکتا۔ ان کے رومان پسند دل کی گہرائیوں سے مختلف کیفیتیں نکل نکل کر ان کے افسانوں کو رنگین بناتی رہیں اور زندگی کی اس ہلچل میں بھی جس کی گھٹن اور تاریکی کو افسانہ نگار نے اپنا موضوع بنایا۔

مخمور حسین نے لکھنا ترک کر دیا ہے۔ وہ اسلامیہ کالج، سرینگر میں پروفیسر رہے اور ادبی سرگرمیوں سے مسلسل بے تعلق ہو گئے ہیں۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

---

1 ڈاکٹر زور استاد کے روپ میں شیرازہ مئی ۱۹۶۳ء صفحہ نمبر ۴۹
2 تعمیر فروری ۱۹۵۷ء صفحہ نمبر ۴۵

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

تیج بہادر بھان

برصغیر میں آزادی کا داغ داغ اجالا طلوع ہونے کے بعد کشمیر کے ادبی ایوانوں کے چراغ بجھ گئے۔ ادبی فضا غیر یقنیت کی دبیز دُھند میں لپٹ گئی۔ ان گنت قاری گوش بر آواز تھے لیکن تعطل اور تغافل کی وقتی مصلحتوں میں آتش شوق جل کر راکھ ہوا لیکن پھر اس راکھ سے چند ایسے شرر پھوٹ پڑے جنہوں نے اپنے تغیر آشنا فن پاروں کی حدت سے خرمنِ دل میں ایک نئی آگ بھڑکا دی تیج بہادر بھان ایک ایسے ہی فن کار تھے۔

تیج بہادر ۱۹۳۱ء کے تاریخ ساز زمانے میں، سری نگر کے محلّہ حبہ کدل میں پیدا ہوئے۔ وہ لڑکپن سے ہی ایک عملی انسان بنے رہے ہیں چنانچہ پنجاب یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے ہگلی سے ایک تیکنیکی شعبے میں باقاعدہ مہارت حاصل کر لی اور پھر برسہا برس تک اسی شعبے سے وابستہ رہے۔

''سرمایہ دار کا خواب'' اور ''لال چنری'' ان کی ابتدائی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں ۱۹۵۱ء کے دور میں لکھی گئیں اس دور کی حقیقت نگاری میں معاشرتی مسایل کے علاوہ سیاسی مسائل کو بھی نمایاں دخل تھا۔ سیاست اس وقت زندگی کا بہت بڑا

حصہ بن چکی تھی۔ تیج بہادر بھی ان رجحانات سے انحراف نہ کر سکے چنانچہ ان کہانیوں میں بغاوت کا بانکپن صاف جھلکتا ہے۔ ان کے لب و لہجے میں خطابت سی نظر آتی ہے۔ ان میں کہانی نہیں بلکہ پروپگنڈا پیش کیا گیا ہے۔ گو یہ ابتدائی نقوش خیال اور فن کے لحاظ سے ناپختہ ہیں لیکن یہ وقت کے تقاضوں کا ردعمل تھا۔

تیج بہادر کا فن آہستہ آہستہ نکھرنے لگا۔ انہوں نے اپنے گردوپیش سے تعلق رکھنے والے افراد کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کے رگ وریشے میں ڈوب کر اور جذب ہو کر اپنے ذہن کو اس سے پوری طرح ہم آہنگ کیا۔ اپنی شخصیت کو پوری طرح اس میں ڈبو کر زندگی کے بے شمار بکھرے ہوئے موضوعات میں اپنے تخیل، تفکر اور احساس کی رنگ آمیزی کی اور اس طرح اس بے حد وسیع اور پیچ در پیچ دنیا میں سے اپنے لئے ایک علاحدہ دنیا بنالی۔ انہوں نے اپنی نرالی کہانی ''وانکہ پن'' سے لوگوں کو چونکا دیا1 یہ کہانی خواجہ احمد عباس کے رسالے ''سرگم'' میں شایع ہوئی تھی اور اس کے لئے افسانہ نگار کو انعام کا مستحق بھی قرار دیا گیا۔

تیج بہادر بھان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''جہلم کے سینے پر'' ۱۹۶۰ء کے آس پاس شایع ہوا۔ بیشتر افسانوں میں وہ متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ وہ ان افسانوں کی کمزوریوں کو بھی بیان کرتے ہیں اور ان کے محاسن کو بھی۔ اب ان کی کردار نگاری کا فن سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ جذباتی نہیں ہوتے توازن کو کہیں ہاتھ سے جانے دیتے۔ اب ان کے افسانوں میں اکثر مواد، اسلوب اور تیکنیک ہم آہنگ سے نظر آتے ہیں۔ وہ تحریر کا اپنا ایک خاص انداز اختراع کرتے ہیں اور اپنی تخلیقات میں گردوپیش کے

انتشار واضطراب کا ایک دل نشین عکس پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ''جہلم کے سینے پر'' افسانے کا یہ اقتباس:

''زونی کشتی کے کنارے بے بس دوہری پڑی تھی وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے...... کیوں ہو رہا ہے؟ صرف پیٹ کے نچلے حصے میں آگ سی دہک رہی تھی جو اسے بری طرح جلائے جا رہی تھی۔ وہ چپو سے سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بری طرح سما گیا تھا کہ چپو ہی اسے اذیت سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس کی انگلیاں چپو میں گھس جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن یہ آگ یہ تپش......''

جہلم کے کنارے شکستہ ڈونگوں کی الف لیلوی دنیا میں انسانی کیڑوں کی جو بڑی تعداد پیدا ہوتی ہے، پلتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ ان میں مردہ روحوں کے محور پر اس کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ یہ ایک حاملہ ہانجی عورت زونی کی کہانی ہے جس کا شوہر گھر میں چاول نہ ہونے کی وجہ سے شہر جا کر ٹھیکہ دار کو بجری پہنچانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کی کشتی جہلم کے سینے پر بڑھتی چلی جاتی ہے کہ زونی کو شدید دردِ زہ سے دوچار ہوتی ہے2۔

لیکن شدت کے اس درد کے باوجود وہ چپو چھوڑنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس صورت میں ان کی یہ بھاری کشتی، ان کا یہ آشیانہ کنارے سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ اس ساری پیچیدہ صورت حال کو افسانہ نگار نے چابک دستی سے الفاظ کے مرمر میں تراشا ہے۔

''عورت'' تیج بہادر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ پہلے مجموعے کی

اشاعت کے تین سال بعد شائع ہوا۔ اس میں مختصر مختصر سے کل آٹھ افسانے شامل ہیں۔ بیشتر افسانوں میں انسانی نفسیات کے کچھ ایسے پہلوؤں کو اپنے نوک قلم سے آشکار کیا گیا ہے۔ جو بہت کم نگاہوں کی زد میں آسکتے ہیں۔ اس مجموعے میں بعض ایسی کہانیاں بھی شامل ہیں جو اپنے موضوع اور اپنی دردمندی کے لحاظ سے سارے اردو ادب میں منفرد حیثیت کی حامل ہیں۔ کسی بھی فن کو جانچنے پرکھنے کے لئے عالمی پیمانے کے معیار پر اسے جاننے اور پرکھنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ فن Isolation کا قائل نہیں۔ اس معیار و میزان کی کسوٹی پر اگر تیج بہادر کے ان افسانوں کو پرکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ اپنے زبردست مشاہدے کے باوجود یہ تخلیقات افسانے کو اس بلندی پر نہیں پہنچا سکتیں جس پر وہ ابھی چند برس پہلے تک پردیسی اور در کی نگارشات میں پرواز کر رہا تھا۔ بہت کم افسانے ایسے ہیں جن میں پوری سطح اتنی اونچی ہو جتنی تقریباً ہر افسانے میں کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ لیکن مایوس ہونے کو اس لئے جی نہیں چاہتا کیونکہ ان کی جینیس غیر معمولی ہے۔ گو وہ اپنے بعض دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح زیادہ مقبول نہیں ہیں اردو ادب کے مجموعی خزانے کو مالامال کرنے کے باوجود وہ ایک غیر معروف افسانہ نگار ہیں۔ کیونکہ ان کے حقیقی مرتبے اور ان کے فن کے شاندار امکانات کا اعتراف بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔ ہمارے ممتاز محقق اور بالغ نظر نقاد محمد یوسف ٹینگ اس کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں 3۔

> ''تیج نہ تو بھڑکیلے پہناوے پہنتا ہے اور نہ اس کا فن بھڑکیلے انداز میں سامنے آتا ہے۔ اس میں ظاہری نمود و نمائش کے بہت کم اجزا شامل ہیں

اور اس خیرہ کن روشنی کے بھی جو بیک دم قاری کی نگاہوں کو چندھیا کر اس کی
توجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ سطحی داستانوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔
چونکا دینے والی تیکنیک سے بھی وہ دور ہے۔ اس نے صرف مکالموں کی تراش
خراش پر ہی موضوع کی صداقت اور اس کی اصلی روح کو بھینٹ نہیں چڑھایا
ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے فنکار کو اس وقت تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے تو وہ
کوئی زیادہ غیر متوقع امر نہیں ہے۔ مگر اس کی تمام خامیوں کے باوجود وہ ایک
ایسا فنکار ہے جو آج نہیں...... تو کل اردو دنیا سے اپنا لوہا منوا کے رہے گا......"

تیج بہادر کے افسانے "تلاش" میں مکھنا کا کردار جنگل کے نیم روشن سایوں
میں ڈوبتا ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ماں کو بچپن میں ہی جنگل نے نگل لیا تھا۔
باپ تو مکھنا کے پیدا ہونے سے پہلے ہی جنگل کا ہو چکا تھا۔ مکھنا اب جنگل کی قوتوں
سے تنہا ہی برسر پیکار تھا۔ اسے اب اس جنگل کا اکیلا ہی سامنا کرنا تھا۔ اس کو پچھاڑنا
تھا اور اس سے زندگی کے کچھ اور دن چھین لینے تھے۔ وہ جنگل کی وسعتوں میں اپنی
تنہائی کو گم کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جنگل کے پُر خار راستوں میں ذرا سی لغزش
مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ہر قدم پہ خونخوار جنگلی جانور کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مکھنا جب صبح
اپنا ریوڑ لے کر نکلتا ہے تو اس منظر کو افسانہ نگار نے ان الفاظ میں عکس ریز کیا ہے۔

"سورج طلوع ہو رہا تھا اور کرنیں چھوٹے سے درے میں پھیل
رہی تھیں۔ کرنیں پھیل رہی تھی اور مغرب کی طرح پیٹھ کئے پہاڑ بے نقاب ہو
رہا تھا۔ گھنا جنگل جو اب تک رات کی کالی چادر میں لپٹا ہوا تھا واضح ہونے
لگا۔ سیاہ لمبی لکیریں، سیاہ چھوٹی لکیریں بدھلو، کیل اور دیواروں کی صورت

اختیار کرنے لگے۔ دھوپ پھیلتی گئی اور دُھند کے بر فیلے مرغولوں کو چھیڑ نے لگی۔ دُھند کا مہین آنچل درخت کی چوٹیوں میں پھنس سا گیا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی گئی اور سائے واضح ہونے لگے۔ کہیں ہلکا ہرا رنگ کہیں گہرا ہرا رنگ دلوں میں ہریالی بھرنے کے لئے کافی تھی۔ ٹھنڈی ہوا بے قرار سی تھی اور پیڑ پودے رات کی لمبی خاموشی سے اکتا کر سرسرانے لگے۔ دھوپ پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئی......

ایسا لگتا ہے جیسے افسانہ نگار کہیں اور بلندیوں سے زندگی کا نظارا کر رہا ہے۔ لیکن افسانے کا آغاز جس طویل منظریہ بیان سے ہوا ہے۔ جدید افسانہ اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ اگر چھوٹتے ہی موضوع کو گرفت میں لیا جاتا تو افسانے کا تاثر زیادہ بہتر رہتا۔ ویسے تیج بہادر کے متعدد افسانوں میں چند جملوں میں ہی نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ سرکس گرل، قزاق، ڈیوڑھی، رشتہ اور عورت بعض ایسے افسانے ہیں جو قاری کی توجہ اپنی طرف فوراً کھینچ لیتے ہیں۔ بعض کے آغاز تو اتنے جاذب ہوتے ہیں کہ چلتے کا دامن پکڑ کر ٹھہرا لیں۔ مثلاً ان کے افسانے ''انداز ہ'' کا یہ ابتدائیہ:

''......وہ بہت دیر ایسے بیٹھا رہا جیسے بے جان برف کا تودہ ہو۔ نہ کوئی آہ اس کے بے حس بدن کو جھنجھوڑ سکی نہ کوئی سسکی اس کے ٹھٹھرتے وجود کو چیر سکی اور نہ ہی کوئی آنسو اس کے پگھلانے میں کامیاب ہوا......یقین نہ آتا تھا کہ خورشی اس کو اکیلا چھوڑ گئی ہے۔ پچیس برس کا لمبا ساتھ چھوڑ گئی ہے...... خورشی مر گئی تھی...... برف پگھل گئی اور وہ پانی کے حقیر قطرے کی طرح بے سہارا ہو گیا۔ اس کی چیخ پکار سے مسجد کا کونہ کونہ گونج اٹھا''

اسے ڈھلتی عمر میں باپ بننا نصیب ہوا تھا۔ اسی لئے وہ برف کی پروا کئے بغیر خورشی کو ہسپتال میں بھرتی کرانے کے لئے شہر آیا تھا۔ شہر پہنچتے ہی خورشی کی حالت خراب ہونے لگی۔ شام کے دھندلکوں میں اس نے مسجد کا سہارا لیا لیکن خورشی نے وہیں دم توڑ دیا۔ اب اس کی زندگی بے کار تھی۔ وہ خورشی کی لاش کو اپنی لوئی سے ڈھانپ کر برف باری کی رات میں خودکشی کرنے نکل پڑا لیکن سخت برف باری میں اسے دریا نہ مل رہا تھا لیکن ساری رات آنسوؤں کے کئی سیلابوں سے گزرنے کے بعد وہ صبح سویرے زندہ ہی مسجد کے دروازے پہ پہنچ گیا۔

"وہ گرتا پڑتا مسجد کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ خورشی اس کی لوئی میں لپٹی ویسے ہی پڑی تھی۔ اس نے لوئی ہٹائی۔ خورشی کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ لوئی کھینچ کر وہ خورشی سے دور ہٹ گیا۔ گوشے میں آ کر اس نے لوئی کو چاروں طرف سے اوڑھ لیا اور خورشی کی طرف ایک آخری معذرت آمیز نگاہ ڈال کر نیند کی آغوش میں لڑھکنے لگا......"

افسانہ اختتام پر آ کر اچانک مڑ جاتا ہے۔ یہ اختتام اتنا ڈرامائی، اتنا قدرتی اور اتنا چونکا دینے والا ہے کہ بے اختیار افسانہ نگار کی صناعی اور چابک دستی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ ڈرامائیت کھوکھلی نہیں ہے بلکہ یہاں حقیقت اور تخیل نہایت فن کاری سے ہم آغوش ہوئے ہیں۔ یہ تغیر دراصل افسانہ نگار کے بالیدہ نفسیاتی مطالعے کا عکاس ہے۔

"باپ، یہ ادارے یہ رجحان اور سلوٹ" تیج بہادر کے دیگر کئی اہم افسانے ہیں۔ وہ اپنے ان افسانوں میں بھی یہاں کے تمدن اور ثقافتی مسائل کو اپنی روح اور

تخیل میں تحلیل کر کے غیر معمولی تخلیقی فن پارے مرتب کرتے ہیں۔ لیکن جہلم اور جھیل ولر کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے لوگوں کا جس باریک بینی سے انہوں نے مطالعہ کیا ہے وہ ان ہی پر ختم ہے۔ اس موضوع پہ یہ ایک اتھارٹی کی طرح انہوں نے قلم اٹھایا ہے اور نتیجے کے طور پر ایک یادگار ناول تحریر کیا ہے۔

''سیلاب اور قطرے'' عنوان کا یہ ناول ساڑھے تین سو صفحات کا ضخیم ناول ہے۔ یہ اپنے موضوع اور اپنی تکنیک کے لحاظ سے بڑا دل کش ناول ہے۔ ناول میں ان کی نفسیاتی بصیرت اور کردار نگاری کے بارے میں ان کے بے پناہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک طرف ہمیں فن اور دوسری طرف زبان سے لوہا لینا پڑتا ہے۔ اہل زبان تو اس قدر بے مروت نکلے ہیں کہ انہوں نے بڑے بڑوں کا بھی لحاظ نہ کیا تو اس سلسلے میں ناول میں اکثر انشا اور املا کی غلطیاں ملتی ہیں۔ بعض جگہ زبان و بیان میں بھی جھول پیدا ہو گیا ہے۔ پروف کی غلطیاں بے شمار ہیں تیج بہادر نے ان کوتاہیوں پر زیادہ سنجیدگی سے غور نہیں کیا ورنہ ان کی تخلیقات کے چراغ بہت دیر تک اور بہت دور تک ادبی محاذ پر روشنی بکھیرتے۔

---

1 اردو افسانہ ڈاکٹر برج پریمی شیرازہ نوجوان نمبر صفحہ ۸۶

2 کشمیر میں اردو حصہ دوم صفحہ ۲۳۸

3 شیرازہ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۲۶

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

فاضلؔ کشمیری

آپ کا پورا نام غلام احمد فاضلؔ کاشمیری ہے۔ کشمیری کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ سرینگر کے نواحی علاقے میں پیدا ہوئے۔ ایس پی کالج سرینگر سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ ادبی ذوق کا مظاہرہ کالج کے زمانے میں ہی کیا چنانچہ معروف رسالے ''پرتاپ'' کے صفحات پر ہی ایک اردو انشا پرداز کی ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ کشمیری میں اپنے منفرد کلام سے مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں آپ کی کتاب ''تصویرِ حج'' شائع ہوئی۔ اس کتاب کو میر واعظ کشمیر مولوی محمد عتیق اللہ صاحب کی نظر ثانی کی شرف حاصل ہوا۔ یہ کتاب الفاظ و معانی کی ایک تصویرِ مجسم ہے۔ جو سلیس اور عام فہم اردو زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ تین سو صفحات پر پھیلی یہ ضخیم کتاب لگ بھگ ایک درجن ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں سفر نامہ حج طواف، عورت کا حج جنایات مملکت سعودی عرب دیارِ حبیب مسجد نبوی اور انوار محمدیؐ جیسے باب بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کو سبھی علما نے حج بیت اللہ سے متعلق معلومات، مسائل اور جغرافیہ کے بیان میں بے نظیر قرار دیا ہے۔ مناسک حج کے علاوہ یہ کتاب مقامات مقدس کی کیفیات کی بھی آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ کیجئے1:

''دل جدائی کی عمیق گہرائیوں اور وسیع خلیجوں پر نظر جمائے بیٹھا نظر آ رہا ہے۔ اپنی زندگی کا آفتاب افق کے قریب کی منزل پر گامزن ہوا دکھائی دے رہا تھا اور اپنی کم مائیگی کا پورا احساس ہو رہا تھا۔ دربارِ محمدیؐ کی زیارت کا دوبارہ موقع ملے نہ ملے۔ عمر وفا کرے نہ کرے۔ انہیں جذباتی کیفیات میں آنکھوں سے دل تک ساون کی جھڑی سی ہونے لگی اور اشکوں کی لڑیاں دربار محمدیؐ میں بکھر گئیں۔ آخر کلیجہ پر پتھر رکھ کر مسجد نبویؐ سے باہر نکلا''۔

''جہاز نے پرواز کی جدہ کا سارا شہر نظر آنے لگا۔ نیچے صحرا میں مدینہ منورہ کو جانے والی پختہ سڑک ایک لمبی لکیر سی نظر آ رہی تھی۔ سامنے حدِ نظر تک صحرا اور چٹیل زمینوں کے نشیب و فراز دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں پہاڑوں کی وادیاں اور دریاؤں کے خشک پھانٹ نظر آئے تھے۔ جن میں ہلتے ہوئے ریت کے ذرات بہتے ہوئے پانی کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ دور سے پہاڑوں کی اونچائیاں وسیع صحراؤں کے دامن پر بل کھاتی ہوئیں نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی''۔

یہ اس دل نشین نثر کے نمونے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی فی الوقع قابل دید اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ بلا شبہ یہ کتاب عازمین سفر محمود کے واسطے ایک رہبر کامل کا درجہ رکھتی ہے۔ گذشتہ تین عشروں کے دوران اگرچہ اس موضوع پر متعدد کتابچے شائع ہوئے ہیں لیکن تصویر حج اب بھی ان سب سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔

---

1 تصویر حج صفحہ ۱۰۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اکبر لداخی

سدا بہار برف پوش چوٹیوں کے اس پار لداخ کی سنگلاخ سرزمین سے اکبر لداخی جیسے گل لالہ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔اس گم گشتہ دنیا میں اکبر نے حصول آزادی کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک توانا لہر پیدا کردی تھی۔اکبر لداخی کا تعلق گو اس دور افتادہ شہر خموشاں کے معزز کوشک بکولا خاندان سے تھا تاہم یہ باثروت ماحول غیر معمولی تخلیقی قوّت کے مالک آپ کے اندر کے فن کار کے اظہار میں رکاوٹ ثابت نہ ہوسکا۔

آپ کے مضامین اور افسانے ترقی پسند تحریک کے ترجماں رسالے ''آزاد'' میں باقاعدگی سے شایع ہوتے رہے۔آپ کا ایک مضمون ''لداخ کے گیت'' اس رسالے کے ستمبر ۱۹۵۲ء کے شمارے کی زینت ہے۔اس طویل مضمون میں آپ کے طرز بیان کی شگفتگی آپ کی تخلیقی معنویت اور جاذبیت کا واضح اظہار کرتی ہے۔وہ لداخیات کے معلم اول کی طرح اردو قاری کو پہلی بار اپنی الف لیلوی کائنات سے اس طرح متعارف کراتا ہے[1]:

''تبت، چین، کشمیر اور گلگت کے گھیرے میں ہمالیہ کی بلند قامت شاخوں کے درمیان رقص ونغمہ کی وادی لداخ اپنے مخصوص وجداگانہ تہذیب و

تمدن کے پیش نظر کلا، ساز اور سنگیت کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے جھر جھر کرتے ہوئے ندی نالے اور پر شور دریاؤں کی موسیقی جھرنوں اور دریاؤں کا مدھر سنگیت عریاں پہاڑوں کے دامن میں گاؤں کے گھروندے اور ٹیڑھے میڑھے کھیت دور تک پھیلے نظر آتے ہیں۔ یہاں بسنے والے لوگ اپنے اقتصادی مشکلات اور غموں کو بھلانے کے لئے منجمد آرزؤں کی تسکین کے لئے یخ بستہ خواہشات کے اظہار کے لئے سنگیت اور رقص کی محفلوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں''۔

لداخ کے بیش بہا لوک گیتوں کے علاوہ آپ کے مضامین ہمیں لداخ کی تہذیب کی بعض بوالعجیوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ایسے دیہات کی سیر کراتے ہیں جہاں اگر بچے کا باپ مسلمان ہے تو ماں بدھ ہے۔ ماں مسلم ہے تو باپ بدھ ہے۔ ان علاقوں میں وہ ہمیں ایسے کرداروں سے ملاتے ہیں جن کا نام ''علی ٹشی وانگل'' ہے۔ دو بھائی جن میں سے ایک مسلمان ہوگا تو ایک بودھ۔ بودھ گنپہ مرمت طلب ہو تو مسلم بدھ مل کر اور اگر مسجد کی مرمت مطلوب ہو تو بدھ مسلم مل کر اس کی تجدید کریں گے۔ ان ہی خوبیوں کا حامل آپ کا افسانہ ''داغ'' بے حد مقبول ہوا۔ آپ بعض ادبی تخلیقات ''کونگ پوش'' میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ یہ تخلیقات لداخیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی آج بھی رہبری کر رہی ہیں۔

---

1 ماہنامہ ''آزاد'' ستمبر ۱۹۵۲

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

کامگار کشتواڑی

سفید دراز ریش کے پیچھے سرخ گلنار چہرے اور براق سفید طرحدار دستار پہنے خواجہ غلام رسول کامگار ریاست کے ادبی حلقوں میں برسہا برس تک مقبول رہے۔ کشتواڑ کے اطراف واکناف میں آپ کا احترام ایک بزرگ ترین ہستی کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ آپ ایک عالم دین تھے اور آپ کی بیشتر شعری ونثری تحریریں اسلامی موضوعات ہی کے گرد گھومتی ہیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور ذکر واذکار کا شغل بھی فرمایا کرتے تھے۔ شب کے آخری حصہ میں نماز تہجد کے لئے اٹھنا آپ کا معمول تھا۔ آپ کی ملازمت کا بیشتر حصہ ڈوگرہ دور حکومت میں گزرا۔ آپ نایب تحصیلدار کے عہدے پر رٹائر ہوئے۔ کامگار صاحب کو فارسی اور کشمیری کے علاوہ اردو زبان پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل تھی۔ آپ نے کئی گراں قدر کتابوں کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ جن میں علامہ اقبالؒ کی رموز بے خودی کے علاوہ وردالمریدین جیسے تراجم قابل ذکر ہیں۔

”حکایات اولیاء کشمیر، حکایات انبیائے کرام اور حکایات بادشاہان اسلام“ آپ کی قابل ذکر اردو تصانیف ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور دنیائے اسلام کی ممتاز شخصیات

پر یہ ایک عالم بے بدل کا عظیم دینی اور علمی کارنامہ ہے جس کو ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں کیا گیا ہے۔ اردو نثر میں ''چہل اسرار'' ایک اور ایسی تصنیف ہے۔ ''روشن ستارے'' کے مطالعہ سے بلا شبہ مردہ دلوں میں جان آ سکتی ہے۔ اس قادر الکلام ادیب کے ادبی مرتبے کے پیش نظر ۱۹۷۴ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انہیں خلعت فاخرہ سے نوازا۔ ایک ادیب کے علاوہ آپ ایک خطاط بھی تھے۔ آپ کی خطاطی کے شاہکار آج بھی بھدرواہ اور کشتواڑ کی جامع مسجدوں کی دیواروں پر آویزاں دکھائی دیتے ہیں۔ ارضِ کشتواڑ کے مایہ ناز فرزند اور پُر وقار شخصیت نے ایک سو سال کی عمر پا کر ۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ہری کرشن کول

ہری کرشن کول ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو اب گزشتہ کئی برسوں سے کشمیری، ہندی اور اردو میں نہایت سرگرمی سے لکھتے رہے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے پروفیسر ہیں اور اپنے ادبی مواد کو سچائی اور فنی دیانت داری سے برتتے ہیں۔ آپ اپنی تخلیقات میں غیر معمولی واقعات کی بجائے روزمرہ کے معمولی حقائق اور کرداروں پر اکتفا کرتے ہیں۔ تخیل کی جگہ حقیقت پسندی کی طرف اصرار کرتے ہیں۔ اپنے افسانے ''ارتھی'' (شیرازہ جلد ۱۷ / شمارہ ۱) میں آپ نے کشمیری مزاج بالخصوص نئی نسل کے رجحانات کے مختلف عناصر کا نہایت فن کارانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ چند ایسے نوجوانوں کا افسانہ ہے جو راہ راست سے دور گم گشتہ راہوں میں کھو گئے ہیں۔ یہ گمراہ نوجوان کشمیر کی تہذیبی قدروں کے کھوکھلے پن پر ہنستے ہیں۔ افسانے سے ایک اقتباس:

''اچانک اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ وہ اس وقت اکیلا انتم سنسکار کا ٹوکرا تھامے چل رہا تھا۔ نہ اسے ساتھ چلتا برہمن کہیں نظر آیا نہ ماں کی ارتھی اور نہ ہی ارتھی اٹھانے

والے......! بات کیا ہے۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے...... کچھ منٹ بعد اسے بہت دور سڑک کے آخری سرے پر ارتھی کی دھندلی چھاپ سی دکھائی دی اور اسے کچھ ہمت سی بندھی۔ ''تین گرے'' نزدیک پہنچ کر ٹارزن چلایا۔ برہمن کی چھاتی دھک سے رہ گئی۔ کیوں بے راکھشسو! کیا شو تین بار گرا؟ نہیں مہاراج...... تین وکٹ!''

یہ افسانہ ہمیں اس طرح کے نہ جانے کتنے بے سلسلہ منظر دکھاتا ہے اور ہر منظر میں آرزوؤں کے زخم سسکتے ہیں۔ تمناؤں کے خواب ریزہ ریزہ نظر آتے ہیں اور رسم ورواج کی بندشوں کی ارتھی نظر آتی ہے۔ افسانے کے کردار جیتے جاگتے ہیں۔ ان کے مختصر اور معنی خیز مکالمے ان کی شکست خوردگی اور آوارگی کی ساری تفسیر بے نقاب کر دیتے ہیں۔

''رادھا کے گھر آئے شام'' مارچ ۱۹۶۵ء کے شیرازہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی نفسیاتی فن صحیح اعتدال اور گہری تاثیر کے ساتھ برتا گیا ہے۔ آپ کا اسلوب نہایت سیدھا سادھا اور معصوم ہے۔ دلی کی برق رفتار زندگی میں ایک اجنبی...... اپنی محبوبہ کے گھر کو تلاشتا ہوا۔ لیکن اس کے گھر والوں سے مل کر اس کی اجنبیت بجائے کم ہونے کے بڑھ جاتی ہے۔ اس کی محبوبہ اس کی سادہ لوحی پر اس سے ناراض ہو جاتی ہے اور وہ آخر اس غیر مانوس ماحول سے فرار حاصل کرتا ہے۔

''ٹوپی'' ہری کرشن کول کا ایک اور افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بھی شیرازہ میں ہی شائع ہوا ہے۔ یہاں بھی ان کے فن کی بنیاد سچائی اور سادگی پر ہے۔ ہردے ناتھ کو اپنی بیوی کی مرضی کے خلاف بھیانک برف باری میں اپنی چاچی کے لئے سنترے لانے پڑتے

ہیں کیونکہ اس کی چاچی نے شادی کے وقت آٹھ سو روپے میں اس کی لاج رہن رکھی ہوئی ہے۔ ہردے ناتھ کی بیوی اس بات سے بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اپنی عزت بچانے کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا ہے۔

گو ان کہانیوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان کے موضوعات کافی فرسودہ ہیں۔ ان کے Treatment میں بھی کسی جدت کا اہتمام نہیں ہے تاہم ان کے کردار بڑی حد تک قابل قبول ہیں لیکن ان کی سادگی اور معصومیت انہیں اچھی کہانی بننے سے روک دیتی ہے۔ ان میں کوئی فنی پیچیدگی نہیں ہے۔ زبان و بیان کا سکون آمیز انداز بھی کہیں کہیں قاری کو اکتا دینے لگتا ہے۔ ''دھرم کتھا اور داؤ'' مندرجہ بالا افسانے سے بہتر کہانیاں ہیں۔ یہاں ایک بار پھر ''ارتھی'' اور ''کتے کی دم'' کی سی خود اعتمادی نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ ''دھرم کتھا'' کی تکنیک اچھوتی ہے۔ اس میں تخلیق کی روح سے زیادہ ترتیب کا سلیقہ نظر آتا ہے۔ ''داؤ'' دو دوستوں کا افسانہ ہے جو طویل مدت بعد لال چوک میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ دونوں چاہتے ہیں کہ وہ کسی قریبی ہوٹل میں گھس کر چائے پہ لیں اور ادب و فن پر خوب باتیں کریں لیکن دونوں اپنی جیب کے دو روپوں کو آئندہ کے خیال سے صرف کرنا نہیں چاہتے۔ آخر دریا کے کنارے آ کر تاریخ ادب اور فلسفہ پہ خوب بحث کرتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ دونوں تاش کے پتوں پر اپنے روپوں کی بازی لگاتے ہیں اور ہارتے ہیں۔

اس کہانی میں زندگی کی تلخیاں، محرومیاں اور نامرادیاں صاف دیکھی جاسکتی ہیں۔ گو نادار لوگوں کی زندگی ان ہی محرومیوں سے عبارت ہے تاہم یہ چیزیں اس زندگی کا حسن مسخ نہیں کر سکتیں۔ دراصل ہری کرشن کول اپنے افسانوں میں کسی

نظریہ یا اصول کی تبلیغ نہیں کرتا۔ وہ مسائل کا سادگی اور معصومیت سے جائزہ لیتا ہے۔ پیچیدگیوں میں الجھے بغیر وہ گردوپیش کے معمولی واقعات اور کرداروں کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذہن کے تہہ خانوں میں جھانکتا ہے اور اپنی تخلیقی قوت کی مشعل روشن کر کے شخصیت کے پاتال میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے اس عمیق سفر کا ماحصل وہ کردار ہیں جو روشن ہیں اور زندہ جاوید ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

نور شاہ

نور شاہ ڈل گیٹ (سرینگر) میں ۹ جولائی ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ محکمہ تعلیم کے مشیر کے دفتر سے وابستہ ہوگئے۔ بعد میں آپ دیہات سدھار کے محکمے میں ٹرانسفر ہوئے۔ یہاں آپ نے رسالہ ''دیہات سدھار'' کی ادارت کئی برسوں تک کی۔ ۱۹۵۹ء کے ہمارا ادب میں جب ریاست کے ادیبوں اور شاعروں کی سال کی بہترین تخلیقات اور معیاری نگارشات کا پہلا انتخاب شائع ہوا تو اس میں آپ کا افسانہ ''گلاب کا پھول'' شامل اشاعت کیا گیا۔ اس انتخاب کے ترتیب کار پروفیسر حامدی کشمیری مجموعے کے حرف اول میں ''نور شاہ'' کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں1:

''''بے گھاٹ کی ناؤ'' کا خالق نور شاہ نقلی نسوانی لبادے اتار کر، اب اصلی صورت میں ہمارے سامنے آرہا ہے اور ہماری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہا ہے''۔

پروفیسر عبدالقادر سروری2 اس اسرار سے پردہ ہٹاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ نور شاہ پہلے ''شاہدہ شیریں'' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ اس فرضی نام کو اختیار

کرنے کا سبب وہ ایڈیٹر حضرات کی عجیب نفسیاتی افتاد بتاتے ہیں۔ چنانچہ پہلے جب وہ اپنے نام سے رسالوں کے لئے افسانے بھیجتے تھے تو ایڈیٹر حضرات انہیں لوٹا دیتے تھے۔ لیکن بعد میں ان کے یہی افسانے شاہدہ شیرین کے نام سے نہایت عزت کے ساتھ شائع کئے جانے لگے۔

اپنے ادبی سفر کے ابتدائی دور میں ہی نور شاہ نے ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک تخلیقی ساحر ہیں۔ ان کے یہاں شاعری اور فکشن کی سرحدیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ کشمیر کی سحر انگیز سرزمین کے سب سے بہترین نقاش اور مصور تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں اس حسین وادی کے دل فریب مناظر اپنی پوری بے تکلفی اور رعنائیوں کے ساتھ نظر آنے لگے۔ وہ اپنے تمام ہم عصروں میں سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کے افسانے ریاست سے باہر برصغیر کے مقبول ترین رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں "بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، ایک رات کی ملکہ، من کا آنگن، اداس اداس اور یہ میری دنیا شامل ہیں۔ ابتدائی دور میں آپ کا فن رومانیت کی طرف مائل رہا ہے۔ آپ رومان کے تانے بانے سے ایک فضا قائم کرتے ہیں۔ جس میں کبھی کبھی کردار الف لیلوی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن الیلی طرز تحریر کے نقش ہر کہیں نمایاں ہیں۔

نور شاہ کی توانا تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ وہ ایک طلسماتی اور لفظیاتی فضا تخلیق کر کے ہمارے سامنے رنگوں اور تصویروں کا ایک البم پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک لازوال مصور کی طرح بے زبانی کو زبان دینے کی کوشش

کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ایک ایسی نثر پیدا ہوتی ہے جو لغت اور گرائمر کی روایات کی حدیں بھی پھلانگتی نظر آتی ہے۔ ایک اقتباس آپ کی کہانی ''پمپوش'' سے 3:

''یہ میرا ڈل ہے۔ برف پوش پہاڑوں کی گود میں اپنی گہری وسعتیں لئے ڈل جھیل۔ اس کی سیمیں سطح پر سرکتے ہوئے کنول ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے نیلگوں آسماں پہ تاروں کا کارواں محوِ سفر ہو اور شفق کی لالی میں کنول کے پتوں پر بکھرے ہوئے پانی کے لرزاں قطرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس انجانے دیش کے ان دیکھے شہزادے نے زمرد کے کچے موتی پکنے کو رکھ دئے ہوں''۔

آپ کی اکثر کہانیوں میں گزرے ہوئے موسموں کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہاں زبان برف سے شعلہ بیانی ہوتی ہے۔ بادام بدن حسیناؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ سکوت برف شبی میں ایسے باک اور جذباتی منظر دکھائی دیتے ہیں کہ روح کی گہرائیوں میں کہرام سا مچ جاتا ہے۔ لیکن یہ شاعرانہ اسلوب، یہ رومانیت کہیں بھی انسان کے مادی مسائل، اس کے زمینی رشتوں اور انسانوں کے مابین تعلقات کی نوعیت سے غافل نہیں رہتی۔ نور شاہ کی کہانیوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیگر چیزوں کے علاوہ آج کے مجبور انسان کے روحانی بحران کو بھی اپنے ساتھ لئے چلتی ہے۔

۱۹۷۱ء میں نیلی جھیل کالے سائے اور پائل کے زخم کے بعد آپ کا ایک اور ناول ''آؤ سو جائیں'' شائع ہوا۔ اس ناولٹ کو شاعر کے یادگار ناولٹ نمبر میں شامل کیا گیا۔ ''آؤ سو جائیں 4'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے وہیں یہ ایک یُگ کی

بھی کہانی ہے۔ اس ناولٹ میں بھی آپ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔ اس سے قبل آپ کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''گیلے پتھروں کی مہک'' بھی شائع ہوا۔ آپ نے ۱۹۷۳ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے لئے ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۱ء تک کشمیر میں تخلیق کئے گئے اردو ادب کا ایک جائزہ بھی پیش کیا۔ یہ پچیس سالہ انتخاب ریاست میں اردو ادب کے آئندہ امکانات کو ابھارنے اور اس مرتبہ کی تخلیقات پیدا کرنے کا محرک ثابت ہوا جو ہر معیار سے اردو کے ادب عالیہ کا حصہ تسلیم کی جاسکیں۔ نور شاہ کے بارے میں قدسیہ محی الدین کی وہ آرا آج بھی صادق آتی ہے[5]: ''میرا خیال ہے کہ نور شاہ کو کہانیوں نہیں لکھنی چاہئے بلکہ نور شاہ پہ کہانیاں لکھنی جانی چاہئے۔ کیونکہ وہ بذات خود ایک کردار ہیں...... ایک عجیب اور انوکھا کردار......!

---

1 ہمارا ادب ۱۹۵۹ء مرتبہ حامدی کاشمیری صفحہ نمبر ۱۳
2 کشمیر میں اردو عبدالقادر سروری صفحہ نمبر ۲۲۳
3 ماہنامہ بیسوی صدی سالنامہ ۱۹۶۶ء صفحہ نمبر ۱۱۱
4 شاعر ناولٹ نمبر ۱۹۷۱ء صفحہ نمبر ۴۱۴
5 شاہد ہے تیری آرزو: علی محمد لون: بیک ٹائیٹل

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

چونی لال ترسل

کشمیر میں اردو فکشن کے تخلیقی فن کاروں کا جائزہ لینے کے دوران بعض ایسے غیر مانوس نام بھی سامنے آتے ہیں جن کی تخلیقات کے چراغ گو دھندلے دھندلے سے ہیں لیکن زبان و ادب کے ارتقا میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں یا جاسکتا چونی لال ترسل ایک ایسے ہی فنکار ہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب اردو ناول کی طرف بہت کم توجہ دی جارہی تھی آپ نے اپنا ناول تحریر کیا۔ آپ کا ناول ترقی پسند ادیبوں کے ترجمان رسالے ''آزاد'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ یہ ناول ''خزاں'' تھا اور اس کا پہلا باب فروری ۱۹۵۳ء کے آزاد میں شائع ہوا۔ اس زمانے کی روایات کے مطابق ترسل کے اس ناول کا آغاز ایک طویل منظر یہ بیان سے یوں ہوتا ہے:

''پت جھڑ کا موسم تھا۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں میں سے سلگتا ہوا سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ بکھرے ہوئے پژمردہ پتے زمین پہ ہلتے ہلتے ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ ہوا میں رقص کرتے ہوئے دور جا کر دھول میں مل جاتے تھے۔ گاؤں کے نیم برہنہ بچے اور عورتیں سوکھے ہوئے پتوں کی راکھ جمع

کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں سوکھے پتوں کے ڈھیر شعلے بن کر چنگاریاں اڑا رہے تھے۔ ہر سال بٹہ گنڈ کے پرانے گاؤں میں ندی کے پل پار جہاں سے گاؤں کی سڑک شروع ہو جاتی ہے سڑک کے حاشیوں پر ایستادہ درختوں کے نیچے اور آس پاس کے میدانوں میں بکھرے ہوئے خزاں زدہ پتوں کو جمع کر کے ان سے راکھ بنائی جاتی تھی......"

ہماری دیہی زندگی کی شکستگی کی یہ ایک عینی تصویر ہے۔ پورے ناول میں دیہاتی مسائل عکس ریز ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی بوسیدہ رسم و رواج کی بندشیں اور آرزوؤں کے زخم ہر موڑ پہ ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ ترسل کا یہ انداز ان کی یہ فضا آفرینی اور ان کے کردار ہم عصر ادیبوں سے الگ اور جداگانہ ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار قدوس کلائمکس میں آٹھ سال کے بعد اپنے گاؤں لوٹتا ہے۔ پنجاب کے میدانی علاقوں میں وہ اپنی زندگی کے آٹھ بہترین سال مزدوری کرنے میں گنوا دیتا ہے تاکہ اپنے بھائی صادق اور اپنے بچوں صدیقہ اور کمال کے کل کو تابناک بنا سکے۔ افلاس کی ان تاریکیوں اور گھٹن کے ان ماہ و سال کو ترسل کی تحریروں نے زندہ کر کے رکھ دیا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد زمان آزردہ

مرزا محمد زمان آزردہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو سرینگر میں پید ہوئے۔ کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں مرزا سلامت علی دبیر کی حیات اور افکار پر اپنا تحقیقی پروجیکٹ مکمل کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مرزا دبیرؔ پر اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں زماںؔ صاحب متعدد بار لکھنو آتے جاتے رہے اور یہاں کے مقتدر ارباب سخن سے ادبی اور تحقیقی مسائل پر باہمی تبادلہ خیال کرتے رہے۔ دراصل وہ سو فیصد پکی شہادت کے بغیر کوئی بات تسلیم نہیں کرتے۔ تحقیق میں صحت وقطعیت کا ہی اعجاز تھا کہ جب یہ تحقیقی کام شائع ہوکر منظر عام پر آیا تو ملک کے اطراف میں ادبی حلقوں نے اسے تلاش و تحقیق کا ایک منفرد کارنامہ قرار دیا۔ چنانچہ اس کتاب پر زماں صاحب کو اتر پردیش، آندھرا اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے ایوارڈ عطا کئے۔

تحقیق کے صحرا میں گل لالہ تلاشنے کے دوران آپ نے تخلیق کے کئی پڑاؤ بھی طے کئے۔ ''غبار خیال'' اس منزل کا پہلا سنگ میل تھا۔ انشائیوں کا یہ مجموعہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی رسم اجراء پر ممتاز نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمان نے

کہا تھا ''اس کتاب کے مصنف نے اپنی سوچ اور اپنے ذہن کے ساتھ اسلوب کے ہر منزل کی تراش خراش کی ہے'' دراصل یہ کتاب ایک ''اوریجنل'' تخلیق کار کے فکرو فن کا ابتدائی میزان ہے جس میں جگہ جگہ چھبتے ہوئے طنز اس بات کا گویا عندیہ ہیں کہ ایک زیرک اور بے ریا کردار ادب کی محفل میں وارد ہو رہا ہے۔

''شیرین کے خطوط'' آپ کے دوسری تخلیق تھی جو دسمبر ۱۹۷۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۶۲ء کے دوران میں ایک ہیلتھ اسکیم کے تحت حاجن سنٹر میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا شوق بے پناہ تھا۔ وہاں وقت بھی کافی ملتا تھا۔ ایک ناول لکھنے لگا۔ کوئی ڈیڑھ سو صفحات اس کے مکمل ہو چکے تھے کہ ایک دن اس سنٹر کے انچارج ڈاکٹر نے میرے اس مسودے کو دیکھا۔ ظاہر ہے سترہ برس کی عمر میں میرا مطالعہ محدود رہا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے ناول کی تعریف کی مگر ایک مخلصانہ مشورہ بھی دیا کہ اگر میں اپنے خیالات کا صحیح اظہار چاہتا ہوں تو مجھے خط لکھنے چاہئے۔ چنانچہ ایک خواہش پیدا ہوئی کہ خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی جائے۔ ویسے خط لکھنے کا موقع مجھے اس وقت سے ملا تھا جب میں صرف آٹھ برس کا تھا۔ والد صاحب ریاست سے باہر رہا کرتے تھے۔ میں گھر میں بڑا لڑکا تھا۔ میرے بڑے بھائی کا انتقال ۳۵ سال پہلے امرتسر میں ہو چکا تھا ار میرے تولد کے وقت والد صاحب کی عمر ۶۵ برس تھی۔ میں باقاعدگی سے والد کے خطوط کا جواب دیتا، اپنی والدہ کو پڑھ کے سناتا۔ میں ہر بات بے تکلفی سے لکھ دیتا تھا۔ پھر ہوتے ہوئے ۱۹۷۱ء، میں

روزنامہ چنار کے سنڈے ایڈیشن میں میرے مکتوب ''خطوط غم'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔لوگ اسے پسند کرنے لگے......''

بعض ناقدین نے ''شیریں کے خطوط'' کا رابطہ قاضی عبدالغفار کی کتاب ''لیلیٰ کے خطوط'' سے جوڑا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ لیلیٰ کے خطوط کے برعکس شیریں صاحبہ کے خطوط ناول نہیں یہ نیم افسانوی ''انشائیہ نما مکاتیب، یا مکتوب نما انشائیے'' ہیں ان میں رومانوی رنگ بھی ہے اور ترقی پسندانہ بھی۔ دراصل جیسا کہ مصنف نے خود بھی کہا ہے ان خطوط کو مولانا آزاد کی ''غبار خاطر'' شوکت تھانوی کی ''بار خاطر'' یا اس قبیل کی کسی اور تصنیف سے ملانا بے کار ہوگا۔ ان کا مقصد قطعی مختلف ہے ان خطوط میں ہماری سماجی اور معاشی الجھنوں کا بے باک اظہار ہے۔آپ نے جو کچھ بھی کہنا چاہے شگفتہ اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔آپ نے نہایت اختصار سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ ہر خط ابن آدم کے خلوت و جلوت کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ اسی دوران ۱۹۷۵ء میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''اور وہ ٹاپ کر گئی'' شائع ہوا۔ یہاں جدید سوسائٹی کے مستور اسرار صفحہ قرطاس پر منتقل ہو گئے تھے۔

اب صحرا کے مسافر کا نخلستان آ گیا تھا۔ نثریت کا یہ نخلستان کتنا شاداب اور روشن تھا۔ یہاں لطافت ملائمت ور خوش مذاقی انشا کا چشمہ بن کر پھوٹ رہی تھی۔ ایک انشا پرداز کی منزل اس کے پاؤں چوم رہی تھی۔ آپ کے جتنے بھی انشائیے اس عرصے کے دوران شائع یا نشر ہوئے ان میں سماج کی تلخیوں کا ہلکا بوجھ بھی تھا، ذوق سلیم اور احساس حسن کا نیا معیار بھی تھا اور ایک توانا تخلیقی شخصیت کا منفرد انداز بھی

جس کے مس کرتے ہی تخلیق قاری پر ایک جمالیاتی خودفراموشی کی لطیف کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ''غبار کارواں'' اس ادبی دلآویزی کا مرقع بن کر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں جو مقالے شامل کئے گئے تھے وہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان شائع ہونے والے انشائیوں کا انتخاب تھا۔ ممتاز ناقد قمر رئیس اس انتخاب کا جائزہ لینے کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

> ''زماں صاحب کی شوخیِ طبع ہنساتی ہی نہیں، ایسی چٹکیاں بھی لیتی ہے کہ آدمی بلبلا اٹھتا ہے۔ زماں صاحب کے ظریفانہ انشائیوں میں ان کا منفرد فن صاف جھلکتا نظر آتا ہے......''

انشائی محفل ایک بزم بے تکلف ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کو انسانی دماغ کی ڈھیلی ڈھالی اور بے پرواہ قسم کی اڑان کہا تھا۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد دراصل ہم ایک گم کردہ شے پالیتے ہیں۔ ایسی شے جو روزانہ کی سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے۔ لیکن ذرا سے بھٹکنے پر انشائیہ اپنی ہیت سے انحراف کرنے لگتا ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس، کنہیالال کپور، وزیر آغا اور خورشید الاسلام اردو کے بڑے کامیاب انشا پرداز ہیں۔ ''آداب صحافت'' میں زماں صاحب کے فن کا جائزہ پیش کرتے ہوئے یوں لکھا گیا ہے[1]:

> ''ہمارے یہاں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ نے انشائیہ کے شعبے میں کئی مستحسن کوششیں کی ہیں۔ ان کے یہاں انشائیہ تحریر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کے انشائیوں کے مجموعہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں سے بعض انشائیے اس قدر اعلیٰ پائے کے ہیں کہ انہیں

انگریزی کے انشائیوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے''۔

یہاں جس مجموعے کی طرف اشارہ ہے وہ دراصل مصنف کی کشمیری کتاب ''ابسے'' ہے جس پر مصنف کو ساہتیہ اکیڈیمی کا ۱۹۸۴ء کا ایوارڈ حاصل ہوا۔ اس کا جاذب نظر انگریزی ایڈیشن Thorns & Thistles کے عنوان سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اب اس کا اردو ترجمہ بھی ''کانٹے'' کے عنوان کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ یہ قبول عام اور یہ Recognition ایک ایسے فن کار کا حق ہوتی ہے جس کے الفاظ گوناگوں اور پیچ در پیچ انسانی نفسیات کی ایک تجریدی Abstract علامت بن کر ابھرتے ہیں۔ کبھی ہمیں زیر لب مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہیں ہمیں زندگی کا ایک ان دیکھا چہرہ دکھاتے ہیں اور کبھی ہمیں ایک نئی بصیرت دیتے ہیں۔

''گلدستہ'' نام کا ایک اور مجموعہ ابھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے مضامین بچوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اس کی اشاعت بھی زماں صاحب کو کئی توصیفی اسناد ملی ہیں۔ دراصل اردو میں بچوں کے ادب کی طرف ایسی سنجیدہ کاوشیں بہت کم ہو رہی ہیں۔

آج کل جو کتابیں زیر ترتیب ہیں ان میں ''سب جھوٹ ہے اور لکھنوی تہذیب ادبیات کے آئینے میں'' وغیرہ شامل ہیں۔ زماںؔ صاحب کشمیر یونیورسٹی میں ''اردو شعبے'' کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

خوش مزاجی اور بذلہ سنجی زماںؔ صاحب کی اہم خصوصیات ہیں جس محفل میں بیٹھتے ہیں شیریں لہجے اور باوقار طرز ادا کے ساتھ لطیفوں کی ایسی پھلجڑیاں چھوڑتے ہیں کہ بزم باغ و بہار بن جاتی ہے۔ تحریر کی طرح ان کی تقریر بھی شعریت و

ادبیت سے لبریز ہوتی ہے۔ اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش کارفرما نہیں ہوتی ہے۔ یہ ادبیت اور شگفتگی دراصل آپ کی طبیعت میں رچی ہوئی ہے۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں اردو زبان پر اتنی قدرت ہے کہ دلی اور لکھنو کے زبان دانوں سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کے متحمل ہیں۔ یہ اسی ادبیت کا اعجاز ہے کہ آپ کی بظاہر غیر سنجیدہ تحریریں حسن خیال اور حسن زبان کے گنگا جمنی رجحان سے آراستہ ہوکر عالمانہ و فاضلانہ رموز و نکات پیدا کرتی ہیں۔ ان سے ایک خوش مزاج و خوش گفتار انشائیہ نگار کے رنگا رنگ تاثرات ابھرتے ہیں۔ گویا ایک کامیاب انشائیہ نگار کی طرح زماں صاحب اپنی پرلطف باتوں کو خوش نما تحریری ملبوسات پہنانے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ آپ کی خوش طبعی کا اثر ہے کہ روزمرہ کی معمولی سے معمولی بات کو بھی آپ اپنی خوش گفتاری سے ایک ادب پارہ بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کو ابھی ایسے ادب پاروں کے انبار لگانے ہیں۔

---

1 آدابِ صحافت: جان محمد آزاد، صفحہ ۷۱

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

رشید نازکی

ڈاکٹر رشید نازکی ان چند شخصیات میں شامل ہیں جنھوں نے کشمیر میں اردو نثر کے گیسو سنوارنے میں برسہا برس تک مسلسل کام کیا ہے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر درویشوں کی طرح گھنی سفید داڑھی ان کی خشونت میں اضافہ کرتی ہے۔ اردو کے شعلہ بیان اور شگفتہ نگار انشا پرداز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیجئے اس شگفتہ قلم کے سحر آفریں انداز سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

''مختلف خرمنوں کی اس خوشہ چینی نے خود کشمیری تمدن کو اس قدر ذی شان بنادیا ہے کہ اسکی روشنی میں ہزاروں قوس قزح لہرا رہے ہیں۔ کشمیری قوم نے حشر آفریں سیاسی قیادتوں کے باوصف اپنے تمدن کے بہشت زاروں کو تاریخی تقاضوں کے عین مطابق سینچا۔ اس قوم کو ہر دور میں ایسے عظمائے رجال نصیب ہوئے جنھوں نے وقت کی تاریکیوں کو ایسے آفتاب بخش دئے کہ ان کے ساتھ ان کا مادر وطن بھی جلوہ گہہ طور بن پایا1''۔

''کشمیریوں کے خون میں صبر و تحمل کے گلابوں کی مہک اور انسانیت کے زمرزموں کا آب حیات اس قوم کی شریف روح اور متحمل پیکر گل کی غماز

ہے۔ کشمیری کی تمدنی تاریخ کی رگوں میں مختلف تہذیبی دھاروں کا خون گردش کررہا ہے۔ یہاں کئی تہذیب آئے کشمیری تمدن کو متاثر بھی کیا لیکن آخر کار کشمیر تمدن کے اتھاہ ساگر میں ضم ہوکر رہ گئے 2"۔

"شاعر نے (تھامس مور) کشمیر کی گل اندام اور نکہت پیرہن فضاؤں کا تانا بانا بُن لیا ہے۔ اس نے جہانگیر اور نور جہاں کو اس گلستان صدرنگ کی قوس قزح بنا لیا ہے۔ جہانگیر کے لئے کشمیر آنا مقتضائے حیات سے کچھ کم نہ تھا۔ وہ اپنی روح کے سلگتے الاو سے کشمیر کے شجر ہائے سایہ دار میں کچھ دیر ستا لینے کے لئے ہی نہیں بلکہ جسم و جاں کا تعلق قائم رکھنے کے لئے وارد کشمیر ہوتا تھا3"۔

بلا شبہ کشمیر میں ایک دو مثالوں کے بغیر ایسی خوب صورت نثر کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اس نثر پر بعض لوگ Decorative سٹائل کی لیبل بھی چسپاں کرتے ہیں۔ لیکن میں اسے ایک سخن ساز کی مینا کاری اور نگینہ سازی کا اعجاز سمجھتا ہوں۔ ایک محقق کی حیثیت سے "مورخ حسن کا شاعرانہ مقام" اور تنہا انصاری ایک تعارف جیسے آپ کے درجنوں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ایک مقتدر مدیر کی حیثیت سے شیرازہ کے مشاہیر نمبر" "شیخ العالم نمبر" وغیرہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں ایک باوقار عہدے سے ریٹایر ہونے کے بعد آپ بانڈی پورہ کے اپنے آبائی قصبے میں دینی فکر کے ساتھ دینی زندگی گزار رہے ہیں۔

---

1 مشاہیر نمبر ۷۷-۱۹۷۶ء: پیش آہنگ صفحہ ۶

2 شیخ العالم نمبر شیرازہ ۱۹۷۸ء

3 مغل دور کی فارسی شاعری میں کشمیر کا تذکرہ: مغل اور کشمیر نمبر (شیرازہ) صفحہ ۶۵

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ لداخ کی دشت و سنگ سنسان برفانی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ آپ کا بچپن اور لڑکپن لیہہ اور اس کے آس پاس کے اسی ماحول میں گزرا۔ آپ نے زوجیلا کے اس پار رہنے والے جفاکش اور تیرہ نصیب لوگوں کے درد کو اپنے وجود میں تحلیل کیا اور اپنے افسانوں اور ناولوں میں اس کا بھرپور اظہار کیا۔ آپ کی پہلی کہانی ''جلن'' ماہنامہ دیش (سرینگر) کے ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں شامل ہوئی۔

آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دس کہانیاں ہیں۔ پانچ کہانیاں زوجیلا کے اُس پار......لداخ سے متعلق ہیں۔ جبکہ باقیماندہ پانچ کہانیاں زوجیلا کے اِس پار کشمیر اور ملک کے بعض دیگر حصوں کے پس منظر میں تحریر کی گئی ہیں۔ اس طرح افسانوں کا یہ مجموعہ عبدالغنی شیخ کی ذات کی طرح شہر کی ہلچل اور گھمیوں اور لداخ کے شہر خموشاں کا ایک دلچسپ امتزاج بن کر ابھرا ہے۔ ''مسکراہٹ، محبوبہ، گنجوں کی کہانی اور یادگار'' کے عنوان سے شامل کہانیاں بالترتیب ہمارا ادب (سرینگر) ماہنامہ فلمی ستارے (دہلی)

ماہنامہ واقعات (دہلی) اور ماہنامہ ''بانو'' (دہلی) میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کی دو اور کہانیاں ''آرزوئیں'' اور لوسر کے پھول پمپوش (دہلی) میں کمال لداخی 1 کے نام سے چھپ چکی ہیں۔

''آرزوئیں'' افسانہ نگار کے ابتدائی دور کا نمائندہ افسانہ ہے۔ حسین بودھی دوشیزہ کزیزا اپنی ہم عمر سہیلیوں نیما اور پدما کے ہمراہ من میں ایک بھائی کی کامنا لے کر سنگر گنپہ جاتی ہے۔ یہاں وہ بدھ کے مجسمہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے۔ اس کے من میں کئی معصوم آرزوئیں مچلنے لگتی ہیں۔ لیکن بھائی کی خواہش سب سے شدید ہوتی ہے۔ وہ اپنے رسم کے مطابق پیتل کی ایک پرانی انگوٹھی بڑے ادب سے نذرانہ پیش کرتی ہے اور بڑے لاما سے تعویز حاصل کر کے امید وبیم میں ڈوبتی ابھرتی گھر آتی ہے۔ اس کی منو کامنا پوری ہوتی ہے اور اسے اپنے جیسا ایک محروم شخص بہن بنا لیتا ہے۔ اس کہانی میں لداخ کا پورا مزاج اور ثقافت سمٹ آئی ہے۔ اسی طرح لوسر کے اہم تہوار کے پس منظر میں ''لوسر اور آنسو'' ایک اور اہم کہانی ہے۔ صنعم انگموں کی ویران زندگی میں مسرت بن کر آیا۔ لیکن ازدواجی زندگی کے اتنے برس بعد لوسر کے موقع پر وہ کہیں سرحد پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ یہاں بھی افسانہ نگار نے لداخ کی روزمرہ زندگی کا عینی مشاہدہ پیش کیا ہے۔

اسی دوران آپ کا ناولٹ ''وہ زمانہ'' شائع ہوا، 2۔ جس میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی، ثقافتی اور مجلسی زندگی اور اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جزئیات مزاحیہ اور دل کش پیرائے میں پیش کی گئی ہیں۔ پھر ۱۹۷۸ء میں آپ کا ناول ''دل ہی تو ہے'' شائع ہوا۔ یہ لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا

اردو کا پہلا ناول ہے۔لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں۔سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد لوگوں کی اقتصادی خوش حالی یقینی بن جاتی ہے وہاں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے۔اس ناول کا ہیرو سونم سرینگر سے ڈاکٹری کی تربیت مکمل کرنے کے بعد جب واپس لیہہ پہنچ جاتا ہے تو اسے یہاں ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔یہاں ہر شخص غیر ملکی سیاحوں سے زیادہ سے زیادہ روپے بٹورنے میں سرگرداں نظر آتا ہے۔سونم کا چچا سونم کو بھی نتیجہ نکلنے تک ٹورسٹ گائیڈ بنا دیتا ہے۔اس میکانکی ماحول میں وہ پدماں سے ملتا ہے جو اس کی بچپن کی ساتھی ہے۔جو برسوں سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائی ہوئے ہے۔جو اب بھی اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔پدماں سونم کی نس نس میں پیار کی جوت جگاتی ہے۔گھر والے دونوں کی شادی کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔لیکن پھر اچانک مغربی تہذیب کی ایک تتلی نیماں سونم کو اپنے حسن سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔سونم پدماں کے خلوص اور وفا کو نظر انداز کر کے نیماں کی طرف بے تحاشہ قدم بڑھاتا ہے لیکن نیماں انجام کار اسے منجدھار میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔وہ اپنی جذباتیت پہ نادم ہو کر آخر واپس پدماں کے پاؤں میں گر جاتا ہے۔

یہ ایک سیدھی سادھی سی کہانی ہے۔اس کے مفہوم ومعانی میں کوئی پیچیدگی یا تہہ داری نہیں۔رومانی آرزومندی کی یہ کوششیں اگر چہ جدید ادبی تقاضوں کے میزان و معیار پہ کھری نہیں اتر سکتی تاہم مصنف نے اپنے ماحول کی جو پُر خلوص عکاسی کی ہے وہ لایق ستائش ہے۔غالباً اسی بات کے پیش نظر ریاستی کلچرل اکیڈیمی

نے مصنف اس کتاب کے لئے ایوارڈ دیا تھا۔۱۹۸۰ء میں آپ نے "صنم زربو" کی ایک بایوگرافی بھی لکھی جو لداخ میں بے حد مقبول رہی۔

پچھلی ایک دہائی کے دوران عبدالغنی شیخ نے ادیب کے علاوہ لداخیات کے ایک مقتدر محقق کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی ہے۔اس دوران آپ کے افسانے اور کہانیاں ملک کے کثیر الاشاعت رسائل میں شائع ہوئیں۔شمع (دہلی) میں آپ کے نصف درجن افسانے شائع ہوئے۔آپ کے فن میں اب خون جگر کی نقش گری صاف جھلکتی ہے۔آپ کی اختصار پسندی اور قطعیت آپ کے فن کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ ادھر لداخ کے کلچر اور اس کی تاریخ پہ آپ کے درجنوں مضامین پابندی سے "شیرازہ" اور "تعمیر" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان مضامین کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آپ لداخیات کے موضوع پہ ایک "اتھارٹی" کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔آپ کی کہانیوں کا نیا مجموعہ کتابت و طباعت کے مراحل سے گزر کر ۱۹۹۳ء میں "دوراہا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔اس میں مجموعی طور ۲۳ کہانیاں شامل کی گئیں ہیں۔جن میں کوئی سات کہانیاں لداخ کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔آپ فی الوقت لداخ کی ایک جدید تاریخ کی ترتیب میں لگے ہوئے ہیں۔

---

1 آپ ابتدائی زمانے میں اسی قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔

2 "وہ زمانہ" کے بنیادی سکرپٹ میں ترامیم و اضافوں کے بعد آپ نے دوردرشن (دہلی) کے لئے ایک سیریل بھی تحریر کیا۔

3 ۱۹۹۱ء میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے لداخ کی تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک نمائندہ وفد کے ہمراہ برازیل کا بھی دورہ کیا۔ (جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

عبدالاحد رفیق

وادیٔ کشمیر کے اطراف میں پچھلے چھ سو برسوں کے دوران فارسی کے ایسے ادیب اور عالم پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی گرانقدر عطا بقائے دوام کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان عظمائے رجال کے گنج ہائے گراں مایہ کی طرف ہمارے یہاں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ امر باعث اطمنان ن ہے کہ عبدالاحد رفیق جیسے صاحب علم حضرات تاریخ کے ان دھندلے ایام کو اپنی توانا تحریروں سے شگفتگی بخشتے رہے ہیں۔ آپ نے اردو اور فارسی دونوں میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور برسوں تک مختلف کالجوں میں لکچرار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ عبدالاحد رفیق کی فارسی ادب سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ آپ اب ایک چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصے سے علمی و تحقیقی کام کرتے رہے ہیں۔ آپ کی تحقیق کا کلیدی موضوع فارسی علم و ادب کی عظیم المرتبت شخصیات کو اردو دنیا سے متعارف کرانا رہا ہے اور یہ دقت طلب کام آپ کسی صلے یا ستایش کی پرواہ کئے بغیر ذوق وعزم سے انجام دیتے رہے ہیں۔

''ملا عبدالحکیم ساطع کشمیریؒ'' یہ آپ کا تحریر کردہ مضمون ہمارا ادب کے

مشاہیر نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ساطع ہمدانی خاندان کے چشم و چراغ تھے جنہوں نے مغلوں کے دور انحطاط میں کشمیر میں فارسی شعراء و ادب کی مشعل روشن رکھی تھی۔ آپ اس مضمون میں ساطع کے نثری کارناموں کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں اور مختلف تذکروں میں ان کی اہمیت کے اعتراف کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ تاہم آپ اس حقیقت سے بھی انحراف نہیں کرتے کہ ساطع کے اشعار طاوس ورباب کے دور کے ہیں اوران کی غزلیں رنگ تغزل سے کہیں کہیں عاری نظر آتی ہیں۔

اسی نوعیت کا آپ کا ایک اور مضمون خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ[2] کے متعلق ہے۔ گو یہ مطالعہ سطحی نوعیت کا ہے تاہم عبدالاحد رفیق نے خواجہ نوشہریؔ کے تصانیف کا ایک سیر حاصل جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ جہاں آپ نے کہا ہے کہ خواجہ حبیؔ نے فن برائے فن اشعار نہیں کہے وہاں آپ نے اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا کہ خواجہ صاحب کے بعض اشعار کا اگران کے باقی کلام سے موازنہ کیا جائے تو قطعی مختلف چیز لگتی ہے۔ یہ انوکھی بات عبدالاحد آزاد جیسے محقق سے بہر حال چھپی نہیں رہ سکی ہے جس کا انہوں نے تفصیلاً ذکر بھی کیا ہے۔

''ملا محمد اسماعیل بینش کشمیریؔ[3] '' آپ کا ایک اور اہم مقالہ ہے۔ اس مایہ ناز فارسی شاعر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کے فارسی شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنے خون جگر سے جو لالہ کاری کی ہے اس کے سامنے ایرانی فن کاروں کی گل کاریاں بھی بعض اوقات ماند پڑ جاتی ہیں۔ کشمیری میں بینشؔ کا نام جویاؔ کے دوش بدوش لیا جاتا ہے۔ بینشؔ کو کشمیر کے فطری حسن اور مناظر کے ساتھ بڑا لگاؤ رہا ہے۔ یہاں

کے باغات، گل پوش وادیاں اور حسین کوہسار کا حسن ان کے ہر شعر سے چھلکا پڑتا ہے۔ لیکن بینشؔ کا اصلی شاہکار اس کی مثنویاں ہیں جہاں ان کی کمال ہنر مندی ظاہر ہوتی ہے"۔

"میر الٰہی میر عماد الدین محمود کشمیری" اور مرزا محی الدین قادری زورؔ پہ آپ کا تحریر کردہ مضمون "ڈاکٹر زور کا قیامِ کشمیر" کے عنوان سے شیرازہ کے زور نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں آپ نے کشمیر میں قیام کے دوران زورؔ صاحب کی ادبی سرگرمیوں کا ایک دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کس طرح مرحوم وادی کے ابھرتے اور آزمودہ کار ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ عبدالاحد رفیق نے ان مشاہیر کی قلمی تصویروں سے جو آرٹ گیلری سجائی ہے۔ اس کا ہر عکس ان کی بے پناہ ریاضت اور عرق ریزی کا آئینہ دار ہے۔

ادھر آپ کے بعض دیگر مضامین بھی مغلیہ عہد کی لازوال عطا پہ بحث کرتے ہیں۔ "کشمیر کے باغات" اس سلسلے کا ایک اہم مضمون ہے۔ اس مضمون میں آپ نے بعض ایسے باغات کا ذکر کیا ہے جو تاریخ کے دھندلکوں میں کھو گئے ہیں۔ آپ یہاں باغ زین العابدین، باغ زینہ گیر، باغ جروگہ شاہی باغ دارالمحل، باغ شالیمار اور باغ نسیم کا ایک نئے انداز سے جائزہ پیش کرتے ہیں۔ عہد مغلیہ میں کشمیر کی تمدنی زندگی اور کشمیریوں کی فوجی روایات دو دیگر اہم مقالے ہیں۔ آخر الذکر مضمون نئے بدلتے حالات وواقعات میں ایک گم گشتہ حقیقت کی بازیافت نظر آتا ہے۔

---

1 ہمارا ادب مشاہیر نمبر صفحہ نمبر ۳۲۵

2 تعمیر ستمبر اکتوبر ۱۹۸۹ء صفحہ نمبر ۱۶

3 تعمیر اپریل مئی ۱۹۷۸ء صفحہ نمبر ۱۳

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

نشاط انصاری

آپ کا پورا نام غلام مصطفےٰ انصاری ہے۔ آپ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۰ء کو دلنہ (بارہمولہ) کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کے ممتاز ادیب اور شاعر تنہا انصاری آپ کے برادر اکبر ہیں۔ آپ لگ بھگ ایک چوتھائی صدی سے اردو میں تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین بڑے معرکے کے ہیں۔ بعض مضامین معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اپنے دلچسپ نثر میں کتابوں اور مضامین کی عالمانہ انداز میں تشریح کرتے ہیں۔ مثلاً کشمیری انسائیکلو پیڈیا...... ایک جائزہ کے عنوان سے آپ کا جو مضمون شیرازہ میں شائع ہوا ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ آپ صاحب فکر اور صاحب طرز ناقد ہیں جو بات کہتے ہیں۔ سلیقہ سے کہتے ہیں۔

بعض ادیب اس بات سے نالاں ہیں کہ نشاط انصاری ان کی تحریروں میں لفظ و بیاں اور روزمرہ کی غلطیاں پکڑنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یعنی فلاں مصرع میں فلاں لفظ کا الف دب گیا ہے۔ مضمون نگار نے مذکر کو مونث لکھ دیا۔ یہ محاورہ یوں نہیں بلکہ یوں لکھا جانا چاہئے تھا۔ اہل زبان اس طرح نہیں بولتے ہیں۔ بہر کیف یہ

بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ نشاط صاحب غلط بیانیوں پر بھی گرفت کرتے ہیں اور ان کی نکتہ شناس نگاہ سے کوئی غلط لفظ یا محاورہ بچ کرنہیں جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں بڑے بڑوں کی تحریروں میں بھی غلطیاں مل ہی جاتی ہیں۔ پیش ہے محمد یوسف ٹینگ کی کتاب ''شناخت'' پر ان کے تبصرے سے ایک اقتباس:

''......''شناخت'' کی کتابت اگرچہ محمد صدیق ایسے نامور خوش نویس سے کروائی جاچکی ہے لیکن لگتا ہے کہ ان کی نستعلیق قلم وخط پر پیرانہ سالی نے اپنا سال خوردہ سایہ قبل از وقت ڈال دیا ہے۔ جب ہی تو ایک ہی کتاب کی کتابت میں چار خط کے چار مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ اس کے شروع سے تتمہ تک املا انشا اور کتابت کی لگ بھگ پچاسی غلطیاں کرکے وہ اپنی سہل انگاری پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں''۔

''اردو کشمیری فرہنگ'' کا جائزہ پیش کرتے ہوئے آپ نے بارہ ہزار سے زائد الفاظ، مقولات اور محاورات اور ان کے معنی ومترادفات کو کشمیری زبان میں شیرازہ بندی کرنے پر ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی کاوشوں کو سراہا ہے[2] اور کہا ہے کہ کشمیری زبان جو کل تلک بے بال وپر تھی اس فرہنگ کی تالیف سے اس قابل ہوگئی ہے کہ ملک کی دوسری زبانوں کے ساتھ برابری کرسکے۔ لیکن اس نقش دلبری کے بعد وہ ایسے ایک سو الفاظ اور محاورات کی فہرست پیش کرتے ہیں جو زیر بحث فرہنگ میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ پھر وہ فرہنگ میں شامل متروک الفاظ پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے فرہنگ میں درج شدہ محاورات کے غیر موزوں مترادفات کی ایک طویل فہرست بھی تحریر کی ہے۔ اسی پر بس نہیں، آپ نے اپنے

اس سیر حاصل جائزے کے اختتام میں املا کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ بلاشبہ ایسے جائزے جس عرق ریزی اور عالمانہ بصیرت کے متقاضی ہیں وہ صرف نشآط انصاری کا ہی حصہ ہو سکتے ہیں۔ ''اکادمی کے اشاعتی کارنامے[3]'' ایک اور ایسا ہی مقالہ ہے جس میں اکادمی کے تیس سالہ کارناموں کا مفصل تذکرہ ملتا ہے۔

---

1 شیرازہ جون ۱۹۸۷ء صفحہ ۳۹

2 دوماہی شیرازہ جلد ۱۳ شمارہ ۱، ۲، ۳

3 ماہنامہ شیرازہ جلد ۲۹ شمارہ ۹ تا ۱۱ صفحہ ۱۸۵

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اوتار کرشن رہبر

آپ کا اصلی نام اوتار کرشن مام ہے۔ آپ اپریل ۱۹۳۳ء میں فتح کدل (سرینگر) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے، بی ایڈ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ریڈیو کشمیر میں سکرپٹ رائٹر کے عہدے پر تعینات ہوئے۔ کشمیری زبان میں آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''تبرک'' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ کشمیری ادب کی تاریخ، تنقید اور تحقیق پہ آپ کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض مضامین کے مجموعے پر ۱۹۶۵ء میں کلچرل اکیڈیمی نے رہبر صاحب کو انعام سے نوازا۔ ۱۹۶۷ء میں آپ نے غلام نبی خیال کے اشتراک سے ''کاشر نثر'' جیسی ضخیم کتاب ترتیب دی۔ یہ کتاب آج بھی حوالے کی ایک اہم دستاویز تصور کی جاتی ہے۔

کشمیری زبان، ادب اور ثقافت پہ اوتار کرشن رہبر کی محققانہ اور ناقدانہ نگاہ بلاشبہ مستحسن ہے۔ اپنے ادبی اور تحقیقی سفر کے ابتدائی دور میں آپ نے اردو کو بھی یکساں طور اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ شیرازہ کی ستمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں آپ کا مقالہ ''بڈشاہی عہد اور کشمیری ادب'' شائع ہوا ہے۔ اپنے اس تحقیقی جائزے میں آپ نے بڈشاہی دور کے عظیم مشترکہ کلچر اور زین العابدین کی ادب نوازی کا کماحقہ

مطالعہ کیا ہے۔ اس سازگار ماحول میں جو مقتدر شخصیات آسمان ادب پر بدر بن کر چمکیں ان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک اور مقالہ ''کشمیری ادب کی سب سے پرانی کتاب'' شیرازہ ہی کے مارچ ۱۹۶۴ء کے شمارے میں شامل اشاعت ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی کے مصنف شتی کنٹھ کی کتاب ''مہانے پرکاش'' کو اس قسم کی اولین کتاب قرار دیتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ شتی کنٹھ کی زبان آج سے لگ بھگ سات سو سال پرانی زبان ہے اور اس وقت کی مروجہ کشمیری زبان سے مختلف ہے۔ تاہم لسانیات کے طلبہ کے لئے یہ کتاب انتہائی دلچسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ کلچرل اکیڈیمی کے ضخیم اور عظیم مشاہیر نمبر میں بھی بڈشاہ کے متعلق آپ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ سرزمین کاشمر پر نصف صدی تک حکومت کرنے والے اس شہنشاہ کا ایک کامیاب شخصی تعارف ہے۔ کشمیری تہذیب وتمدن کی یہ سوغات تحریریں ادھر کئی برسوں سے اب صرف ریڈیو کشمیر کے لئے مخصوص ہوکر رہ گئیں ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
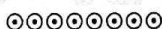
شمس الدین احمد

شمس الدین احمد ۱۹۳۱ء میں زینہ کدل کے نزدیک خواجہ غلام محی الدین جانؔ کے ہاں تولد ہوئے۔ ان کا سلسلہ دارشکوہ کے پیر طریقت ملاّ شاہ بدخشی 1 کے بھائی تک پہنچتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور فارسی ادبیات کے پروفیسر ہوگئے۔ ۱۹۶۳ء میں حکومت ایران کے وظیفہ پر طہران گئے اور فارسی زبان کے ایک شاعر محمد رضا مشتاقؔ کے حیات اور افکار پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اردو میں آپ کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کشمیری صوفی شاعر شمس فقیر کے بارے میں ترتیب دیا ہوا رسالہ ریشی نامہ سے موسوم ہے۔ یہ تعارف، تبصرہ اور نمونہ کلام کے تین حصوں پر مشتمل ہے اور اسے ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے شائع کرایا ہے۔ کشمیری زبان کے نثر میں آپ کا اضافہ اچھا خاصا ہے لیکن ''زین العابدین رہنما'' کی سیرت پاک پر لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ آپ کا ایک اہم کا نامہ ہے۔ یہ کتاب اصل میں فرانسیسی ادیب ہینری میسی ''Henry Masse'' کی تحریر کی ہوئی ہے محمد رضا مشتاقؔ کے فکر وفن پر آپ کا مضمون ہمارا ادب ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے۔ آپ کی تحریر میں سلاست اور

شگفتگی ہے۔آپ کے اس مضمون کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں فارسی کے اس ممتاز شاعر کا کشمیر کے حوالے سے تعارف کرایا گیا ہے۔آپ نے برسوں پہلے ایک ڈرامہ ''غنی کاشمیری'' کے عنوان سے لکھا تھا جو بیحد پسند کیا گیا تھا۔اس ڈرامے کے تین کردار ہیں 2 رومی، اقبالؒ اور غنی۔اقبالؒ غنی سے ملنے کے بعد بے حد مشتاق ہوتے ہیں۔اُن کا دل اس عاشق صادق سے ملنے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔آخر رومی دونوں کو ملاتے ہیں اور غنی بھی اقبالؒ کی شخصیت اور افکار سے متاثر ہو جاتے ہیں۔آپ نے فارسی کے شہہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی ایک زبردست مہم شروع کر رکھی ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

---

1 تعمیر مئی ۱۹۸۸ء ص ۴۷

2 کشمیر میں اردو: سروری ص ۳۰۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

پیر محمد افضل

تحریک حریت کشمیر کے پُر جہاد ماہ و سال میں ایک بے باک سپاہی کی طرح استبدادی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے خطاط بھی تھے۔ چنانچہ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی نے فن خوش نویسی کو فروغ دینے کے لئے جو درس گاہ قائم کی وہ اس کے اولین صدر مدرس تعینات کئے گئے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے محقق اور مضمون نگار بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین، سوانحی جائزے اور انشائیے سرینگر کے دو مقبول اخبارات آفتاب اور آئینہ میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے کشمیر کے بعض مشہور چوروں کے متعلق کچھ دلچسپ مضامین تحریر کئے۔ اس کے بعد انہوں نے روزنامہ آفتاب میں ہی بعض رسوائے زمانہ ''ٹراروں'' کے محیر العقول ''ٹر'' تحریر کئے۔ یہ سلسلہ بے پناہ دلچسپ رہا۔ ان ایام میں تحقیق کا دائرہ بہت سمٹا ہوتھا لیکن مخدومی صاحب نے اپنے قلم سے ذوق و تحقیق کی برقی لہر دوڑادی۔ ان کی تحقیق کا جذبہ جنوں کی حد کو چھو گیا تھا۔ چنانچہ اپنی سیاسی معرکہ آرائی کے دوران ۱۹۳۴ء میں جب انہیں سنٹر جیل سرینگر میں پابند سلاسل کیا گیا تو وہ اس چاردیواری میں آباد دنیا کی سرگرمیوں، بارکوں اور سنگین

کوٹھریوں کے پر آشوب اسرار سے آگہی حاصل کرتے رہے۔ بعد میں ان ہی تجربات پر انہوں نے ایک اہم مضمون ''پھانسی کے امیدوار قیدی'' تحریر کیا جو شیرازہ کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوا۔ ان کا عینی مشاہدہ اور دلچسپ انداز بیان قاری کو بے حد متاثر کرتا ہے۔

ماضی کے بعض گم گشتہ چہرے، جو دھند میں لپٹ گئے تھے جو افسانوی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں پیر افضل مخدومی نے اپنی توانا تحقیق و تحریر سے ہمارے سامنے زندہ و جاوید کر دیا۔ ''وزیر پنوں اور سلام پیر'' کے عنوان سے ان کا ایک اور مضمون شیرازہ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے وزیر پنوں جیسے سفاک اور بے رحم حاکم کی چنگیزیت کا عبرت آموز جائزہ پیش کیا ہے۔ وبا، قحط، آگ اور زلزلوں کی جو قدرتی قہر مانیاں کشمیری قوم پر ٹوٹی ہوئی تھیں اس سے بے نیاز یہ سخت گیر حکمران قہر و غضب کا عفریت بن کر جبر و بربریت کا بازار گرم کرتا رہا ہے۔ استعارہ کنایہ اور رمز کا برمحل استعمال مصنف کی تحریر کو ادبیت اور نفاست کا پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔ شیرازہ کے اقبال نمبر میں ان کا ایک اور مضمون ''حکیم مشرقؒ اور تحریک حریت کشمیر'' بھی ان کے نثر میں ادبی حسن کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کے منفرد فکر و نظر کے یہ کارنامے کسی بھی لحاظ سے فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد امین پنڈت

محمد امین پنڈت دری بل خانیار میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد سیف الدین پنڈت ایک بلند پایہ کے خوش نویس تھے۔ آپ سری پرتاپ کالج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں اخبار ''خدمت'' کے ادارتی عملے میں شامل ہوگئے۔ آپ کشمیر جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے سکرٹری بھی رہے۔ دراصل انجمن سازی کے رجحانات کا یہ نقش اول تھا۔ اس کے بعد زندگی کے مختلف ادوار میں آپ متعدد تنظیموں سے مسلسل وابستہ ہوتے رہے۔ چنانچہ ان دنوں بھی آپ ایک فلاحی تنظیم کے مقتدر رکن کی حیثیت سے سرگرم عمل ہیں ''ہمپوش اور بمبئی کرانیکل'' جیسے اخبارات میں اپنی سرگرم خدمات کے بعد آپ محکمہ اطلاعات میں بطور ایڈیٹر ملازم ہوئے۔

''مختصر تاریخ کشمیر'' آپ کی پہلی کتاب ہے۔ دراصل یہ فارسی میں لکھی گئی ''موجز التواریخ'' نام کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں تاریخ کشمیر کا ایک جائزہ نہایت اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امین صاحب نے ترجمہ کرنے اور اپنے نوٹ لکھنے میں نہایت باریک بینی سے کام لیا ہے۔ ''لداخ کی کہانی'' آپ

کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ کتاب میں لداخ کی قدیم تاریخ، وہاں کے رسوم و رواج، جغرافیہ تجارت اور انتظامی انصرام کا ایک سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اس دور افتادہ خطے کے متعلق مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں کتاب پر اعداد و شمار کی کھتونی ہونے کا گماں ہونے لگتا ہے تاہم تحقیقی ادب کے شعبے میں کتاب کو آج بھی حوالے کی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔

آپ کے متعدد تحقیقی مضامین، رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ شیرازہ کے ستمبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں آپ کا ایک مضمون ''کشمیر کے آخری سلاطین'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مغل شہنشاہوں کے سیاسی ہتھکنڈوں اور ارض کاشمر کے تاجداروں کی ٹمٹماتی لو کا اس مضمون میں خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ تعمیر کے اگست کے خصوصی شمارے میں آپ کا ایک اور مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا عنوان ہے۔ کشمیر کے تمدنی جشن ...... اس مضمون میں آپ نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے اپنی سرکاری ملازمت کے دوران کشمیر ٹوڈے اور تعمیر جیسے رسائل کی سرپرستی نہایت طور پر انجام دی۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

برج پریمی

آپ کا اصلی نام برج کشن ایمہ ہے۔ آپ حبہ کدل سرینگر میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام پنڈت شیام لال ایمہ ہے۔ شیام لال ایمہ اردو اور فارسی ادبیات کے زبردست عاشق تھے۔ وہ اردو کے اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے۔ آپ کے افسانے اور مضامین مقامی روزنامہ مارتنڈ کے علاوہ بعض بیرونی رسائل میں بھی شائع ہوتے تھے۔ برج پریمی نے اسی ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ اپنے ان ایام کی یادیں شگفتہ کرتے ہوئے وہ یوں لکھتے ہیں1:

”والد میری انگلی پکڑ کر انجانی دنیاؤں کی سیاحت کرواتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہمک ہمک کر اچھلنے لگتا ہوں۔ ماں کے چرخے کا چکر گھوم گھوم کر کے اچانک رک جاتا ہے۔ وہ اپنی مدھ بھری مسکان کا ہالہ مرے اردگرد تان لیتی ہیں اور میری شوخیوں کے انار پھوٹ کر فضا میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ حبہ کدل درابی یار میں ایموں کا گنجان محلّہ...... تنگ و تاریک گلی کے اندر ایک ٹوٹا پھوٹا مکان۔ اس کے ایک کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر میرے والد پھرن کی آستین پر قہوے کا ایک ”کھرس“ تھامے محلے والوں پر رعب جھاڑ

رہے ہیں"۔

اردو میں ایم اے کرنے کے بعد آپ محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ آپ نے جو پہلی کہانی لکھی اس کا عنوان تھا 'آقا'۔ یہ کہانی ۱۹۴۹ء امر جیوتی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بے تکلف لکھتے رہے۔ آپ کی کہانیاں بیسویں صدی (دہلی) راہی (جالندھر) مصور (پٹنہ) اور دیگر معتبر رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ سروری صاحب آپ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ آپ کو برصغیر کے اس ممتاز محقق کے ساتھ نشت و برخاست کا برسوں تک اعزاز حاصل رہا۔ آپ کی نیاز مندی اور باصلاحیت معاونت کی وجہ سے سروؔری صاحب آپ کو اپنے "ضمیر کی آواز" کہہ کر وقار بخشتے تھے لیکن ان دیرینہ مراسم کے باوجود سات برس تک پی ایچ ڈی میں آپ کا داخلہ نہیں ہو سکا نہ جانے یہ سروؔری صاحب کی افسر نوازی کا اعجاز تھا یا خود پریمی صاحب کی بے نیازی کا۔ سروؔری صاحب آپ کی ابتدائی ادبی کاوشوں کا یوں محاسبہ کرتے ہیں2:

"برج کشن اپنے افسانوں میں کشمیر کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کشمیری پس منظران میں زیادہ نمایاں نہیں۔ ان کی کہانی "ہنسی کی موت" ایک پڑھی لکھی ترقی پسند لڑکی اور اس کے دق زدہ شوہر کی کہانی ہے۔ جو شہر کے مشینی نظام سے دور مانسبل جھیل کے قریب کسی گاؤں میں زندگی گزارنے آئے تھے۔ شوہر ایک دکان میں منشی کی ملازمت قبول کر لیتا ہے اور بیوی دن دھاڑے خواب دیکھنے والی خود بھی ایک بھولا بسرا خواب بن جاتی ہے اور قلب کی حرکت بند ہونے سے مر جاتی ہے......"

آپ کے دیگر افسانے ''پھٹی پھٹی آنکھیں، مانسبل، زاوئے، یہ گیت یا مزار، خوابوں کے دریچے'' بھی شائع چکے ہیں۔ ''سپنوں کی شام'' آپ کا ایک بہتر افسانہ ہے۔ یہاں رنگوں اور تصویروں کا ایک حسین البم نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں مقامی ماحول کا لمس ہر موڑ پہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں دیہات کے موسم ہیں اخروٹ کی نکہتیں ہیں اور تخلیق کے ساحر کا ہفت رنگ اسلوب ہے۔ اسی عنوان سے آپ کا پہلا مجموعہ دیپ پبلی کیشنز کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں آپ کے ۱۶/افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں کشمیری لال ذاکر لکھتے ہیں:

> ''ایک بات جو ان سبھی کہانیوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ برج پریمی کا انداز خود کلامی Soliloquy کا انداز ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ ہی سے گفتگو کر رہا ہے۔ یہ عمل بڑا ہی پُر عذاب ہوتا ہے۔ کیونکہ بات کرنے والا جب بات کرتا ہے تو اپنی روح میں لگے ہوئے پرانے اور نئے زخمون کو چھیڑتا ہے۔ بالآخر وہی کسک دھیرے دھیرے قاری تک بھی پہنچ جاتی ہے''۔

برسوں بعد پی ایچ ڈی میں آپ کا داخلہ ہوا۔ ''سعادت حسن منٹو'' کی ہیجان خیر زندگی اور خود فریبی کے ذرہ بکتر کو تار تار کرنے والے ان کے کارنامون کا احاطہ کرنا کوئی سہل کام نہیں تھا۔ لیکن ان کے اس ادبی احتساب کی گونج ملک کے اطراف واکناف میں سنائی دینے لگی۔ ملک کے مقتدر ناقدین نے آپ کے اس تحقیقی کارنامے کو ایک بہترین تخلیق قرار دیا ہے۔ دراصل یہ آپ کی برسوں کی عرق ریزی لگن اور بے پناہ ریاضت کا ثمرہ تھا۔ ملک کے ایک صف اول کے ناول نگار کشمیری لال ذاکر نے لکھا ہے۔ ''اتنی خوب صورت کتاب پر میں اپنے کم از کم ایک

درجن ناول قربان کر سکتا ہوں''۔ ملک کے ایک ممتاز ناقد پروفیسر حامدی کاشمیری نے کہا ''برج پریمی نے پرانے اور بوسیدہ تصورات ترک کر کے منٹو کی طوفانی زندگی اور کارناموں کے بارے میں نئے اور اہم حقائق سامنے لائے ہیں''۔ پروفیسر قمر رئیس نے اپنی آرا کا اظہار کرتے ہوئے بتایا ''منٹو پر ایسی جامع کتاب اب تک اردو میں نہیں لکھی گئی ہے''۔ پروفیسر نارنگ نے اسے حوالے کی بنیادی کتاب سے تعبیر کیا ہے۔ اس قدر ہمہ گیر قبول عام اردو کی بہت کم کتابوں کا مقدر رہا ہوگا۔ جون ۱۹۷۶ء میں آل انڈیا اردو ہندی سنگم کی طرف سے دوسرے پانچ مقتدر ادیبوں کے ساتھ آپ کو اپنی تحقیقی صلاحیتوں کے پیش نظر اردو ریسیرچ ایوارڈ دیا گیا۔

''حرف جستجو'' آپ کے بارہ تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں عملی تنقید سے متعلق چند عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مشرقی اور مغربی انتقادیات کی بہترین روشنی میں اردو کے بعض ادیبوں کی تخلیقات کا اس کتاب میں سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں پریم چند پر تین مقالے، منٹو پر چار اور پریم ناتھ پردیسی پر دو مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ برج پریمی کی مجموعی تنقید سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ محض لفاظیت کا سہارا نہیں لیتے۔ وہ نہایت مختصر اور آسان جملوں میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتے ہیں۔ ان کے تحریر کی لذت سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ہماری ذات کی تہوں کو ان کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ہم میں ''ادب'' کو قبول کرنے کا ایک انوکھا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے۔ یہ جذبہ جو قاری کے روح کی عمیق گہرائیوں میں مستغرق ہوتا ہے اچانک منجدھار کے بھنور سے نکل کر رجحان کے ساحل سے آ ٹکراتا

ہے۔اس ادبی بیداری میں قاری کی ذاتی پسند یا ناپسند کی اہمیت بتدریج کم ہونے لگتی ہے۔ وہ اس کے برعکس تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت اس کے عہد، حالات، جذبات اور تاثرات کی روشنی میں رہتا ہے۔

آپ کے مضامین کا ایک اور مجموعہ ''جلوۂ صد رنگ'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں بھی جموں وکشمیر کے ادب، یہاں کی ثقافت اور عرفان وادراک کے بعض نمایاں پہلو اجاگر کئے گئے ہیں۔اس مجموعے کے ابتدا میں ''میری بات'' کے تحت وہ یوں تحریر کرتے ہیں:

''جہاں میں رہتا ہوں اسے صدیوں سے دھرتی کا سوگ کہا جاتا ہے۔ اپسراؤں کے اس دیس میں گیان وعرفان کے کتنے سوتے پھوٹتے ہیں۔ آگہی و بصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں یہ سب داستانیں منقش ہیں۔ یہ سرزمین شاعر کا تخیل اور معنی کا ساز ہے۔ یہ حسن پرستوں عبادت گاہ ہے۔ستی سر کے نیلے پانیوں کے جلال سے لے کر آج تک اس سورگ بھومی کے پپوٹوں پر کتنے خواب بیدار ہوئے ہیں۔ یہاں بودھوں نے ازلی حسن کی تلاش کی ہندوشو کو کھوجتے رہے اور مسلمان توحید کے یقین سے دلوں کو روشن کرتے رہے۔ یہاں کتنی قوتیں آئیں اور نیست ونابود ہوگئیں۔ یہ سارے نقوش ہماری میراث ہیں''۔

کشمیر شناسی کا یہی عمیق جذبہ ان کے اس مجموعے کے ہر مضمون سے عکس ریز ہوتا ہے۔ممتاز ناقد محمد یوسف ٹینگ اس مجموعے کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں3:

''برج پریمی نے کشمیریوں کے بڑھتے ہوئے قومی شعور اور انفرادی اعتماد کے ساتھ ساتھ اردو قاری کے لئے کچھ انوکھے ناآشنا مگر بے حد شاندار مناظر کی

کھڑکیاں کھول دی ہیں۔انہوں نے کشمیر کی تواریخ وتمدن کے وسیع گوشوں کو کھلی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ کشمیر کی اسطور اور تاریخ میں اتنی گہرائی ہے کہ اس کے صدف توڑنے میں ابھی نہ معلوم کتنے غوطہ خوروں کی ضرورت پڑے گی۔تواریخ کی بھول بھلیوں میں تو بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔ یہ کتاب ان دوستوں کے لئے مفید مشغلہ ثابت ہوگی جو اپنے آپ کو کشمیریات کے پہنچے ہوئے شاستری سمجھتے ہیں''۔

''جلوہ صدرنگ'' بلاشبہ آپ کا ایک اہم کارنامہ ہے جس میں کشمیریت کے طویل سفر کے اچھوتے اور انجانے گوشے روشن ہوئے ہیں۔آپ کا اسلوب اور بات پیش کرنے کا انداز ہ وہی سحر انگیزیت لئے ہوئے ہے جو آپ کے مضامین کا طرہ امتیاز ہے۔فن اور تمدن کے رنگ ہا جلوہ صدر رنگ میں تحلیل ہو کر اسے عرفان کی ایک نئی دستاویز بناتے ہیں۔

''ذوق نظر'' آپ کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔اس میں تحقیق وتنقید سے متعلق گیارہ مضامین شامل ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، منٹو اور کشمیر آپ کی دلچسپیوں کے محور ہیں۔مجموعے میں ذاتی لمس کے ساتھ اردو ادب کی دو بڑی شخصیات کے خاکے بھی پیش کئے گئے ہیں۔آپ کی تحریر اتنی دلکش اور پُر اثر ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے پروفیسر سروری اور طالب کاشمیری کی شخصیتیں ہماری نظروں کے سامنے چل پھر رہی ہوں۔اتنی متضاد الصفات شخصیات پر لکھنا اور ان کے بیرون اور اندرون کی سیر کرانا ایک پیچیدہ عمل تھا جسے آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔یہ شخصی خاکے ہمیں ایک ایسی ہستی کی روحانی بالیدگی سے متعارف

کراتے ہیں جو اجڑی ہوئی ہونے کے باوجود آباد ہے۔

اس مجموعے کے بعض مضامین کافی مختصر اور تشنہ ہیں۔ اس بات کا اعتراف خود انہیں بھی رہا ہوگا۔ دراصل یہ مضامین مختلف اوقات پر ریڈیو کے لئے قلم بند کئے گئے جس کے لئے یہ بالکل ٹھیک اور مناسب تھے۔ لیکن کتابی صورت میں شائع کرانے سے قبل ان میں جس قدر اضافے ہونے چاہئے تھے وہ نہیں ہو سکے ہیں۔ کتاب میں شامل بیشتر مضامین ملک کے معروف رسائل میں پہلے ہی شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ہمارا ادب کے جموں و کشمیر نمبر میں آپ کا ایک اہم تحقیقی مضمون ''آثار قدیمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ تاریخ کے گم گشتہ دھندلکوں میں لپٹے ہوئے کھنڈروں سے جس طرح آپ نے اسرار کے دبیز ئے ہیں۔ وہ آپ لی تحقیقی بصیرت کا روشن ثبوت ہے۔ ''لل دید...... افسانہ یا حقیقت'' پریم ناتھ در'' ریاست میں اردو تنقید، کشمیری لوک گیتوں کا سماجی پس منظر، منٹو اور شراب، منٹو اور فلمیں، دو زاوئے تکون کے، ریاست کے تمدنی ادارے، راجندر سنگھ بیدی اور کلہن اور راج ترنگنی آپ کے بعض دیگر تنقیدی مضامین ہیں جو رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

''چند تحریریں'' ڈاکٹر برج پریمی کی پانچویں تصنیف ہے۔ یہ تصنیف تحقیق و تنقید تجزئے ترجمہ مختصر سفر نامہ، انشائیہ فلم اور بعض کہانیوں کا ایک حسین گلدستہ ہے۔

اس مجموعے پر شیرازہ میں تبصرے کرتے ہوئے منظور احمد بابا لکھتے ہیں4:

''اس مجموعے میں اردو ادب کے ہلکے اور گہرے رنگوں کی آمیزش سے ایک خوبصورت قوس قزح بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحریروں میں مصنف کے مختلف اور بدلے ہوئے Styles ملتے ہیں یہ بدلے ہوئے رنگ و

روپ ان کی شخصیت کے مظہر ہیں۔ جس کی وجہ سے چند تحریریں مصنف کی جلوۂ

تمثال ذات ہوگئی ہے......"

اس کتاب کے ابتدائی مضامین تحقیقی و تنقیدی مزاج کے حامل ہیں۔ مزید دو مضامین سعادت حسن منٹو سے متعلق ہیں۔ ان مضامین سے مصنف کی وسعت نظری اور تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اسلوب کی شناخت بھی ہوجاتی ہے۔ یہ اسلوب براہ راست محسوس کرنے والا اسلوب ہے جس کی بے ساختگی اور شگفتگی قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ سادا، سلیس، غیر پیچیدہ اور معلوماتی انداز سیدھا پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ "سفر نامہ گوا" میں نثر کی شگفتگی اور برجستگی ایک نیا ترنم لے کر آتی ہے۔ اس نثر میں تعمیری حسن کے علاوہ علمیت اور شعریت کا امتزاج بھی ہے۔ ایسی لطیف نثر صرف برج پریمی کا حصہ ہوسکتی ہے۔

یہ صاحب طرز قلم کار معمولی علالت کے بعد ۲۰/اپریل ۱۹۹۰ کو اپنے آخری سفر پہ روانہ ہوئے۔ ان کی اچانک موت سے آن جہانی کی بعض زیر تکمیل کتابوں اور مسودات کے منصوبے دھرے رہ گئے۔

---

1 ذوق نظر صفحہ ۱۴۳

2 کشمیر میں اردو: سروریؔ

3 جلوہ صد رنگ پیش گفتار صفحہ ۷

4 شیرازہ مئی ۱۹۸۹ء صفحہ ۸۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مقبول حسین

مقبول حسین کشمیر میں اردو کی ادبی صحافت کے ایک ایسے تناور درخت تھے جس کی عظیم چھاؤں میں کتنے ادیبوں نے جنم لیا اور جوان ہو گئے۔ کتنے قارئین نے آپ کی ادبیاتی نثر کا مطالعہ کیا اور اس کی مدد سے اپنے شعور کی تربیت کی۔ لیکن خود مقبول حسین اپنی صحافتی زندگی سے پہلے کافی عرصہ تک خوابوں کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ تخلیق انہیں خوابوں کے ایک سلسلے سے نکال کر ایک دوسری سطح پر لا کھڑا کرتی۔ آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک مدرس کی حیثیت سے کیا تھا لیکن پھر بہت جلد اس پیشے کو چھوڑ کر آپ مختلف اخبارات سے وابستہ ہو گئے۔ ایک بار جب آپ نے حقیقت کی کھردری زمین پر جڑ پکڑ لئے تو خوابوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر صداقت کے ستاروں پر کمندیں ڈالتے رہے اور پھر اپنی آخری سانس تک اپنے قلم سے اسی صداقت کی تفسیریں رقم کرتے رہے۔ ان کے نحیف سے بدن میں اظہار کی آگ کچھ اِس شدت سے بھڑکتی تھی کہ سننے والے کو اپنی ہستی کے بھسم ہونے کا خدشہ ہوتا تھا۔ ان کی آنکھوں کی چمک میں صحافت کے شبستانوں کی ساری داستانیں حرف بہ حرف پڑھی جا سکتی تھیں۔ مقبول حسین کے اردو نثر کی انفرادیت مسلمہ ہے اور اس کے

گہرے نقش کشمیر میں صحافت شناسوں کو نئی راہیں دکھاتے رہیں گے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۹۰ء کو آپ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے لیکن ادبی صحافت کے حوالے سے ان کے چھوڑے ہوئے ساغر و مینا آج بھی چھلکے چھلکے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ طالب کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

کلدیپ رعنا

۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں نئے موضوعات اور نئی تحریکوں نے ابھرنا شروع کیا۔ ملک کے دیگر حصوں کی طرح ہماری ریاست میں بھی ادیب نئی سمتوں کی نشان دہی میں محو ہوئے انہوں نے بھی ادب کے نئے معیار اور میزان کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنے منتشر صفوں کی نئے سرے سے شیرازہ بندی کرنی شروع کی۔ اس تحریک نے جو نئے نام سامنے لائے ان میں کلدیپ رعنا کا نام سب سے اہم ہے۔ کلدیپ رعنا کا اصلی نام جانکی ناتھ رینہ تھا۔ آپ ایک دیہی پس منظر میں پروان چڑھے۔ آپ کے رومان میں ڈوبے ہوئے بعض ابتدائی افسانے مقامی روزنامہ آفتاب اور خدمت میں شائع ہوتے رہے۔ اگر چہ یہ ایک نو آموز فن کار کی ابتدائی کاوشیں تھیں لیکن ان کے اسلوب اور ان کی زبان سے قارئین چونک اٹھتے تھے۔ دراصل یہ ایک نیا لہجہ تھا جو اپنے تابناک مستقبل کی بشارت دے رہا تھا۔ کلدیپ رعنا کی تخلیقات ان دنوں مندرجہ بالا اخبارات میں پابندی سے شائع ہوتی رہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا نام اجنبی نہیں رہا۔

آپ نے ۱۹۶۸ء کے آس پاس اردو میں ایم اے کیا۔ آپ نے

ڈاکٹریٹ کے لئے ''پریم چند کے بعد اردو افسانہ'' کے موضوع پر کام کرنا شروع کیا۔ اسی دوران آپ کا تقرر ریڈیو میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے ہوا۔ اس زمانے میں آپ کی جتنی بھی کہانیاں شائع ہوئیں ان میں پریم چند کا پرتو جابجا موجود ہے۔ لیکن آپ نے ایک بار پھر اپنی روش بدلی اور ادبی افق پر پھیلتے جدید میلانات اور رجحانات کو اپنے فن میں سمو کر بعض بہت ہی خوب صورت افسانے تخلیق کئے۔ ان میں ''ایک خط ایک گیت، زندگی'' جیسے کئی ایک افسانے شامل ہیں۔ آپ کی تصنیف ''ادھورے خواب'' شیخ غلام محمد نے ۱۹۶۵ء میں سرینگر سے شائع کرائی۔ عین شباب میں آپ کی موت کے باعث آپ کی متعدد تحریریں منتشر رہ گئیں اور آپ کے احباب کی کاوشوں کے باوجود ان کی شیرازہ بندی کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان اور کمال احمد صدیقی کی مساعی جمیلہ سے صرف بعض پرانی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''تنہائیاں ۱'' شائع ہو سکا۔ مجموعے میں گیارہ افسانے اور ایک ڈرامہ ''نرگس کے پھول'' شامل ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں میں رومان پرور فضا ملتی ہے جو کردار ملتے ہیں وہ رومانیت سے سرشار ہیں۔ لیکن اس رومان میں حقیقت کی روشنی بھی ہے۔ آپ نے ہم عصر اردو کہانی کے تکنیکی تجربوں سے فائدہ اٹھایا ہے چنانچہ ''طلسم'' جیسے افسانوں میں کہانی کا بہاو دیکھ کر جدید مغربی رقص کا خیال آتا ہے کیونکہ اس کے مزاج میں ایسی ہی تیزی اور شدت ملتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ایک ایک انگ کو پھڑکایا ہے۔ افسانہ حیرت کے عنصر کو پیش کرتا ہے۔ کلدیپ رعنا نے اپنے مکالموں میں فطری رنگ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں فطری بہاؤ ہے۔ کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں۔ اس طرز کی بہترین کہانی ''نفرت'' ہے جو مکالموں کی تکنیک میں ہی

تحریر کی گئی ہے۔ بھوک اور سپنا میں آپ نے ایک خاص طبقے کی عکاسی کی ہے۔ معاشرے میں نہ جانے ایسے کتنے شغو پروان چڑھتے ہیں جن کے رجحان پر ان کا ماضی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ اگرچہ اس افسانے کا موضوع اچھوتا نہیں ہے۔ تاہم مصنف نے اس افسانے کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

کلدیپ رعنا ایک صاف ستھرے اسلوب بیان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ''ایک شال سرخ رنگ کا'' عنوان کی کہانی میں ایک طالبہ کے پیچیدہ احساسات کی ترجمانی نہایت مہارت سے کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ کلدیپ رعنا کی صلاحیتوں کی بشارت کا نقیب تھا۔ لیکن اس ہونہار افسانہ نگار کی بے وقت موت نے ان امکانات کے چراغ بجھا کے رکھ دئے۔

---

1 اس مجموعے کو ''جھرنا'' دارالاشاعت نے ''بکھرے خواب'' کے نام سے شائع کرایا (آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

عزیز احمد قریشی

ڈاکٹر عزیز احمد کا بنیادی موضوع اگر چہ دینیات ہے تاہم انہوں نے اردو تنقید کے شعبے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی حاصل کرنے کے بعد آپ کی جو اولین تخلیق ناقدین کی توجہ کا مرکز بنی وہ کتاب تھی ''جدید تنقیدی زاوئے''۔ نئے تنقیدی دبستاں سے تحریک حاصل کر کے آپ نے ادب کا تجزیہ نفسیات معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی میں کئے جانے پر اصرار کیا۔ اس نئے ذہنی روئے نے پہلے ہی تنقید کے زاوئے بدل کے رکھ دئے تھے۔ ڈاکٹر قریشی نے اس اس ضمن میں نئے معیار اور میزان متعین کر کے تنقید کے شعبے کو نئی روشنی بخشی۔ طالب علموں کی ضروریات کا اس میں بہ طور خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ''ہماری قومی اور انقلابی شاعری'' ان کی ایک اور کتاب ہے۔ اس میں بھی ڈاکٹر عزیز نے خاصا مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے ترتیب و تنظیم کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''حضرت عیسیٰؑ و عیسائیت، اور بین الاقوامی مذہب کے اصول'' آپ کی دوسری کتابیں ہیں۔ آپ کی تازہ ترین کتاب ''شاعری میں مناظر قدرت کی عکاسی'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں مناظر قدرت

کا اتنا ہی تذکرہ شامل ہے جتنا پابند شاعری میں آیا ہے۔ تاہم ان کی تنقید میں جدید حسیت اور انگریزی زبان و ادب سے گہری واقفیت جھلکتی ہے۔ مناظر قدرت اور شاعری کے موضوع پر اس کتاب کے مطالعہ سے شعر و ادب کے رموز سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب سے ایک اقتباس:

''شیلے'' Shelly '' لیرک'' Lyric '' کی سلطنت کا مطلق العنان حکمران ہے۔ انگریزی میں سوائے اس کے اور کوئی ہمارے شعرا کے مقابلے پر نہیں آسکتا۔ شیلے کی بلندی تخیل کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اٹلی میں عربی اور فارسی کے مشرقی تخیل سے روشناس کرایا گیا۔ اس کی مشہور نظم ''بادل'' میں شیلے بادل کے فوائد اور حسن و جمال کو سیدھی زبان میں ادا نہیں کرتا۔ وہ صحرائے افریقہ کے ایک بوڑھے ساحر کی طرح سحر پھونکتا چلا جاتا ہے اور نئے نئے نظارے آنکھوں کے سامنے پلٹتے جاتے ہیں۔ وہ خواب آگیں پتوں کے لئے نور لاتا ہے۔ اس کے شبنمیں پروں میں سے قطرے نکل نکل کر کلیوں کو جگا رہے ہیں۔ شیلے یہ طلسم ژالہ باری، برف باری، رعد، گرج، برق، سمندروں اور جنات کے جوش و خروش کے ذریعہ ہویدا کرتا ہے۔ اس کا حیرت انگیز تخلیل آسمانوں کی پہنائیوں تک پہنچتا ہے اور چاند ستاروں کے عجابیات دکھاتا ہوا دریاؤں اور جھیلوں کی تصویروں کو فنکارانہ چابکدستی سے کھینچتا چلا جاتا ہے......''

یہ ایک اقتباس ہی اس بات کا غماز ہے کہ ڈاکٹر عزیز کی علمیت میں کس قدر جامعیت ہے۔ لیکن ان کی کتابوں میں کتابت کی ان گنت غلطیاں ملتی ہیں۔ شاید

انہیں یکے بعد دیگرے اپنے علمی اور نثری کارناموں کا انبار لگانے کے دوران اپنے مسودے کی تصحیح کا پورا موقع نہیں ملا ہے۔ اس سہل انگاری نے کہیں کہیں آپ کی ریاضت کا مقصد ہی فوت کر کے رکھ دیا ہے۔ تاہم آپ کے نثری کارناموں نے فکر و بصیرت کی جو شمعیں روشن کی ہیں اس سے ادب کے طلبہ بہت دیر تک مستفیض ہوتے ہوں گے۔

---

1 مناظر قدرت کی عکاسی: ڈاکٹر عزیز احمد ص ۱۳۹

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

کاچوسکندر خان

کاچوسکندر خان کرگل کی ایک معتبر علمی وادبی شخصیت ہے آپ سرزمین لداخ کی اُن چند گنی چنی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے تحقیق کے خارزاروں میں پیہم صحرانوردی کی ہے۔ کاچوسکندر خاں نے تبت کی مشہور داستاں ''نور بوزانگپو اور اتھ ٹھوق لہامو'' کو نہایت عرق ریزی کے بعد اردو لباس میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس داستاں کو اکثر ڈرامائی روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر لداخ کے دور دراز دیہات میں سٹیج کیا جاتا ہے۔ نور بوزانگپو کی یہ تصنیف تبّتی میں سوانح عمری کی صورت میں ہے۔ دراصل یہ داستاں ''سدھانا جٹا کا'' سے ماخوذ ہے لیکن اسے تبّتی مزاج اور ماحول کے سانچے میں ڈھال کر ایک نئی صورت دی گئی ہے۔

کاچو صاحب کی تازہ تصنیف ''قدیم لداخ تاریخ وتمدن'' ہے۔ یہ لداخ کی تاریخ پر اردو میں تحریر کی جانے والی ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ اردو میں اس موضوع پہ چوتھی اور انگریزی وبودھی میں بالترتیب دوسری اور تیسری تصنیف ہے۔ بڑی تقطیع میں ۳۳۷ صفحات پہ پھیلی ہوئی یہ ضخیم کتاب لداخ شناسوں کی توجہ کا مرکز

بن گئی ہے۔ لداخ کے مقتدر محقق و ادیب جناب عبدالغنی شیخ کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''اس کتاب میں لداخ اور بلتستان کی تاریخوں کے علاوہ ان خطوں کے تمدن پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تصنیف اپنے نفس مضمون پر کاچو صاحب کی اچھی کوشش ہے اور ان کی محنت قابل ستایش ہے۔ کتاب کے شروع میں لکھا گیا ہے کہ کتاب ہٰذا اُن کی عُمر بھر کی محنت اور جستجو کا حاصل ہے''۔

کاچو صاحب نے پہلے لکھی گئی تاریخی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر فرانکی اور وزیر حشمت اللہ کی کتب بھی شامل ہیں۔ خاص طور سے بلتستان، کرگل، اور زانسکار سے متعلق ان کا مواد لگ بھگ سارا وزیر حشمت اللہ کی تاریخ جموں وکشمیر لداخ وبلتستان سے ماخوذ ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کاچو صاحب کی تصنیف مذکورہ مؤرخوں کی کاربن کاپی ہے۔ کاچو صاحب کے ''قدیم لداخ'' کا اپنا اہم Contribution ہے۔ کاچو صاحب نے لداخ کے آثار قدیمہ لوک گیتوں اور دیومالاؤں کا خوبصورتی سے تجزیہ کیا ہے جن کے بہ غور مطالعہ سے تاریخی حقایق کا تعین ہو جاتا ہے۔ انہوں نے دردوں کی تہذیب وتمدن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے......''

یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ''قدیم لداخ'' میں ارض پوریگ کے تمدن اور رسومات کے متعلق بعض دلچسپ باتیں پہلی بار منظر عام پر آ گئی ہیں۔ مختلف لوک گیتوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے جن سے اس سرزمین کی ثقافت کا بھرپور تاثر

ملتا ہے۔ کاچو صاحب کی زبان سلیس، فصیح اور دلچسپ ہے۔ زبان و بیان کی اس ندرت نے بھی کتاب کی مجموعی جاذبیت اور اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مولوی محمد فاروق

آپ نے ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو میرا واعظ منزل ۱ سرینگر کے دینی اور علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ دینیات اسلامیات اور عربی لٹریچر میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور پھر میر واعظ کشمیر مولانا عتیق اللہ صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۶۲ء میں آپ ریاست کے نایب میر واعظ مقرر کیے گئے۔ اسلاف کی عظیم روایات کے اس سچے امین نے میر واعظ رسول شاہ صاحب، محمد یحییٰ صاحب اور میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہؒ کی دینی اور علمی عطا کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ عصر جدید کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اس میں حقیقت پسندی کے نئے رنگ بھر دئے۔ افلاس اور جہالت کے اندھیرں میں اہل کشمیر کے لئے تعلیمی اور دینی خدمات کے جو ستارے میر واعظ خاندان میں یکے بعد دیگرے روشن ہوئے تھے۔ تبلیغ دین اور تشہیر علم کے اس بیکراں آسمان پر مولوی محمد فاروق ایک درخشندہ آفتاب کی طرح ابھرے۔

مولانا رسول شاہؒ کے قائم کردہ ''انجمن نصرت الاسلام'' جیسے عظیم ادارے کی عملی بازیافت کے ساتھ آپ نے اردو میں ایک جریدہ بھی جاری کیا۔ ''نصرت الاسلام'' جیسا پابندی سے شائع ہونے والا معتبر ماہوار جریدہ آپ ہی کی نگرانی میں

شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی تحریریں تاریخی اخلاقی اور ادبی اقدار کی آئینہ دار رہی ہیں۔ اس کے صاف اور شستہ مضامین برسہا برس سے ملت کی خاموش خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ ارضِ کشمیر سے شائع ہونے والے بعض منفرد رسائل میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا اعجاز ہے کہ اس ادارے کی سنگ وخشت کی بڑی بڑی پرسطوت عمارات محض کتابی تعلیم کے حصول کا ذریعہ نہیں رہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اصلاحی سرگرمی کا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

۱۹۷۰ء میں آپ نے اسی ادارے کے شعبہ اشاعت وطباعت کے زیر اہتمام مولانا محمد یوسف شاہؒ کا قرآن مجید کا کشمیری ترجمہ وتفسیر شائع کرایا۔ اس ترجمے کے ''عرض حال'' کی تحریر آپ کے پاکیزہ اور خوش بیان نثر کی غماز ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو2:

''مسلمانو! یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ اس نعمت غیر مترقبہ سے کما حقہ مستفید و مستفیض ہونے کی ہم کوشش نہیں کرتے۔ ہمارے ہر مرض کی دوا اسی نسخہ کیمیا میں موجود ہے۔ ہم ادھر ادھر کیوں بھٹکتے پھر رہے ہیں جب کہ دین اور دنیا کی فلاح وصلاح کا خزینہ اسی میں موجود ہے۔ ہدایت وسعادت کا دریا ہمارے گھروں میں بہہ رہا ہے اور ہم مشرق ومغرب کے جوہڑوں کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہم قرآن حکیم کو پھر ایک بار اپنے سینوں سے لگالیں تو مصائب وآلام کے سارے بادل چھٹ جائیں گے''۔

وقت کی بھٹی میں آپ کی ہمہ پہلو شخصیت کندن بن کر نکھر اٹھی۔ آپ کے وجیہہ چہرے کی سرخ وسپید رنگت میں جو سحر انگیز وقار جھلکتا تھا وہی جلال و جمال

آپ کی آواز کا طرہ امتیاز بھی تھا۔ آپ کی صداؤں میں مجاہد کی ضرب اور مدبر کا کرب تھا۔ سیاسی زندگی کے ہر بلند و پست میں جامع مسجد سرینگر کے منبر ومحراب آپ کی شیریں گفتاری اور شیریں سخنی سے گونجتے رہے۔ یہ ایک باکمال خطیب و مقرر کا دورِ شباب تھا۔ ان خطبات کی بے پناہ مقبولیت نے ہی بلآخر انہیں اس بات کی تحریک دی کہ انہیں اسلامیان کشمیر کی مجموعی آگہی کے پیش نظر ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔

چنانچہ ''اسلام کا آفاقی پیغام'' خطبات و مواعظ کا پہلا مجموعہ تھا جو ادارہ تصنیف وتالیف کے اہتمام سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک جادو بیان خطیب کی سنجیدہ کاوشوں کا نقش اول ہے۔ اس کتاب کا بیشتر مواد میر واعظ خاندان کے مرتب کئے ہوئے عربی اور فارسی کی قلمی بیاضوں سے ماخوذ ہے جنہیں وہ سالہا سال سے بامحاورہ کشمیری زبان میں عوام کے سامنے بیان کرتے آئے تھے3۔ اس کتاب کے قبول عام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب میں ظاہر کئے گئے خیالات کی موثر ترسیل کے لئے اس کا ہندی ترجمہ کیا گیا جو بعد کے برسوں میں ''اسلام کا سندیش'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ مولوی محمد فاروق کی برسوں کی ریاضت، عرق ریزی اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا گیا مجموعہ ہے اور اسے بلاشبہ ایک نوآموز نثر نگار کا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۹۸۷ء میں ''اسلام کی بنیادی تعلیمات'' کی اشاعت کے ساتھ ہی مولوی محمد فاروق ایک کامل ادیب و انشاپرداز کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ اس

کتاب کی اہم خصوصیت اس کا خطیبانہ اندازِ بیان ہے۔ اندازِ بیان صاف ستھرا سلیس اور عام فہم ہے۔ لہجہ کہیں کہیں شعریت اور ادبیت سے لبریز ہے۔ جو اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ مصنف کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے تشریح و تبلیغ کی جو بات بھی کی ہے وہ سلیقے نفاست سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

''اسلام کے احسانات'' آپ کی آخری یادگار اور تحقیقی تصنیف ہے۔ چار سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب ۱۹۹۱ء میں شائع کی گئی۔ اس کے بعض ابواب کے عنوان اس طرح ہیں:

اسلام کی دو مقدس تقاریب (عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ) اسلام کی تین نورانی راتیں (شب معراج، شب برات، شب قدر) اسلام اور اولیائے کرام۔ اسلام اور مسلم پرنسپل لاء۔ اسلام کا ظہور اور انقلاب عالم، اسلام کی نئی نسل کا فکری رجحان، اسلام کے شاعر علامہ محمد اقبالؒ۔ بعض اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

''اقبال قدیم و جدید کے سنگم تھے۔ وہ اسلام اور اس کے دئے ہوئے آئین حیات کو دنیا کے سارے سیاسی مسائل و معاشی خلفشار کا واحد حل سمجھتے تھے اور اسی عقیدہ صافی کی بنا پر وہ ہر سیاسی نظام کو خواہ اس کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے انسانی معاشرے کے لئے مہلک خیال کرتے تھے''۔

''دین اسلام جو انسانی فطرت کا ساز اور اس کے ضمیر کی آواز ہے اس کے ظہور کا مقصد ہی یہ ہے کہ مادہ پرست اور زخم خوردہ دنیا کو اخلاق و روحانیت کا وہ آب زُلال پلائے اور اس چشمہ صافی سے سیراب کرے اور انسانیت و شرافت کے وہ بیج اس کے اندر بوئے کہ اس میں ایک حیات نو پیدا

ہواور اس دھرتی کے بطن پر انسانیت سکھ چین اور آرام کی سانس لے سکے''۔

''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی'' اس کتاب کے اپنے تعارف میں یوں رقم طراز ہیں:

''واعظین کرام اور خطباء ملت کا بڑا وصف زور خطابت سمجھی جاتی ہے اور عام طور پر دینی خطبات کے مجموعوں کا یہی مشترکہ وصف ہے۔ عام طور پر ان خطبات میں سطحیت، جذباتیت اور عوام کو متاثر کرنے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ لیکن اس کلیہ کے استثنات میں میر واعظ کشمیر کے یہ تینوں مجموعے آتے ہیں۔ اس مجموعے کے عنوانات ہی صاف بتاتے ہیں کہ وہ محض چلتی ہوئی تقریریں اور برجستہ عوامی خطابات نہیں ہیں بلکہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فکر و مطالعہ پر مبنی ہیں۔ یہ مضامین اپنی اثر انگیزی، دینی رہنمائی اور علمی ترغیب و تاثیر کے ساتھ قارئین کی معلومات میں اضافہ اور ان مقاصد اور پہلوؤں کو جن کو واضح کرنے کے لئے یہ خطبات دئے گئے ہیں ذہن نشین کرنے کے ساتھ سامعین کے فکر کی تصحیح اور اس کو صحیح رخ دینے کا کام بھی کرتے ہیں''۔

۲۱ رمئی ۱۹۹۰ کو کشمیر کے مستقبل کا یہ ارغوانی عنوان بجھا دیا گیا۔ اس بیہمانہ قتل نے مولانا کے لاکھوں عقیدت مندوں کو خون کے آنسو رلایا۔ اس المناک وفات کے ساتھ ہی کشمیر میں دینی اور علمی نثر کے نہ جانے کتنے باب تشنہ تکمیل رہ گئے۔ شہید ملت کی قیادت کے بغیر تبلیغ و تحقیق کی محفلیں اجڑ کے رہ گئیں۔ اس شیریں سخن اور باکمال خطیب کی سحر آفریں آواز سننے کے لئے

جامع مسجد کے منبر ومحراب آج بھی ہمہ تن گوش ہیں۔

جس کی تقریروں سے لذت گیراب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

---

1 میر واعظ وادی کشمیر کا ایک تاریخی گھرانہ ہے جو صدیوں سے کشمیر کی سیاسی وسماجی زندگی میں ایک اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ میر واعظ دراصل ایک خطاب ہے جو موثر بیانی کی وجہ سے عوام نے دیا ہے۔ اس خاندان کے اسلاف کا تعلق ان مبلغین سے بتایا جاتا ہے جو حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے ہمراہ ہمدان سے آئے تھے۔ (آزاد)

2 بیان الفرقان: عرض حال: فاروق ابن امین

3 محمد سعید الرحمان شمس: حرف آغاز صفحہ ۱۱

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

صوفی محی الدین

پریم ناتھ بزاز، شمیم احمد شمیم، فاروق رحمانی، عاشق کشمیری ایسے نبض شناس صحافی ہیں جن کے بے باک قلم نے آندھیوں میں چراغ جلائے۔ صوفی محی الدین بھی پچھلی یک چوتھائی صدی سے صحافت سے عملی طور وابستہ رہے ہیں۔ لیکن وہ ایسے گنے چنے صحافیوں میں شامل ہیں جنہوں نے اس پیشے کو محض کاروباری انداز میں نہیں اپنایا بلکہ اس کے ساتھ ذہنی اور جذباتی طور وابستہ رہے۔ دراصل صوفی محی الدین کو اس صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے دوران ریاست کے بعض ممتاز قلم کاروں کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا۔ اس جمیعت میں علی محمد لون، قیصر قلندر اور پران کشور ایسے فنکار شامل تھے۔ اس سے قبل متوسط گھرانے کے اس خاموش طبع نوجوان نے کالج کی تعلیم کے دوران ہی اپنے ادبی ذوق کا اظہار شروع کردیا تھا۔ چنانچہ ایس پی کالج میں ''حلقہ اربابِ ذوق'' نام کی ادبی تنظیم کی جو محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں صوفی محی الدین بھی اپنی کہانیاں سناتے تھے۔ اس دور میں تحریر کردہ آپ کے بعض افسانے بیرون ریاست کے کچھ ادبی جرائد میں بھی شائع ہوئے۔ چنانچہ ''جوانی کا جنازہ'' عنوان سے تحریر کردہ آپ کا اولین افسانہ ''ادبِ

لطیف'' میں شائع ہوا۔ اپنے کیریر کے اسی موڑ پر آپ نے صحافت کے پیشے کو اختیار کیا اور اس طرح آپ کی ادبی شخصیت گویا نا تمام رہ گئی۔

روزنامہ ''سرینگر ٹائمز'' میں ایک کالم نویس کی حیثیت سے آپ برسوں تک کام کرتے رہے۔ آپ کے کالم میں حقائق کا دوٹوک اور صحافیانہ انداز صاف جھلکتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں زبان و بیان کی نفاست اور حقائق کے پس پردہ پنہاں افسانوں کا بھی احوال بیان کیا جاتا تھا۔ ادب اور صحافت کا یہ امتزاج آپ کی تحریروں میں بلا کی جاذبیت بھر دیتا۔ اسی دوران ۱۹۷۳ء میں آپ کی کتاب ''جموں وکشمیر کی صحافت'' شائع ہوئی۔ یہ ریاست میں اردو صحافت کی تاریخ پہ تحریر کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ یہ ایک دقت طلب موضوع تھا جسے آپ نے برسوں کی عرق ریزی کے بعد ترتیب دیا۔ مختلف ادوار میں مقامی اخبارات کے کیا رنگ ڈھنگ رہے۔ اخبارات کی طرز تحریر، ان کی پالیسی اور ان کے مدیروں کا کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ''اخبار نویسوں پہ مقدمے، اخبارات سے ضمانت طلبی، ایڈیٹروں کی گرفتاریاں اور ایسی دوسری سرخیوں کے تحت مصنف نے واقعات کو ان کے اصل رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس زمانے کے صحافتی رجحانات کی ایک Outline پیش کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں صوفی محی الدین کی ایک اور کتاب ''کشمیر ۱۹۳۱ء سے ۱۹۷۱ء تک شائع ہوئی۔ یہ ایک سیاسی کمینٹری ہے۔ جس میں اس دور کے سیاسی کرداروں کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان ہی ایام کے دوران آپ نے اپنا نامکمل اردو ناول ''بکھر گئے تنکے'' مکمل کیا، لیکن آپ اس ناول

کو ابھی تک شائع نہیں کرا سکے ہیں۔ آپ نے ۱۹۸۳ء میں اپنا جو اخبار ''شہمیر''
شروع کیا تھا اس کی اشاعت اب بہت عرصے سے بند ہے۔

---

1 اس فہرست میں ایک اہم نام میدان صحافت کے منفرد جانباز ''محمد شعبان وکیل'' کا بھی ہے۔ جنہوں نے اپنے مقدس اصولوں کی سربلندی کیلئے شہادت کا جام نوش کیا۔ یہ شعبان صاحب مرحوم کی بے باکی کا ہی اعجاز تھا کہ ان کا اخبار ''الصفانیوز'' نہایت قلیل وقت میں وادی کا مقبول ترین روزنامہ بنا۔ انہوں نے Establishment کے قصیدہ خواں معاصرین کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا اور وہ بھی صحافت کے اس مجاہد کی تقلید کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن ان کی مصلحت اور عافیت انہیں حقیقت کے اظہار سے پھر بھی روکتی رہی اور شعبان صاحب بلاخوف وخطر ایک بے رحم جراح کی طرح معاشرے کے مریض جسم پہ اپنے قلم سے نشتر چلاتے رہے۔ ان کی شہادت کا سانحہ ایوانِ صحافت کے یاران نکتہ داں برسہا برس تک فراموش نہیں کر پائیں گے۔ وہ خود ٹوٹ گئے لیکن کسی جبر وقہر سے خوف زدہ ہر کر اپنا قلم نہیں توڑا

نہ رہا جنون رخ وفا، یہ رسن یہ دار کروگے کیا
جنہیں جُرم عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے
(جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

پُشکر ناتھ

پُشکر ناتھ دور حاضر کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ حالیہ برسوں کے دوران ان کے ہم عصر کہانی کاروں میں بہت کم لوگوں نے افسانہ نگاری کے ارتقا کی اتنی زیادہ منزلیں طے کی ہوں گی۔ ان کے نو افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اندھیرے اجالے'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ رومان نگاری کے واضح رجحانات کے باوجود اس مجموعے کے بعض افسانوں میں فطرت کی نزاکتوں اور غربت کی مجبوریوں کا ایک فن کارانہ تضاد نظر آتا ہے۔ ان کا بارہ افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ''ڈل کے باسی'' معنویت اور اسالیب کی بھٹی سے تپ کر کندن کی طرح دمک اٹھا۔ اب ان کا مشاہدہ عمیق تھا اور انہوں نے گرد و پیش کی زندگی کے بحران اور رشتوں کی کشاکشی کا سارا کرب اپنے افسانوں میں سمولیا۔ وہ اب سطحی جذباتیت کی قید و بند سے آزاد ہو کر حقیقت کی تفہیم کے عمل میں سرگرم ہو گئے۔ ان کے افسانوں میں نئی خود شعوریت کا احساس پروان چڑھنے لگا۔ ''نیلے امبر تلے'' اس مجموعے کی ایک اہم کہانی ہے جس میں وادیٔ کشمیر کی سیاحت پر آنے والے بیرونی سیلانیوں کی عیش و عشرت کا ذکر کیا گیا ہے جو ثروت و امارت کے نشے میں چور ہو کر مقامی مزدوروں سے جابرانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔

''پشکر ناتھ'' کے ان دونوں مجموعوں پر ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انہیں انعامات سے نوازا۔ یہ ایک بااعتماد اور باعزم کہانی کار کی فن کارانہ صلاحیتوں کا ایک اعتراف تھا۔ اس دوران بیسویں صدی، شیرازہ، ہمارا ادب اور دیگر معتبر قومی سطح کے رسائل میں آپ کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ ان میں ''نوری بھی ناری بھی، میری گلی کا کتا اور پردہ نشین'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان کے افسانوں کا تیسرا اور تازہ ترین مجموعہ بارہ سال کے طویل عرصے کے بعد شائع ہوا۔ ''عشق کا چاند اندھیرا'' کے عنوان سے شائع ہونے والا یہ مجموعہ کتابت وطباعت کا ایک حسین مرقع بن کر سامنے آیا۔ اس میں مجموعی طور تیرہ افسانے شامل ہیں۔ یہ ان کے طویل تخلیقی سفر کا ایک سنگ میل ہے۔ ان افسانوں میں عمل اور فکر کا دائرہ اگرچہ وہی ہے جو اس سے پہلے کے افسانوں کا تھا۔ لیکن اب افسانہ نگار کی نظر میں گہرائی آ گئی ہے۔ وہ عصری آ گہی، اعصابی تناو کی شدت اور معاشرے کی بے چینی اور بے حسی کا نفسیاتی اور فن کارانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ ''عشق کا چاند اندھیرا'' افسانے کا یہ اقتباس ان کے زبردست مشاہدے اور مطالعے کا غماز ہے۔

''پہلے ڈاکو چنبل کی گھاٹیوں میں رہا کرتے تھے۔ اب ڈاکو نئے چہرے اور نئی پوشاکیں پہن کر تاج انٹر کانٹی نینٹل یا اوبرائے شیراٹن کے شیش محلوں میں رہتے ہیں اور وہی دھندا کرتے ہیں۔ اب حاکم کھدری کی سفید پوشاکیں پہن کر دیسی انجینئر کی بنائی ہوئی چودہ منزلہ بلڈنگ کی بلندی سے ان گنت لوگوں کے کپڑے اتار کر نئے وعدے دیتے ہیں''۔

اسی مجموعے کے ایک اور افسانے ''سات رنگ کا سپنا'' میں تحریر کرتے ہیں۔

میں ایک بے ضرر سا آدمی ہوں بے ضرر اس لئے ہوں کہ میرا دل اس دنیا میں نہیں لگتا جوان درختوں سے نیچے اور پاتال کی دنیا کے اوپر آباد ہے۔ کبھی میں بھی اسی دنیا کا رہنے والا تھا۔ میں نے بھی اسی دنیا کی ایک گلی میں آنکھ کھولی تھی۔ پھر گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا۔ پھر گلی کے بچوں کے ساتھ سرکاری اسکول جانے لگا تھا۔ پھر چھوٹی بڑی جماعتوں سے گزر کر کالج پہنچا تھا۔ پھر چوری چھپے پہلی بار سنیما دیکھنے گیا تھا۔ پھر کالج کے میدان، میں پہلی بار سگریٹ پیا تھا اور گھر آتے آتے راستے میں بھی نل ملا تھا وہاں بار بار اپنا منہ دھویا تھا کہ سگریٹ کی بو باقی نہ رہے۔

گلی محلے والے میرے ماں سے کہتے تھے کہ تمہار بیٹا نہایت شریف ہے اور میں یہ سن کر اتنا خوش ہوتا تھا کہ ساری عمر شریف ہی بنا رہا اور اسی شرافت میں آخرکار مارا گیا''۔

بیسوی صدی کے ۱۹۶۵ء کے سالنامے میں ''میرا گھر...... میرا ماحول'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''میری گھریلو زندگی ویسی ہی ہے جیسی اکثر لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس میں وہ سب اتار چڑھاو ہیں جو عام طور پر گھریلو زندگیوں میں ہوتے ہیں۔ دن کا بیشتر حصہ سرکار کی نذر کر کے شام کو گھر لوٹتا ہوں تو اطمنان سے پاجامہ پہن کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کرسی پر نہیں فرش پر جیسا ہم کشمیریوں کا رواج

ہے۔ چونکہ مکان مختصر ہے اس لئے ایک طرف بچے اودھم مچاتے ہیں ریڈیو بجتا رہتا ہے گلی کا شور کانوں کے پردے پھاڑتا رہتا ہے...... اور ایک طرف میں اپنی کتابیں لئے بیٹھا رہتا ہوں بیٹھے بیٹھے رات کے ڈیڑھ دو بج جاتے ہیں...... میری بیوی ایک کٹر قسم کی دھارمک خاتون ہیں۔ اس بھلی عورت نے آج تک میرا ایک بھی افسانہ نہیں پڑھا ہے......''

عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' (تیسرا حصہ) میں پُشکر ناتھ کی تاریخ پیدائش ۱۹۳۲ء بتاتے ہیں۔ جب کہ وہ ۳۱ مئی ۱۹۳۴ء کو سرینگر کے ایک کھاتے پیتے تکو خاندان میں پیدا ہوئے۔ اکاونٹنٹ جنرل کے محکمے میں ملازم ہوئے اور جنوری ۱۹۵۳ء میں اپنا پہلا افسانہ لے کر بیسوی صدی کے درخشاں صفحات پر نمودار ہوئے۔ اگر چہ انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ افسانہ نگاری اپنے ملک میں ذریعہ معاش نہیں بن سکتی تاہم وہ عرش وفرش کی آواز سے بے نیاز ہو کر گزشتہ پینتیس برسوں سے انسان کے دل میں محبت کی دیئے روشن کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان کی دانست میں افسانہ نگاری ایک ریاضت ہے اور اس ریاضت کا ایک ہی مقصد ہے...... ایک بہتر انسان، ایک بہتر زندگی اور ایک بہتر دنیا۔

ان کے مشاہدے کی وسعت اور گہرائی نے ان کے متعدد کرداروں کو زندہ وجاوید بنادیا ہے۔ وہ جس سادگی اور صفائی سے بڑی بات کہنے کا فن جانتے ہیں اس کا اندازہ ان کے افسانے ''بڑے لوگ'' کے اس اقتباس سے ہوسکتا ہے۔

''...... دور کسی مل کا بھونپو بجا۔ فٹ پاتھ پر سونے والے ہڑ بڑا کر

اٹھ بیٹھے اور کھانستے ہوئے ملوں کی طرف بھاگنے لگے۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی بازار ایک لٹی ہوئی بھکارن کی ہتھیلی کی طرح ویران معلوم ہو رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے کسی مزدور نے دیکھا کہ ایک بڑھیا بالکل ننگی سڑک کے بیچوں بیچ پڑی ہے۔ وہ منہ دوسری جانب پھیر کے آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چل کر وہ پھر رکا۔ اس نے چوری چھپے پھر ایک نظر بڑھیا پر ڈالی۔

"ہے رام!" اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور بڑھیا کی طرف واپس چلا آیا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنے کندھے سے میلا کچیلا کھیش اتار کر بڑھیا کے ننگے جسم کو ڈھک دیا......"

سادگی اور نشتریت کا یہ امتزاج پشکر ناتھ کی غیر معمولی تخلیقی قوت کا واضح ثبوت ہے۔ وہ قاری کو فلسفے کی بھول بھلیوں میں نہیں الجھاتے۔ وہ اپنے شگفتہ انداز میں دوٹوک بات کرتے ہیں۔ جو سیدھی قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ زبان و بیان کی قدرت نے ان کے فن کو مجموعی تاثیر اور اس کی جاذبیت کو دوآتشہ بنا دیا ہے۔ "پُل نمبر صفر کے گدھ" سے ایک اقتباس:

"یہ کیفیت کیوں؟ یہ گِدھوں کا شور۔ یہ پُر اسرار ہیولے۔ یہ دلخراش وقوعے۔ یہ سب کیا ہے۔ کس سے پوچھوں؟ ہٹا دو اس وقت زدہ دوربین کو...... مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنے دو۔ اے بوڑھے ملاح خدا کے لئے تم کچھ بولو۔ مگر تم سے گفتگو نہیں ہوسکتی۔ تم تو فقط ماضی ہو......"

یہ افسانہ بھی ان سترہ افسانوں میں شامل ہے جن کے مجموعے کو سیمانت پرکاش پبلشرز نے چند سال پہلے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ "کانچ

کی دنیا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے مطالعہ سے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ زبان کے ساتھ ساتھ اب کہانی کا مرکزی خیال بھی پوشکر ناتھ کی افسانوں میں ہم آہنگ ہوتا نظر آرہا ہے۔ کہانیوں کا تانا بانا اگرچہ اب بھی کشمیر کے گرد بُنا جاتا ہے۔ لیکن اب افسانہ نگار کے ہاتھ نئی سماجی زندگی کی نبض پر ہیں۔ وہ کشمیریت کی مجروح ہوتی ہوئی میکانکی تصویر کو زیادہ جاذبیت اور بصیرت سے منظر عام پر لاتا ہے۔

اس مجموعے کے ایک اور افسانے سے یہ اقتباس پیش ہے:

> ''ایک وقت آتا ہے کائنات کی ازلی حرکت ایک پیکر میں ڈھل جاتی ہے پھر سورج کی لال بندیا اس کے ماتھے پر پھیل جاتی ہے اور پھیل کر ساری کائنات کو اپنی آگ کی لپیٹوں میں گھیر لیتی ہے۔ سمندروں کا پانی کھولنے لگتا ہے۔ پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ آسمان نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کائنات سیاہ رنگ کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور ساتوں آسمان تھرتھرانے لگتے ہیں''۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد امین اندرابی

ڈاکٹر اندرابی بڑے نستعلیق آدمی ہیں۔ شریف وضع دار مہذب اور مودب گفتگو بڑی سنجیدہ اور باوقار کرتے ہیں۔ بازاری مذاق کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ کالج کے زمانے ہی سے اردو میں معرکہ کے مضامین لکھنے شروع کئے چنانچہ کالج میگزین کی مستحسن طور ادارت کرتے رہے۔ یہ ذوق اور ولولہ بتدریج بڑھتا رہا اور بلآخر آپ نے اردو ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پھر اقبال انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا اور پروفیسر آل احمد سرور کی بصیرت افروز رہنمائی میں قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام ہونے لگا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے جریدے ''اقبالیات'' کے آپ مدیر مقرر ہوئے۔ شاعر مشرقؒ کے مشاہدات وتحریروں کے ہیروں جواہرات سے آپ نے ''اقبالیات'' کے اوراق روشن کئے۔ اس معتبر جریدے کے متعدد شمارے اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے حسین گلدستے ہیں۔ ان میں آپ کے ادارے اور مضامین جہاں آپ کی تحقیقی بالغ نظری کا عندیہ دیتے ہیں وہاں آپ کی شائستہ علمی تنقید آپ کی ادبی بصیرت کی

غمازی کرتی ہے۔اس متین نثر سے چند اقتباسات:

''اردو میں کتابوں اور رسائل کی اشاعت کا معاملہ بقول کسے موج میں صد کام نہنگ پوشیدہ ہونے کے مترادف ہے1''۔

''......مظہر امام کا اس بات پر اصرار کرنا کہ اقبالؒ کی شاعری کا مطالعہ اقبالؒ کی فکر سے مکمل طور الگ کر کے کیا جانا چاہیئے دراصل اس روئے کا ردعمل ہے جس میں اقبال کی شاعری کو محض ان کے افکار ونظریات کی توضیح اور تشریح کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ پروفیسر حامدیؔ کا مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے انہوں نے اقبالؒ کے شعری، لہجے کی انفرادیت اس کی پیغمبرانہ متانت اور اس کی سحر کاری کا اختصار سے تجزیہ کیا ہے2''۔

''اقبالؒ کی فارسی شاعری'' اقبال خطابت اور شاعری'' ''اقبال اور مغرب'' جیسی کتابوں کی ترتیب واشاعت ڈاکٹر محمد امین اندرابی کی فکری وسعت کی آئینہ دار ہیں۔ان میں علامہ اقبالؒ کے فکروفن سے متعلق عالمانہ مقالے شائع ہوئے ہیں۔ان میں آپ کا انداز نگارش ملاحظہ کیجئے3:

''فارسی زبان سے اقبال کا شغف اور انہماک اس قدر بڑھا کہ ان کا فارسی کلام کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان کے اردو کلام پر حاوی ہوگیا۔ اسرار خودی کے اشعار میں جو کیف ومستی اور عمق وشائستگی نظر آتی ہے۔وہ پیر رومی ہی کا فیضان نظر ہے۔''خطابت کی لے اگر تیز ہوجاتی ہے تو شعریت یقیناً مجروح ہوجاتی ہے۔تاہم اقبال نے جو شعریات وضع کی اور برتی اس میں خطابت سے مفر ممکن نہیں۔یہاں خطیبانہ لہجہ شعریت سے ہم آہنگ ہوا ہے اور

شعریت مجروح نہیں ہوئی ہے"۔

---

1 اقبالیات؛ شمارہ ۳ صفحہ ۵

2 اقبالیات؛ شمارہ ۵ صفحہ ۷

3 اقبالؒ کی فارسی شاعری؛ مرتبہ ڈاکٹر محمد امین اندرابی صفحہ ۶۰

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

سجود سیلانی

ہمارے ایک باصلاحیت ڈارامہ نگار ہیں۔ وہ کشمیری کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ایک ایکٹ کے پانچ مزاحیہ ڈراموں پر مشتمل ان کا مجموعہ ''شاہکار'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا ہے۔ان ڈراموں میں ''مجنون کا مقدمہ، شاہکار، علاج، ریت کی دیوار اور جنم جنم کے پھیرے'' نام کے ڈرامے شامل ہیں۔ یہ سبھی کھیل سجودؔ کے فکر وفن کی عکاسی دلاتے ہیں۔ڈاکٹر شکیل الرحمان اس کتاب کے حرف اول میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''''لایٹ ڈرامہ'' لکھنا بھی ایک آرٹ ہے۔مختلف طبقوں کے احساس اور جذبے کو متاثر کرنا اور مختلف پہلوؤں سے مسکراہٹوں کو بیدار کرنا آسان نہیں ہوتا۔سجود سیلانی اس آرٹ کی روح سے واقف ہیں۔ان کے مکالمے جس انداز سے گدگداتے ہیں اس انداز میں ان کی انفرادیت پوشیدہ ہے''۔

سجودؔ ایک بسیار نویس ڈرامہ نگار ہیں۔وہ مزاحیہ تخلیق میں بھی معاشرے کی عفونت سے غیر محسوس طریقے پر پردے ہٹاتے ہیں۔آپ کے ڈراموں میں

موضوع اور فارم دونوں کے اعتبار سے تنوع اور رنگارنگی ملے گی۔ ان ڈراموں کے
کردار ہمیں اتنا ہنساتے ہیں کہ لوگوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ لیکن
تب ہی کہیں کسی موڑ پر پڑھنے والے کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ ریڈیو ڈرامے کی
کماحقہ آگہی کے بعد سجود نے سٹیج ڈرامے کے سلسلے میں بھی کئی سنجیدہ کوششیں کی
ہیں۔ آپ کے بعض اردو ڈرامے، جو گزشتہ برسوں کے دوران نشر ہوتے رہے ہیں
اگر شائع کیئے جائیں گے تو انہیں بلا شبہ ادب کا اہم حصہ قرار دیا جائے گا۔

سجوؔد افسانے اور انشایئے بھی لکھتے تھے۔ آپ کے نثر کی زبان نہایت
شگفتہ اور رواں ہے۔ اس میں بھی طنز و مزاح کی ایک دل فریب چاشنی پنہاں رہتی
ہے۔ آپ کے افسانوں میں مقامی پس منظر اور مقامی مسائل کی جانب اصرار ہوتا
ہے۔ آپ کا ایک افسانہ ''چنار کے سائے میں'' کشمیر کے دلآویز مناظر کا دلکش عکس
پیش کرتا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

امر مالموہی

امر مالموہی ۲۹ دسمبر ۱۹۴۰ کو ٹنگمرگ (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تاریخ کے بعد انگریزی میں ایم اے کیا۔ محکمہ تعلیم میں اپنے ملازمت کے دوران آپ اردو افسانہ نگاری کی طرف سنجیدگی سے مائل ہوئے۔ آپ کی بعض ابتدائی نگارشات روزنامہ ولر میں شائع ہوتی رہیں۔ اسی دوران کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ آپ کا ناول ''کچلے پھول'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ یہ سماجی ناانصافیوں اور اقتصادی نابرابری کے پس منظر میں ایک رومانوی کہانی ہے جو بقول مصنف اپنے اختتام کے مطابق آب حیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس دوران آپ کے افسانے شیرازہ اور دیگر جرائد میں بھی شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والے شیرازہ کے افسانہ نمبر میں آپ کی کہانی ''احساس کا کرب'' شائع ہوئی ہے۔ اس کہانی سے ایک اقتباس:

''میں اپنی قبر میں اپنے حواس اکھٹے کر کے باہر دیکھتا ہوں۔ ہر طرف منجمد برف پوش چاندنی میں نادیدہ سایوں کا رقص جاری ہے۔ دور کتوں اور گیدڑوں نے غوغائے رست خیز برپا کر دیا ہے۔ میں سہم کر اپنے کفن کے

اوراق الٹتا ہوں لیکن لفظ منجمد اور عنوانات ساکن ہیں......''

آپ کے افسانوں کے مجموعے ''زعفران زار'' کی بعض دوسری کہانیوں جیسے ''موت کی آرزو، سحر ہونے تک اور انگارے'' میں بھی جدید میلانات اور رجحانات کی نئی راہیں نظر آتی ہیں۔ یہاں زندگی کی میکانیکت اور ایک تھکے ہارے ٹوٹے پھوٹے انسان کی مایوسیاں شدت سے نظر آتی ہیں۔ امر مالموہی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی تخلیقات میں معاشی الجھنوں کو ایک رومانوی پس منظر میں ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ آپ ادب کی افادیت کے قائل ہیں لیکن اسے پروپیگنڈہ بنانا نہیں چاہتے۔ آپ کے بعض ریڈیائی ڈرامے بھی انہیں خصوصیات کے غماز ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

شبنم قیوم

آپ نے ۱۹۳۸ء میں ڈل گیٹ کے اس دلآویز علاقے میں جنم لیا جس کے بارے میں عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہاں کی آب و ہوا ادب اور شاعری کو خوب راس آئی ہے۔ کشمیر میں دوسرے علاقوں کی نسبت ڈل گیٹ نے قلم کاروں کی کثیر تعداد اردو اور کشمیری ادب کو دی ہے۔ آپ نے ادب کی دنیا میں اس وقت پہلا قدم رکھا جب آپ کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ آپ کا پہلا افسانہ ''اخبار کی سرخی'' تھا۔ جو روز نامہ خدمت (سرینگر) میں شائع ہوا۔ آپ کے ہمسائے میں صوفی غلام محمد کے ہاں جن ادبی محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا آپ وہاں مدعو قلم کاروں کی تواضع کیا کرتے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز کے دوران آپ پیچ در پیچ اور دشوار گزار راہوں سے گزرتے رہے۔ خورشید عالم ۱ آپ کے فکروفن کا جائزہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''شبنم قیوم ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ طبیعت کا سادہ اور معصوم ہے۔ خلوص نرمی اور اپنا پن اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی تخلیقات میں درد اور تڑپ ہے۔ زندگی کی گہرائیوں پر اس کی گہری نظر ہے۔ وہ فطرت انسانی سے بخوبی واقف ہے۔ اس نے زندگی کی تمام زہرناکیوں، تشنگیوں

اور تلخیوں کر بڑے صبر اور سکون سے اپنے حلق سے اتار لیا ہے۔ اس نے احساس کے جسم پر نہ جانے کتنے زخم کھائے۔ اس کو اپنے ماحول کی بے چارگی کا شدت سے احساس ہے۔ وہ اس افسردہ ماحول میں اکثر انسانیت کی روح کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ اکثر سوچتا رہتا ہے۔ سوچ کی گہرائیوں میں وہ اکثر اتنا ڈوب جاتا ہے جہاں وہ ایک دیوانہ سا لگتا ہے۔ وہ بڑا حقیقت پسند ہے۔ زندگی کے حقائق سے آنکھیں چرانا خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں اس کی فطرت سے بعید ہے۔ غالباً اسی لئے اس کے یہاں خیالی عشق کے ڈھکوسلے نہیں ملتے۔ اس کی کہانیوں میں اس کی بے باک انفرادیت کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں''۔

''زندگی اور موت'' آپ کا اولین ناول تھا۔ یہ ناول جذباتیت اور انقلاب پسند رومانویت کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔ اس کے کرداروں کی غیر معمولی مقصدیت متاثر کُن ہے۔ آپ بعض ایسے کرداروں کو ابھارنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کی داخلی کشمکش باریک سے باریک نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ ناول زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی ایک پُر خلوص کوشش ہے۔ ''پرانی ڈگر نئے قدم'' آپ کا ایک اور ناول ہے۔ یہاں آپ نے قومی تہذیب اور اس کے وقار کو گرتے دیکھ کر ہمارے سامنے ایک ایسی عبرت انگیز تصویر پیش کی ہے جس میں صدیوں کا ملال چھپا ہوا ہے۔ یہ اس طوائف الملکوکی کے دور پر ایک زناٹے دار تھپڑ ہے جس میں کسی بھی شریف عورت کی عفت و عصمت محفوظ نہیں تھی۔ اگر چہ یہاں ان کا موضوع جنس ہے تاہم وہ صرف جنسی بصیرت کی عکاسی پر ہی اکتفا نہیں

کرتے ہیں۔ بلکہ مصنف اپنے ہر کردار کو نفسیات کی کسوٹی پر جانچتا ہے۔ ''چراغ کا اندھیرا'' بھی اسی قبیل کا ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہاں بھی غنڈہ گردی کے اس دور کو موضوع بنایا گیا ہے جب راہبر راہزن بن گئے تھے۔ یہاں انہوں نے اس قسم کے سیاہ کار حاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں لگائی ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک زخم اور سہی'' ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں پانچ طویل افسانے ''دسہرہ کی سیتا، دھکتی آنکھیں، دیوی دیوتا، خون آگ اور دھواں اور جہاں انسان دفن ہیں'' شامل ہیں۔ اس مجموعے کا پیش لفظ ''کرشن چندر'' نے لکھا ہے۔ وہ شبنم قیوم کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''شبنم قیوم کو کہانی کا فن آتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کا متنوع مشاہدہ موجود ہے اور اسے نفسیاتی طور پر جذب کرنے اور پھر فکر و فن کے سانچوں میں ڈھالنے کی قوت بھی! وہ واقعیت، اصلیت اور حقیقت کی عکاسی میں کہیں کہیں شاعرانہ انحراف کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں درد اور تڑپ ہے۔ آپ کی زبان اور انداز بیان دونوں ہی عمدہ ہیں۔ مشق سے یہ اور بھی نکھر جائے گا۔ آپ بالعموم اپنے افسانوں میں قاری کی دلچسپی قائم رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے بنیادی کردار میں ایسی خصوصیت ابھر آتی ہے کہ قاری چونکے بغیر نہیں رہ سکتا پھر وہ اپنے افسانوں کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں پوری کہانی ایک سوال بن جاتی ہے اور خود جواب دینے کے بجائے قاری سے جواب مانگتی ہے''۔

آپ نے مجموعی طور ایک سو کے قریب افسانے لکھے ہوں گے۔ ''شیرازہ'' اور دیگر مقامی رسائل کے علاوہ آپ کے بعض افسانے برصغیر کے معیاری اور معتبر رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں آپ کا ایک افسانہ ''ٹوٹے آئینے کا عکس'' شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بیسوی صدی عارض اور نگارش میں بھی آپ کی کئی کہانیاں شائع ہوچکی ہیں۔ آپ زیادہ تر طویل افسانے لکھتے ہیں۔ آپ کے طویل افسانوں کے بارے میں سید اختشام حسین کا لطیفہ مشہور ہے جو ایک روز آپ کے ہاں کھانا کھا رہے تھے۔ جب انہوں نے ایک کے بعد ایک سلونا آتے دیکھا تو شبنم صاحب سے بولے۔ ''اس کی کیا ضروت ہے یہ تو بہت ہے''۔ شبنم صاحب نے از راہ مہمان نوازی جواب دیا یہ تو ہم نے مختصر بنایا ہے۔ اختشام حسین بے ساختہ بول اٹھے...... ''ارے یہ مختصر ہے۔ یہ تو طویل افسانہ ہے''۔ آپ نے اردو میں بیس کے قریب ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ڈرامے ریڈیو سے براڈ کاسٹ بھی ہوئے ہیں۔ ''یادگار'' شعلوں کی زبان اور جہاں انسان دفن ہیں'' پر آپ کو انعامات بھی حاصل ہوئے ہیں۔

آپ نے نیم سیاسی ناول ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا'' نے یہاں کے سیاسی، صحافتی اور عوامی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ یاران نکتہ داں نے کہا کہ اس ناول میں کشمیر کی تاریخ اور تحریک کو مسخ کر کے پیش کیا گیا2 ناول بحثیت مجموعی ایک ناکام ادبی کاوش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے سطحی جذبات کی رو میں بہہ کر لکھا گیا ہے۔ ناول میں شروع سے آخر تک صرف ایک فرد واحد کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ریشماں کے کردار کے ذریعہ کشمیری نسوانی غیرت اور حمیت کو غلط انداز دیا گیا ہے۔

لیکن اس کے بعد آپ کی جو کتاب منظر عام پر آئی اس نے شبنم قیوم کو بقائے دوام بخشا ہے۔ یہ کتاب کشمیر کا سیاسی انقلاب ہے جو کشمیر بک ڈپو (سرینگر) کے اہتمام سے پہلی بار ۱۹۸۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ پانچ حصوں پر مشتمل اس ضخیم و عظیم کتاب نے شبنم قیوم کو ایک عمدہ ادیب کے علاوہ ایک دور بین محقق اور ایک محنتی مورخ کی حیثیت سے پیش کیا۔ یہ ایک بُت شکن کا ایسا مستحسن کارنامہ ہے جس نے سالہا سال کے اندھے عقائد میں شگاف پیدا کر دیا، جس نے ظلمات کے دیوتاؤں کا حقیقی چہرہ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ یہ ایک نئے عہد کی نئی تاریخ ہے۔ نیند سے بیدار ہونے والی قوم کے لئے ایک تابندہ آفتاب ہے جس کی ضیا پوش کرنوں سے صدیوں کے اندھیرے دم توڑ دیتے ہیں۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل اتنا بڑا کام بخیر و خوبی انجام تک پہنچانے کے پیچھے مصنف کو جن مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا ان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن پانچوں حصوں کا مطالعہ کرنے کے بعد دھند میں لپٹی ہوئی وادی سے ابہام کا کہرا ہٹ جاتا ہے اور ہر منظر نہایت صاف اور شگفتہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس بات کی طرف وجیہہ احمد اندرابی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں3:

"تحریک حریت کشمیر سے متعلق اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے یہ کتاب سب سے زیادہ مفصل و مدلل ہے۔ شبنم قیوم نے بلا شبہ بڑی لگن محنت اور عرق ریزی سے وہ سارے حالات و واقعات ضبط تحریر میں لائے ہیں جن سے کشمیر کا سیاسی انقلاب عبارت ہے۔ کتاب کی دوسری جلد میں پنڈت نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے میں جو تفصیلات

درج ہیں اس قسم کی تفصیلات اس نوعیت کی کتابوں اور کہیں نہیں ملتے ہیں۔ پھر اس کے جلد چہارم میں موئے مقدس کی گمشدگی کے اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں اور اصلی ملزم کو ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبنم قیوم کی یہ تصنیف بلاشبہ معلومات انکشافات اور سربستہ رازوں کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جس کا پتا اس کے پانچوں جلدیں پڑھ کر ہوتا ہے''۔

کتاب کے تاریخی انکشاف سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شبنم قیوم نے جس بے باکی سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے وہ بلاشبہ لائق ستایش ہے۔

---

1 مزاج: بھوپال مارچ ۶۷ صفحہ ۲۲

2 ماہنامہ تکبیر نو اپریل ۸۷ صفحہ ۴۶

3 روزنامہ الصفا نیوز ۲۶ دسمبر ۱۹۹۰ء۔ وجیہہ احمد اندرابی نہایت وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ معروف ہفت روزہ چٹان کے شریک مدیر رہے ہیں۔ وادی کے مقتدر ادیبوں کی تنظیم ''حلقہ علم وادب'' میں آپ سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں آپ کے کئی اردو افسانے مقامی اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ آپ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں صرف چند الفاظ سے پورا کینوس روشن کردیتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کے اپنے ہفت روزہ ''جبروت'' کے ادارئے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ (جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

وحشی سعید ساحل

کشمیر میں اردو فکشن کے ارتقا کی تاریخ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں وحشی سعید ساحل جیسے قلم کار آندھی کی طرح ابھرتے ہیں اور طوفان کی طرح چلے جاتے ہیں۔ وحشی صاحب نہ صرف کہانیاں لکھتے ہیں بلکہ ریاست میں اپنی طرز کا ایک منفرد ماہنامہ ''نگینہ'' بھی آپ سے وابستہ ہے۔ آپ نے اس رسالے کے بعض یادگار اور ضخیم نمبر بھی نکالے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے افسانوں کے خوب صورت مجموعے بھی شائع کراتے رہے۔ وہ اسی پر بس نہیں کرتے ان کی ۷۵ کہانیاں کے مجموعے ''سڑک جارہی ہے'' کے پورے صفحے کے اشتہار برصغیر کے مقبول رسائل میں اس انکشاف کے ساتھ شائع ہوتے ہیں کہ کتاب برائے نام قیمت چھ روپے میں تقسیم کی جارہی ہے۔ جو لگ بھگ ساڑھے چار سو صفحات پہ پھیلی اس کتاب کے لئے مروجہ معیار سے بہت کم قرار دی جاسکتی ہے۔ اور پھر ایک دن وہ اظہار کے اس وسیلے کو منجدھار میں چھوڑ کر اچانک کسی نئے ساحل کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ بہر کیف ان ہی تضادات میں کہیں تعبیروں کا عکس بھی جھلکتا ہوگا۔

وحشی سعید ساحل کے فن میں بھی یہی تضاد اور بغاوت نظر آتی ہے۔ وہ

روایات سے انحراف کر کے اپنی ایک الگ جداگانہ راہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کا موضوع بھی نیا ہے اور تکنیک بھی انوکھی ہے۔ ان کے افسانوں کی وسیع آرٹ گیلری میں جتنے کردار نظر آتے ہیں وہ محض پرچھائیاں نہیں ہیں بلکہ گوشت و پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ساحل کو انسان کی سائیکی میں جھانک کر اس کی روح کا ایکسرے لینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ہر افسانہ زندگی کے گہرے مشاہدے اور فطرت انسانی کے عمیق مطالعے کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ ''سائے کی لاش'' کا بوڑھا مصور ہو ''جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے'' کی رینوکا دیوی یا شالنی ہو یا پھر ''سڑک جارہی ہے'' کی نینا ہو۔ سبھی کردار روزمرہ زندگی کی عریاں تصویریں پیش کرتے ہیں۔ مصنف فرائڈ کے نظریہ جنس سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اسی محور پر گھومتے ہیں۔ یہاں وہ یہ عندیہ دیتے ہیں کہ وحشی طاقتوں اور شیطانی قوتوں کے غلبہ کے باوجود ابھی انسان مرا نہیں ہے۔ یہ فلسفیانہ بصیرت ''تہذیب یافتہ لوگ، انداز اور طوفان جیسے افسانوں کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

وحشی سعید ساحل کے افسانوں میں مقامی بوباس عنقا ہے۔ آپ کے افسانے ممبئی کی فلمی دنیا سے لے کر اینگلو انڈین لوگوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہڑتال اور ''جب ممبئی جھک جائے گی'' قبیل کے درجنوں افسانے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ لیکن ''طوفان'' کی طرز کے افسانے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کشمیر کی سحر انگیز سرزمین نے کرشن چندر اور عزیز احمد سے لے کر اوپندر ناتھ اشک تک درجنوں چوٹی کے قلم کاروں کو تخلیق کی تحریک دی ہے۔ لیکن وحشی سعید ساحل یہاں بھی اپنی ترنگ میں متضاد لہر کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور مقامیت کے رجحانات

سے اجتناب کرتے ہیں۔ آپ کے فن میں جس چیز کو بلا تامل سراہا جا سکتا ہے وہ زباں و بیاں پر آپ کی اچھی خاصی قدرت ہے۔ اس قدر سلاست اور عبارت کی روانی آپ کے کئی ہم عصر دوستوں میں برسوں کی مسلسل ریاضت کے باوجود بھی نہیں آسکی ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

عمر مجید

آپ کا اصلی نام عبدالمجید میر ہے۔ آپ کی ولادت ۱۹۴۴ء کو سونہ وار باغ سرینگر میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بسکو میموریل اسکول سرینگر میں حاصل کی۔ کشمیر یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ بسکو اسکول میں ہی بحیثیت مدرس تعینات ہوئے۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز روزنامہ آفتاب سے ہوا جہاں آپ کئی برسوں تک ایک کالم نویس کے طور پر کام کرتے رہے۔ آپ کا ترتیب دیا ہوا کالم ''خیال اپنا اپنا'' قارئین کے وسیع حلقوں میں بے حد مقبول تھا۔ یہ موجودہ صدی کے چھٹے عشرے کے وسط کا زمانہ تھا۔ اردو ادب کا کارواں دھندلا سا گیا ہے۔ اس کارواں کے سرخیل رہنما کچھ تھکے تھکے سے نظر آنے لگے تھے۔ اس میں نئے راہ گیروں کو اپنی طرف کھینچ کی جیسے سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اس پُر پیچ موڑ پر روزنامہ آفتاب کے ادبی صفحات اس کارواں کے لئے ایک نخلستان ثابت ہوئے۔ اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں مارتنڈ، ہمدرد اور خدمت جیسے اخبارات نے جو نمایاں رول اس سے قبل انجام دیا تھا وہ ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ لیکن روزنامہ آفتاب کی ارغوانی ادبی محفلیں کشمیر میں اردو کی بقا اور اس کے وقار کے لئے ایک فال نیک ثابت

ہوئیں۔ اس ادبی محفل کے دروازے ہر مکتب فکر کے یاران نکتہ داں کے لئے کھلے تھے۔ چنانچہ نوخیز ادیب کھل کر سامنے آنے لگے۔ نئے رجحانات اور نئے میلانات کی ایک اچھوتی شروعات ہونے لگیں۔ ابھرتے ہوئے ادیبوں کا یہ جواں سال کارواں عصری مسائل کو سمیٹتا ہوا اور اپنی نئی راہیں متعین کرتا ہوا خود اعتمادی سے نئی بلندیاں سر کرتا رہا۔ عمر مجید اسی کارواں کے راہبر تھے۔

آفتاب میں آپ کے افسانے ''مردہ چنار'' کے شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں تہلکہ سا مچ گیا۔ اس افسانے میں آپ نے بعض کمالات اور کرامات کو الفاظ کا ملبوس پہنایا تھا۔ یہ اردو ادب میں ایک نئی آواز تھی صاف اور نکھری ہوئی...... اذیتوں اور المیوں کے ساتھ برہنہ...... یہاں موضوع کی تازگی تھی اور اسلوب کی شگفتگی...... یہ ایک قطعی نئی ادبی طرز تحریر تھی۔ بوڑھا چنار خزاں کی آمد سے سہم جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی خوشیوں کے موسم بیت گئے۔ ایک اقتباس:

''یہ میری زندگی بھی کتنی عجیب ہے۔ ہر سال میں پیدا ہوتا ہوں اور ہر سال برف مجھ پر کفن اوڑھتی ہے۔ بہار آتی ہے تو ننھی ننھی کونلیں میرے جسم پر اپنی ننھی ننھی آنکھیں کھولتی ہیں۔ پھر میری کونپلوں سے پتے نکلتے ہیں۔ سبز مخملی پتے...... نہ جانے میرے ان پتوں کو کون تراشتا ہے۔ اتنا خوبصورت بناتا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے موسم بدل جاتا ہے۔ سبز رنگ نارنجی ہو جاتا ہے اور میں مرجاتا ہوں لیکن...... میں مرتا ہوں تو رحمان جاروب کش کو زندہ رہنے کی امید نظر آتی ہے۔ وہ میرے پتے جمع کرتا ہے۔ ان میں آگ ڈالتا ہے۔ پتے سرخ ہوجاتے ہیں۔ انسان کے خون سے بھی سرخ۔ تب ہی رحمان کی بیوی کے مرجھائے رخساروں پر شفق کی چمک پیدا ہوتی ہے''۔

آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''اجالوں کے گھاؤ'' جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں آپ کے نو افسانے شامل ہیں۔ یہ کہانیاں دراصل ایک تخلیقی ساحر کا سحرِ ہفت رنگ ہیں۔ ان میں آپ نے ایسی حقیقتوں اور سچائیوں کو دریافت کیا ہے جو مروجہ رجحانات سے انحراف کرتی ہیں۔ افسانہ ''میرے وطن'' سے ایک اقتباس:

''میں گھر میں کیسے داخل ہو جاؤں...... میرا گھر...... میرے مالک میں کیا کروں؟ ان کو دیکھ کر میرا کلیجہ تو نہ پھٹ جائے گا۔ وہ میرا منو تب صرف دو برس کا تھا کیا وہ مجھے پہچانے گا۔ اپنے بدقسمت باپ کے گلے سے لگ کر روئے گا۔ زرینہ مجھے ضرور پہنچانے گی۔ بیس سال پہلے تو وہ بھی جوان تھی وہ برف...... وہ بادام کے شگوفے اور ڈل کے آئینے۔ عشق پیچاں کی بیلیں۔ بیس برس ایک لمبی مدت ہوتی ہے۔ بیس جنم...... یادوں کے الاؤ زخموں کی مدھم آنچ...... روح کو پگھلانے والی یادیں۔ مجھے اپنے وطن کا ایک ایک چنار یاد ہے۔ میرے وطن...... مجھے سب یاد ہے''۔

اس افسانے میں آپ نے ایک مجبور اور معصوم انسان کا المیہ بیان کیا ہے جو سیاسی حد بندیوں کا شکار ہو کر ساری زندگی تڑپتا اور ترستا رہتا ہے۔ اس کی محرومیوں کی یہ داستان ایک اجتماعی احساس اور وسعت رکھتی ہے۔ اسی مجموعے کا ایک اور افسانہ ''اُجالوں کے گھاؤ'' ایک نادار کاشتکار کی تباہی کی کہانی ہے۔

آپ کے کردار عموماً غریب ناکام اور سماج کے ستائے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً ''آدمی'' کا مرکزی کردار اکبر...... جس نے خارش زدہ کتیا کے حقیر پلوں کی طرح سڑک پر آنکھیں کھولی تھیں۔ جو سالہا سال تک تارکول کی سڑک پر جھلستا رہا تھا

اور آخر گناہوں اور بدکاریوں کے دلدل میں پھنس گیا تھا۔ لیکن آخر ایک رات اسے اپنی شکست خوردہ ذات کا احساس ہوجاتا ہے اور اس کی زندگی میں امید اور اعتماد کی ایک نئی صبح طلوع ہوجاتی ہے۔ ''بھکاری'' اسی مجموعے کا ایک اور افسانہ ہے۔ یہاں ایک محروم باپ اپنی ننھی سی لاڈلی بیٹی گلو کی اچانک موت کے مہینوں بعد ایک دن سرِ راہ ایک معصوم بچی کو دیکھتا ہے۔ گلو کی یاد زخم بن کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچانے لگتی ہے۔ وہ بڑی دیر اور بڑی دور تک جھیل ڈل کے کنارے بچی کو گود میں لئے اس کے ماں باپ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ وہ اسے دلچسپ کہانیاں سناتا ہوا نہرو پارک کے گیٹ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس بچی کے ماں باپ نہرو پارک جانے والے شکارے میں سوار ہونے سے پہلے ایک روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ انوکھا موڑ قاری کے دل میں درد کی ایک کسک چھوڑ دیتا ہے۔

آپ کا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اسلام آباد کے قریبی دیہات اس ناول کا پس منظر ہیں۔ جہاں لوگ غربت اور افلاس کی گھٹن میں شکستہ زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ ایک انسان کے ظلم اور دوسرے ان گنت لوگوں کی مظلومی اور ستم رسیدگی کی داستان ہے۔ آپ نے ناول میں معاشرے کی مکروہ باتوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ آپ نے اخلاقی انحطاط اور قومی تہذیب کی آن پر دھبہ لگتے دیکھکر ایک ایسی چیخ بلند کی ہے جس سے بام و در دہل اٹھے ہیں۔ اس ناول کے کردار سارا، نذیر، اور خالد، ظلم و جبر کی قوتوں کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں لیکن ظلم کی قوت اور بدی کے وسائل بے پایاں ہیں اس لئے مظلوم کا سارا جوش اس کی ساری جھنجلاہٹ اور اس کا سارا پیچ وتاب رائیگاں جاتا ہے۔ گو

نذیر ناول کے اختتام میں بدی کی علامت اکبر کو قتل کر کے کیفر و کردار کو پہنچا تا ہے لیکن جیت ظلم اور بدی ہی کی ہوتی ہے۔نذیر کو عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے۔وہ اپنی محبوبہ شاداں کی بلکتی ہوئی زندگی میں مسکراہٹوں کے پھول نہیں کھلا سکا۔اس کی بہن آمنہ ہوس کی بھینٹ چڑھ کر خودکشی کر لیتی ہے۔اس کی ماں آہوں کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔گو اس ناول کے موضوع کے حقیقی ہونے کا ہر ایک کو اعتراف ہے لیکن بعض کردار نیم روشن سائیوں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔کہیں کہیں ناول خیال اور فن کے لحاظ سے ناپختہ نظر آتا ہے۔کہانی کی پیش کش میں فنی پیچیدگی کا کوئی اہتمام نہیں۔کرداروں کی تہہ در تہہ نفسیات کی گرہیں نہیں کھلتی۔آپ نے جو کچھ بھی کہنا چاہا ہے نہایت سادگی اور معصومیت سے اس کا اظہار کیا ہے لیکن اس سچی زندگی کو آپ نے جس سادہ اور موثر پس منظر میں بیان کیا ہے اس کے لئے آپ کو بلا تامل سراہا جا سکتا ہے۔

آپ کا دوسرا ناول ''درد کا دریا'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا ٹریٹمنٹ قطعی مختلف ہے۔اس کے مرکزی کرداروں کی اپنی ایک انوکھی دنیا ہے۔یہاں زبان و بیان کی تازگی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی اور انہماک کو قائم رکھتی ہے۔زندگی کا رومان، اس کی تلخیاں اور اس کے ساتھ ہلکی ہلکی لہروں کی طرح ابھرتا ڈوبتا مزاح۔کرداروں کے جذبات کا اتار چڑھاؤ۔یہ سب کچھ پورے پھیلاؤ اور پورے ٹھہراؤ کے ساتھ اس ناول میں موجود ہے۔

اس دوران آپ نے راقم کے ساتھ مل کر کشمیر میں اردو ادیبوں کی ایک تنظیم ''تلاش ادب'' تشکیل دی۔اس ادبی تنظیم میں وادی کے اطراف واکناف

سے بڑے اور ابھرتے ہوئے ادیب یکساں طور شامل ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں میرے اور عمر مجید کے علاوہ بشیر احمد بشیر اور اقبال عظیم کے درمیان مسلسل کئی نشستیں بھی ہوتی رہیں۔ ہماری ان نشستوں کا ماحصل تلاش ادب کا قیام تھا۔ تلاش ادب کے معرض وجود میں آنے سے سرینگر کی ادبی شخصیات کی رگوں میں پھر سے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ تنظیم کا دائرہ بتدریج وسیع تر ہوتا رہا۔ تنظیم کی عظیم الشان اجلاس لال منڈی کے وسیع سبزہ زار میں منعقد ہوتے رہے۔ تنظیم نے اپنا ایک ماہنامہ رسالہ بھی اقبال عظیم کی ادارت میں شروع کیا جس میں تلاش ادب سے وابستہ فنکاروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں گویا ایک خواب شرمندہ تعبیر ہوا تھا1:

آپ کی تحریر کی خوشبو کشمیر کی وادیوں سے نکل کر ملک کے مختلف حصوں میں اڑتی پھری۔ آپ کے افسانے ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہونے لگے۔ دیگر متعدد رسائل کے علاوہ آپ کی کہانیاں بیسویں صدی اور ماہنامہ روبی وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ آپ زندگی کی تلخیوں کو نہایت سکون سے اپنے حلق سے اتارتے رہے۔ نہ جانے احساس کے جسم پر آپ نے کتنے زخم کھائے لیکن انسانیت اور انسان کی ازلی بے چارگی میں بے پناہ اعتقاد کے باعث آپ نے راہ راست سے کبھی بھی انحراف نہیں کیا۔ آپ اپنے افسانوں میں بھی انسانیت کی روح کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ آپ کے بیشتر افسانے یہی پیغام دیتے ہیں کہ حوصلہ شکن حالات کے باوجود ہمیں منفی قوتوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم ان سے مرعوب ہوگئے تو یہ ہماری یقینی شکست کا پیش خیمہ ہوگا۔

آپ کے افسانے ''چھوٹا آدمی'' (بیسوی صدی سالنامہ ۱۹۷۷ء)

''گونگے گلاب'' (انتخاب اردو ادب ۷۴-۷۷ء) یہ شام بھی کہاں ہوئی۔(شیرازہ افسانہ نمبر) تھوڑی سی جگہ (شیرازہ مارچ ۸۷ء) شہر کا اغوا (تعمیر جموں وکشمیر اردو ادب نمبر) ادھورا تاج محل (شیرازہ مئی ۱۹۸۰ء) آپ کے تخلیقی توانائی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ ان افسانوں میں تخلیقی معنویت اور جاذبیت کا کینوس بہت بڑھ گیا ہے۔ آج آپ کے افسانے فکروفن کے جس نورانی ہالے سے منور ہیں اس کو زمانے کی گردش، بلاشبہ بے نور نہیں کر سکے گی۔ درس وتدریس آپ کا پیشہ رہا ہے۔ سرینگر کے قلب میں واقع بسکو اسکول میں آپ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائض ہیں تاہم نئی نسل کو نیک اور باصلاحیت بنانے کی کوششوں پر ڈھلتی عمر کے سائے اثر انداز نہیں ہو سکے ہیں۔

---

1 میری تلاش، میرا خواب روزنامہ آفتاب ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء......جان محمد آزاد

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

فاروق رینزو

فاروق رینزو کے افسانوں کا مجموعہ ''ڈوبتے کنارے'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ ملک کے ایک مقتدر ناقد پروفیسر آلِ احمد سرور نے اس مجموعے کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا تھا۔

''فاروق صاحب کو زبان پر قدرت ہے۔ وہ کہنے کو بہت کچھ رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہ افسانے بھی دلچسپی سے بھرپور ہیں۔ امید ہے اگر وہ سوچنے اور محسوس کرنے کا یہ انداز جاری رکھیں گے تو ان کے افسانے اس دور کے بہترین افسانے ثابت ہوں گے''۔

''ڈوبتے کنارے'' کی اشاعت سے پہلے بھی آپ کے کئی ایک افسانے اور مضامین بعض مقامی اخبارات میں شائع ہوتے رہے تھے۔ پھر اچانک بقول مظہر امام ۱ انہیں تنگنا افسانہ سے باہر نکل کر ایک وسیع تر میدان میں اشہب قلم کی جو لانیاں دکھانے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ۱۹۸۲ء میں آپ کا پہلا ناول ''زخموں کی سال گرہ'' منظر عام پہ آیا۔ اس ناول کا موضوع طلبہ کی بے چینی اور اضطراب ہے۔ آپ نے نئی نسل کی نا آسودگیوں اور محرومیوں کا ایک چابک دستانہ مطالعہ کیا ہے۔ آپ

سطحی حقیقت کو نظر انداز کر کے مسئلے کی بنیاد کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن ناول کے کلائیمکس میں جس طرح آپ نے اس ہمہ گیر بے اطمیناتی کو ایک تعمیری سمت دینے کی سعی کی ہے اس سے ناول پہ ایک اصلاحی اثر غالب ہو گیا ہے۔ احمد، شبنم، حامد، خورشید، حمید سبھی نئی نسل کے نمائندہ کردار ہیں۔ بعض کردار تاریک پر چھائیوں کی طرح ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ تاہم بعض دیگر کرداروں کے باطن کی آگ اور ان کی معصومیت نہایت واضح طور پر قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس ناول کے ذریعے آپ نے ریاست میں کتابوں کی تشہیر واشاعت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ چنانچہ اس ناول کے ۳۰ رصفحات پر مصنف کے نام مختلف لوگوں کے تاثرات و پیغامات بھی شامل تھے۔ ادب میں یہ رجحان قطعی نیا تھا۔ اس لئے اس پہ مقامی ادیبوں میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ تاہم آپ نہات عرق ریزی سے کام کرتے رہے۔ اس دوران آپ محکمہ اطلاعات کے اہم انگریزی ماہنامہ ''کشمیر ٹوڈے'' کی ادارت بھی کرتے رہے۔ آپ کے بعض افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے کئی اہم ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

۱۹۸۴ء میں آپ کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ ''گرتی بلندیاں'' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں آپ کے بیس علامتی افسانے شامل ہیں۔ یہاں فنکار کی نگاہ زندگی کی تہہ در تہہ حقیقتوں کا زیادہ بہتر مشاہدہ کرتی ہے۔ اس مجموعے کے لگ بھگ سبھی افسانوں میں فوکس Focus انسان کی ذات ہے۔ جو مایوس ہزیمت خوردہ اور تنہا ہے۔ جسے زندگی کی پیچیدگیوں نے ایک عجیب وغریب دوراہے پہ کھڑا کیا ہے۔ اس دوران ۱۹۸۷ء میں آپ کا ناول ''انقلاب کا شہید'' شائع ہوا۔ یہ ناول ایک گم نام

مجاہد آزادی کے محور کے گرد گھومتا ہے۔ اوپر آپ کے بعض ٹی وی ڈرامے بھی شائقین میں بے حد مقبول رہے۔ آپ کی ٹی وی فلم ''سکون'' اس پیچیدہ فن کے تمام آداب پر کھری اترتی ہے۔ آج کل آپ ریاست جموں وکشمیر کے تاریخی پس منظر میں ایک تحقیقی پروجیکٹ پہ کام کررہے ہیں۔

ایل ایل بی میں پہلی پوزیشن کے نمایاں امتیاز کے بعد ۱۹۸۳ء میں آپ کو آل انڈیا ہندی اردو سنگم کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ آپ اس وقت آل انڈیا رایٹرس سٹیڈی گروپ کے چیرمین ہیں۔

---

1 زخموں کی سالگرہ ص نمبر ۱۱

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

منظورہ اختر

منظورہ اختر رعناواری سرینگر کے ایک متوسط گھرانے میں ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوئیں۔ گریجویشن کرنے کے بعد آپ محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس متعین ہوئیں۔ لیکن اپنی پڑھائی کے دوران آپ نے کئی افسانے تحریر کئے جو مقامی ادبی حلقوں میں سراہے گئے۔ اسی زمانے میں آپ کا افسانہ ''ڈل کی شہزادی'' خواتین کے ممتاز رسالے خاتون مشرق میں شائع ہوا۔ یہ ایک گھمبیر اور معنی خیز افسانہ تھا۔ اس میں ایک فکری تازگی اور اسلوب کی شگفتگی تھی۔ یہ ڈل کی لہروں پر کشتی کھینے والی ایک دوشیزہ زونؔی کی کہانی ہے۔ وہ مسافروں کو ڈل کے اس پار لے جاتے ہوئے حبہ خاتون کے گیت گنگناتی ہے۔ تو سلیم انجانے خوابوں میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر شالیمار کے گھاٹ کے آتے ہی اس کی حسین جنت ویران ہو جاتی ہے۔ سلیم مہینوں اسی طرح زونؔی کی کشتی میں آتا جاتا رہا۔ پھر دونوں میں بے تکلفی ہوگئی۔ ستاروں کی مقدس چھاؤں میں انہوں نے عہد و پیمان بھی کئے۔ دو سال بعد سلیم کی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ وہ نئے اسکول میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ گو اس نے نئی تہذیب کی رنگین تتلیوں کے بدلے سادہ زونؔی کو اپنانے کا عزم کیا تھا۔ تاہم رسم و رواج کی فلک

بوس فصیلیں وہ پار نہیں کر سکا۔ سلیم دلہا بنا اور ڈل کی شہزادی رات کی خاموشی میں گھر سے نکل کر ڈل کی آغوش میں سما گئی۔ اس کہانی سے ایک اقتباس:

''آج اس واقعہ کو مدت گزر گئی۔ لیکن اب بھی ہر سال جب بہار اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے تو زونی کنول کا روپ دھارے اسی جگہ پر جہاں اس نے سماج کی قربان گاہ پر اپنی مجبور جوانی کو بھینٹ چڑھایا تھا۔ جھیل کی اتھاہ گہرائیوں سے سر ابھار کر دیکھتی ہے کہ ''یہ سماج بدلا کہ نہیں''؟

اپنا مافی الضمیر اس قدر اختصار سے پیش کرنا منظورہ اختر کے فن کا حصہ ہے۔ یہ معنویت اور لطیف ترین اشاریت غالباً منظورہ صاحبہ کے ذوق غزل گوئی سے بھی عبارت ہو سکتی ہے۔ آپ کے دوسرے افسانوں ''جیون ساتھی اور ہم آغوش میں بھی'' اختصار اور ارتکاز کی یہ کمال جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ''چناروں کی چھاؤں میں'' آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں ادارہ خاتون مشرق نے ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی مالی معاونت سے آپ کا دوسرا مجموعہ ''جہلم کے کنارے'' شائع کرایا۔ اس مجموعے میں آپ کی دس کہانیاں شامل تھیں۔ یہاں فن پہ آپ کی گرفت زیادہ مضبوط نظر آتی ہے۔ لگ بھگ سبھی افسانے رومانی آرزو مندی کے رنگوں سے مزین ہیں۔ ''جہلم کے کنارے'' اس بات کا غماز ہے کہ مصنفہ سماجی حقیقتوں کا کس قدر گہرا شعور رکھتی ہیں۔ اس افسانے میں جہلم کے دو کناروں پر بسنے والوں کے معاشرتی تضاد کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ ایک طرف مغربی تہذیب کی رنگینیاں اور دوسری طرف افلاس اور درمیان میں جہلم بہہ رہا تھا۔ جس کی چھاتی پر دادِ عیش دینے والوں کے لئے تیرتے ہوئے محل بھی ہیں اور بوجھ ڈھونے والی

بھاری بھرکم کشتیوں کا بار بھی۔ رحمان چوکیدار کا بیٹا اشرف یہاں ایک کنارے پر اپنی محرومیوں کے ساتھ رہتا ہے جب کہ دوسرے کنارے پر کرنل عارف کی صاحبزادی روحی عالی شان محل میں رہتی ہے۔ روحی اس دریا کو پار کرنے کے لئے آگ میں بھی کود جاتی ہے، لیکن بے رحم حقیقتیں تب بھی نہیں بدلتیں۔ ''خزاں کے بعد'' افسانے میں زندگی کی تہہ در تہہ نزاکتیں سامنے آتی ہیں۔ زندگی کی شام میں شباب کی بازیافت کا یہ قصہ نہایت پُر اثر ہے۔ اس افسانے کی تکنیک کا تنوع اسے امتیاز عطا کرتا ہے۔

''مشترکہ قبر'' کا پس منظر پوگل پرستان کا سحر انگیز علاقہ ہے۔ یہاں مصنفہ ایک بار پھر اپنے مرغوب انداز تحریر کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ حسین پہاڑوں کا حسن ان کی نگارش سے عکس ریز نظر آتا ہے۔ محروم لوگ، ناکام محبتیں اور طبقاتی کشمکش۔ یہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ ''جس دن بازار بند تھے''۔ گو بیس سال پہلے تحریر کیا گیا افسانہ ہے۔ لیکن اس میں عصری آگہی کا گہرا شعور ہے۔ یہ شعور اس قدر بالیدہ ہے کہ اس افسانے کو آج کل کے حالات و واقعات کے تناظر میں بھی پرکھا جاتا ہے۔ رواداری کی جو میراث کشمیریت کی خمیر میں ہے یہ افسانہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔

آنسہ منظور اختر ایک پُر وقار فن کار تھیں۔ لیکن اس ابھرتی مصنفہ کا ادبی سفر ناتمام رہا۔ اپنے دوسرے مجموعے کی اشاعت کے چند سال بعد ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء کو آپ مختصر سی علالت کے بعد رحلت کر گئیں۔ راقم السطور نے ایک مقامی روزنامے کے اپنے مستقل کالم ''ہم قلم ہم سفر ۱'' میں اس موقع پر جو مضمون تحریر کیا تھا اس سے

ایک اقتباس:

''ابھی چند ماہ قبل سرینگر کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں جب بیگم حضرت محل یادگاری تقریب کا اہتمام ہوا تھا تو اس موقع پر ریاست کے بعض ممتاز فن کاروں کو اعزازات سے نوازا گیا۔اسی دوران مائیک پہ ایک نام کا اعلان ہوا۔''آنسہ منظورہ اختر......'' حاضرین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک برقعہ پوش نوجوان خاتون حجاب کی پیکر بنی اپنا گولڈ میڈل لینے سٹیج پہ آ گئی۔ یہی منظورہ صاحبہ تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ اردو ادب کا یہ پاکیزہ آنچل اتنی جلد موت کی عمیق گہرائیوں میں کھو جائے گا۔عین شباب میں منوں مٹی تلے سو جائے گا[2]''۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

---

1 روزنامہ نوائے صبح ۲۶ دسمبر ۱۹۸۰ء

2 یہ اعزاز مصنفہ کو ان کے شعری مجموعے ''سرخ آنچل'' کے لئے ملا تھا۔اس کے علاوہ آپ کی جو تصانیف منظر عام پر آئیں تھیں۔ان میں مقدس انقلاب ''دختر کشمیر، چناروں کی چھاؤں میں، نغمات حرم'' بھی شامل ہیں۔ ''مہکتے لفظ'' کے عنوان سے آپ کے افسانوں کا جو مجموعہ شائع ہونے والا تھا۔وہ بھی شائع نہیں ہوسکا۔یہ عجب اتفاق ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی ممتاز ادیبہ اور شاعرہ سیدہ شہزادی کلثوم جو ''اقبال اور شاعرات، شعلہ حرم اور معرکہ کربلا'' جیسی کتابوں کی مصنفہ تھیں۔صرف اکیس سال کی عمر میں اس دارِفانی سے منہ موڑ گئی

تھی۔ منظورہ اختر کو بھی غالباً شہزادی کلثوم کی طرح اپنی جوان مرگی کا احساس تھا۔

میں وقت کی شہزادیِ کلثوم ہوں اختر
کل یاد کرے گی مجھے یہ وادیٔ کشمیر

(جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

جان محمد آزاد

ادیب کا تعارف دراصل اس کی تخلیقات سے ہی ہونا چاہئے کیونکہ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ادیب کے فن اور اس کی شخصیت کا صحیح جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ممتاز افسانہ نگار عمر مجید برسوں تک میرے خلوت و جلوت کے ساتھی رہے ہیں۔ وہ راقم السطور کے فکر وفن کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں1:

''جان محمد آزاد کی پہلی محبت ادب ہے۔ ان کی کہانیاں اور ناول پڑھنے کے دوران میں اپنی ہستی کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہوں اور ان کے احساسات کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ برف باری کی تیز ہواؤں میں غوطہ زن راتوں کے افسردہ شبستان۔ پرچھائیوں کے شہر کی تنہائیاں۔ دیہاتی زندگی کے خمیر میں گندھے ہوئے وجود۔ ان کی مظلومیت اور گھٹن کی لرزاں خیز تصویریں۔ کبھی کبھی میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وہ خود ایک آنسو ہیں جو وقت کی آنکھ سے ٹپک کر صفحہ قرطاس پر بکھر گیا ہے۔ وہ بلاشبہ کھوئی ہوئی دنیا اور بھولی ہوئی یادوں کے ادیب ہیں جن کی نگارشات میں گزرے موسموں کی مہک ہے۔ وہ اس جنگل کے لئے اجنبی ہیں جسے دنیا کہتے

ہیں۔ سب سے الگ بے حد حساس اور لطیف روح......"

میری پیدائش سرینگر کے پائین علاقے کادی کدل کی تنگ و تاریک گلیوں میں ہوئی تھی۔ میرے والد کا نام محمد سلطان تھا۔ ان کی زینہ کدل میں کریانے کی اچھی دکان تھی۔ کادی کدل کے ہمارے اس آبائی مکان میں محلے کے دوسرے مکانوں کی طرح لکڑی اور مٹی کا استعمال زیادہ تھا۔ محلے کے دیگر بیشتر مکان شکستہ ٹوٹے پھوٹے اور ایک منزلہ تھے۔ تاہم ہمارا مکان تین منزلہ اور قدرے کشادہ تھا۔ ہمارا یہ مکان الف لیلوی نالہ مار کے کنارے ایک گھمبیر بوڑھے چنار کی چھاؤں میں دوسرے مکانوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملائے، کھڑا بڑا بھلا لگتا تھا۔ موسم بہار میں مکان کی چھت پر بچھی ہوئی گھاس میں گل لالہ کھل اٹھتے۔ ماضی کی زرد مٹیالی سرزمین میں گُلِ لالہ کے وہ احمریں رنگ میرے تصور کو اب بھی توانائی بخشتے ہیں۔ میں اپنے کچھ ہم عمر ساتھیوں کے ہمراہ عظیم الشان چنار کی شاخوں میں بیٹھا شاہانہ انداز میں بہتے نالہ مار کی لہروں کو گھنٹوں گھورتا رہتا۔ کوئی اسے دیکھتا تو کہتا کہ یہ تو محض ایک بے ضرر سا چھوٹا چشمہ ہے اور کوئی مرغی بھی پاؤں بھگوئے بغیر اسے پار کر سکتی ہے۔ لیکن کادی کدل پُل کے پاس دریا کا پاٹ تنگ تھا۔ لہٰذا یہاں لہریں غضبناکی سے دونوں کناروں کے ساتھ سر ٹکراتی تھیں۔

اسلامیہ ہائی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن پھر اسی صغیر سنی میں سرینگر سے ہجرت اختیار کرنی پڑی۔ نالہ مار پہ تیرتی کشتیوں، لمبے لمبے ڈونگوں، بچہ نغموں، صوفیانہ کلام گانے والے جلیل القدر فنکاروں مخدوم صاحب کی شکستہ فصیل اور ایسے دوسرے ان گنت نظارے فضا میں تحلیل ہوگئے۔ میرے والدین نے سرینگر کو

چھوڑ کر کنگن کی حسین وادی میں نیا گھر بسایا۔ وہ میری پہلی ہجرت تھی۔ اس کے بعد ہجرتوں کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔ زندگی نے ٹھوکروں اور زخموں کی سوغات پیش کی۔ میں نے اس درد کو اپنے اندر سمیٹ لیا اور کندھوں پر فرائض کے صلیب لئے ایک جنگل سے دوسرے جنگل اور ایک دیہات سے دوسرے دیہات کا سفر کرتا رہا۔ مجھے بانڈی پورہ، وادی گریز، مڑھل، کرگل، دراس اور زانسکار جیسی دور دراز وادیوں میں ماہ وسال گزارنے کا موقع ملا۔

میرا پہلا افسانہ ''جمی'' اسلامیہ کالج کے میگزین بادام واری میں شائع ہوا2۔ میں نے بی اے پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب میں آنرز کیا۔ اب میرا تقرر محکمہ اطلاعات میں بحیثیت اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ہوا۔ میں نے جب اطلاعات کی دنیا میں قدم رکھا تو بالکل اکیلا اور اپنا سہارا آپ تھا۔ یہاں کسی نے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ کسی نے میرے شوق کو جلا نہیں دی۔ لیکن میں نے زندگی کے جو قیمتی ماہ وسال شہر سے گاؤں جاتے ہوئے اور گاؤں سے شہر آتے ہوئے گزارے تھے انہوں نے میری جھولی میں معاشرتی زندگی کے دو مظاہر کی سوغات ڈالی تھی۔ اب میری روح گاؤں میں رہتی ہے اور دل شہر میں۔ اس طرح میں گویا مظاہر کا سنگم بن گیا تھا۔ ان مظاہر کے متضاد رنگ انسانی روح کی منتشر بستی سے گھل مل کر میرے فن کی بنیاد بنتے۔ میں نے زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور اس کے مختلف عنوانات قائم کئے۔ میرے قلم نے زندگی کو کبھی ''سراب'' کہا تو کبھی اسے ''ایک رات کی جنت'' پکارا۔

روزنامہ آفتاب کے ادبی ایڈیشن میں میرے جو افسانے شائع ہوئے

ان میں ''دل کا کیا رنگ کروں؟، سو سال بعد، سپنے ٹوٹ گئے، کہاں ہو تم، نملی، برے لوگ، کھوکھلی دیوار، اور میں ہوں تصویر خزاں'' بھی شامل ہیں۔ میرے کئی افسانے ملک کے بعض معتبر رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ آج کل (نئی دہلی) میں میرے افسانے ''ایک رات کی جنت اور صحرا مسافر نخلستان'' شائع ہوئے، ماہنامہ روبی (نئی دہلی) ماہنامہ کہکشاں (ممبئی) اور دبستاں میں بھی کئی ایک کہانیاں شائع ہوئیں۔ میرا پہلا ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' روزنامہ آفتاب میں لگ بھگ چھ ماہ تک ہر ہفتے شائع ہوتا رہا۔ اس کا اجرا کشمیر کے ادیبوں کی ایک نمائندہ ادبی تنظیم کی محفل میں مارچ ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ اس ناول کے متعلق مقتدر ناقد حامدی کاشمیری لکھتے ہیں3:

''جان محمد آزاد نے کشمیر کے کہستانی علاقے کاغان کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست و محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ طبقاتی نظام کی چیرہ دستیاں، معصوم لوگوں کے خواب، ان کے حسرتیں اور آرزوئیں بظاہر یہ ایک سیدھی سی کہانی ہے لیکن مصنف نے اس کہانی کو پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں کے بدلتے موسموں کے متنوع رنگوں سایوں اور روشنیوں میں تحلیل کر کے اس کی شعری تعبیر کی ہے اور یہی بات اسے جاذب نظر بناتا ہے۔ ناول میں رومانی آرزومندی کے دل کش رنگ ملتے ہیں''۔

ناول کا جائزہ لیتے ہوئے ممتاز صحافی یوسف جمیل لکھتے ہیں4:

''جان محمد آزاد کی تحریریں اپنے وطن کے اپنے لوگوں کے گرد گھومتی ہیں۔ کشمیر کے ادبی افق پر گزشتہ عشرے میں کئی نئے ستارے نمودار ہوئے جن

میں سے بیشتر ڈوب چکے ہیں۔ چندا بھی ٹمٹمارہے ہیں اور بعض کے سورج اور چاند بننے کی امید کی جاسکتی ہے۔ میں جان محمد آزاد کو آخر الذکر ستاروں میں سمجھتا ہوں''۔

اس ناول پہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی جائزے پیش کئے گئے۔ ڈاکٹر محمد زمان آزردہ صاحب کتاب کا تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں5:

''جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کی مالی امداد سے شائع ہونے والا یہ ناول زبان و بیان و کہانی کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ مصنف نے کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے کو اپنی کہانی کے پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے اور مشاہدہ عینی معلوم ہوتا ہے۔ مناظر ڈرائینگ روم میں سوچے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ شاعرانہ انداز بیان نے کہانی میں اور لطف پیدا کیا ہے۔ کشمیر کی ان دور افتادہ وادیوں کی بے لوث زندگی میں کس طرح خود غرضی اور بے حیائی باہر سے آتی ہے۔ شہروں کے ٹھیکیداران سادہ لوح لوگوں کا کس طرح استحصال کرتے ہیں۔ ناول میں اس طرف بھی خوب اشارے کئے گئے ہیں''۔

''شیرازہ'' میں بھی میری کہانیاں مسلسل شائع ہوتی رہیں۔ اس کے نوجوان نمبر میں میرا افسانہ ''بہار کی دستک'' شامل کیا گیا۔ اس کے بعد نومبر دسمبر ۱۹۸۱ء کی ایک اور خاص اشاعت میں میری کہانی ''پہلی برف باری کے بعد'' شائع ہوئی۔ اس افسانے سے ایک اقتباس:

''سردی کی وجہ سے اس کا نحیف جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ جہلم کے کنارے ایک مصروف چورا ہے پر اپنے

چھیتڑے سمیٹے وہ جیسے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ اکا دکا لوگ گرم اونی کپڑے پہنے تیزی سے آجا رہے تھے۔ بھوک اور منجمد کر دینے والی سردی سے سندری کے ہاتھ پاؤں بھی بے جان سے ہو چکے تھے۔ کسی فیشن ایبل خاتون کو گزرتے دیکھ کر اس نے کئی بار بھیک مانگنے کا ارادہ تو کیا لیکن اپنے بوسیدہ پھرن کے نیچے بجھتی ہوئی کانگڑی کی ہلکی آنچ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ وہ شدید خواہش کے باوجود اپنا ہاتھ باہر نہ نکال سکی...... برف کے کوثر و تسنیم میں دھلے ہوئے نرم نرم گالے روئی کی طرح اڑ رہے تھے......"

میں نے کچھ مضامین لکھے۔ کچھ ترجمے بھی کئے۔ کشمیر کی ہزاروں سال پرانی تاریخ کے پس منظر میں کئی کہانیاں بھی لکھیں۔ ان میں مہارانی دِدا اور شاہ میر، آصف جاہ کا خواب حبہ خاتون کی خواب گاہ، جب للتا دتیہ نے خود کو جلا ڈالا، ولر کے پار، بومبر لولرے اور خزاں کی بیٹی جیسی کہانیاں شامل ہیں۔ ریڈیو کشمیر سے میرے بہت سے افسانے نشر ہوئے۔ نو برا وادی پہ لکھا ہوا میرا فیچر مضمون ریڈیو کشمیر سے نشر ہوا اور اسے بعد میں آل انڈیا ریڈیو کے جریدے "آواز 6" میں بھی خصوصی طور شامل اشاعت کیا گیا۔ میں ایک مقامی روزنامے کے لئے لگ بھگ دو برسوں تک ہفتہ وار کالم "سخن ہائے گفتنی" بھی تحریر کرتا رہا۔

میرا دوسرا ناول "کشمیر جاگ اٹھا" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس کی رسم رونمائی ایک پُر شکوہ ادبی محفل میں ہوٹل شاہ عباس میں منعقد ہوئی۔ بعض لوگ ادب کو سیاست اور مذہب سے علیحدہ سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک ادب ان کا نقیب ہوتا ہے۔ اس ناول کے ٹائٹل کی تحریک مجھے منشی محمد الدین فوق کے اس شعر

سے حاصل ہوئی۔

کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے

اس کا ٹائیٹل اپنے یہاں کے ممتاز مصور شجاع سلطان نے نہایت عرق ریزی کے بعد بنایا۔ یہ کتاب آفسیٹ پہ شائع ہوئی۔ کتاب نے کشمیریوں کے نواہائے جگر سوز کو چھیڑا تھا۔ ڈاکٹر برج پریمی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا7:

''جان محمد آزاد کے اس ناول کا موضوع اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہاں کے دلآویز حسن کی حشر سامانی کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس سیاسی سماجی اور معاشی آشوب کو بھی پیش کیا ہے جس نے افلاس ناداری اور بے بسی کی لکیروں سے ان کی تقدیر کو سیاہ کر دیا تھا۔ آزاد نے شہروں اور قصبوں سے دور بال تل کے حسین دھندلکوں اور اس کے گرد ونواح کو پیش کیا ہے۔ یہاں کی معصوم اور بے ریا زندگی کے دامن پر ڈوگرہ شاہی کے خونین رقص کو اپنے خون جگر سے پینٹ Paint کیا ہے۔ آزاد نے اپنے قلم کی نوک سے ان آنسوؤں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے جن میں صدیوں کا ملال چھپا ہوا ہے''۔

ڈاکٹر حامدی کشمیری کتاب کے اپنے حرف اول میں یوں رقم طراز ہیں:

''کشمیر کی نئی نسل میں جان محمد آزاد ایک محنتی، ذہین اور دردمند ادیب ہیں۔ وہ بیدار ذہن کے مالک ہیں اور گہرے شعور کے ساتھ اپنی گرد پیش کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بنیادی طور وہ ایک شاعر کے نازک احساس خواب آفرینی اور زبردست مشاہدے سے آراستہ ہیں لیکن ان کا

ذہن معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات کے تجزیے پر اصرار کرتا ہے۔ ایک سچے ادیب کی طرح ان کی نگارشات پر سیاسی اقتصادی اور معاشرتی حالات بے حد شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کا ناول داخلیت اور خارجیت کے ارتباط کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ وہ نہ خارجیت کے اسیر ہو کر میکانکی حقیقت نگاری پر اتر آتے ہیں اور نہ ہی داخلیت کی خالص تقلیلی صورت کو روا رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ناول سماجی رومانی اور سیاسی فضا کا مشترکہ خاکہ بن کر ابھرتا ہے۔ ''کشمیر جاگ اٹھا'' میں آپ نے کشمیر کے ایک دور افتادہ اور خوابیدہ جنگلی علاقے میں مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوم اور بے زبان انسان کی کہانی بیان کی ہے۔ ماہتاب اس کا خاوند دلاور لون حشمت خان، ساس، نادر اور گلریز سب اسی جبر و تشدد کے دور کے نمائندے ہیں۔ انہوں نے ماہتاب کے کردار کی گہرائیوں میں ممتا کی عظمتوں کو ابھارا ہے۔ پورے ناول میں فطرت کا کردار ایک زندہ تغیر آشنا اور ہم راز و ہمدم کردار کی طرح خاموشی سے اپنا رول ادا کرتا ہے''۔

میری ایک اور کتاب ''آداب صحافت'' نومبر ۱۹۸۸ء میں ... اس کی رسم اجرا کشمیر یونیورسٹی میں ابلاغ عامہ کے شعبے کے سربراہ پروفیسر منظور الامین کے ہاتھوں ہوئی۔ اس سلسلے میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آداب صحافت اردو میں فن صحافت کی مبادیات پہ شائع

ہونے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ کتاب کے اپنے طویل اور پُر مغز پیش گفتار میں جناب محمد یوسف ٹینگ تحریر کرتے ہیں8:

''میں جان محمد آزادؔ صاحب کی اس کاوش کو کتاب سے زیادہ ایک بشارت جانتا ہوں جو ہماری صحافت کی تابندگی، توانائی، تطہیر اور تکبیر کی دعا بھی ہے اور اس کا اعلان بھی......اس کتاب میں صحافت کے بڑے منصب کے بارے میں جو باتیں کہی گئیں ہیں وہ نئے امکانات کے بیج ہیں جو ضرور بار آور ہوں گے۔ آزاد صاحب ہمارے صحافت شناسوں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر اس نسل کے نمائندہ میں صحافت کا یہ تصور ابھر رہا ہے تو اس کا صریح مطلب ہے کہ یہ بجلیاں زیادہ دیر تک بادلوں میں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ یہ تڑپ تڑپ کر آخر کار ہماری زمین دل اور کشتِ ضمیر پر گر پڑیں گی''۔

ریاست کے بزرگ صحافی جناب این، ایل واتلؔ نے ریڈیو کشمیر سے اس کتاب کا مدلل جائزہ پیش کیا ہے9۔ انہوں نے کہا:

''فاضل مصنف نے اس کتاب میں صحافت کے پیشے کے متعلق کچھ ایسی کارآمد باتیں درج کی ہیں جس سے نو آموز لوگوں کو بے پناہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ کتاب کی افادیت اور وسعت میں بلاشبہ کوئی تامل نہیں۔ کیونکہ اس کو عہد حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب صحافت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ایک قابل قدر اور قابل داد اضافہ ہے''۔

جواں سال اور ہر دلعزیز صحافی یوسف جمیلؔ ''آدابِ صحافت'' کے تعارف میں اپنی آرا ظاہر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''جان محمد آزاد نے آدابِ صحافت کے ذریعہ ایک عظیم خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب ایک ورثہ سمجھی جانی چاہئے کیونکہ اس میں پہلی بار یہاں کے مخصوص حالات میں ابلاغ عامہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور صحافت کے مختلف شعبوں پر ماہرانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے صحافی بھی اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں''۔

''آدابِ صحافت'' کو صحافی برادری کی طرف سے خصوصاً اور عام قاری کی طرف سے عموماً قبول عام حاصل ہوا۔ کتاب کے متعلق جن دیگر شخصیات نے تبصرے تحریر کئے ان میں موتی لال ساقی 10 ، رشید شاہد 11، غلام رسول عارف 12، اظہر نعیمہ احمد 13 وغیرہ شامل ہیں۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے متعلقہ شعبے نے بھی اس کاوش کو قابل داد اور مستحسن قرار دیا۔ بیرون ملک اردو پڑھنے والوں کے ہاں بھی اس کتاب کا چرچا رہا۔

ابھی ابھی راقم السطور کی نئی کتاب ''ظلمات کے مسافر'' چھپ کر آ گئی ہے۔ اس کتاب کے انتساب میں ہی اس کا اندرون جھلکتا ہے۔ انتساب کچھ اس طرح ہے، زوجیلا کی اُن لرزاں خیز چوٹیوں کے نام جن کی برف پوش گہرائیوں میں آج بھی نہ جانے کتنی انسانی لاشیں دفن ہیں۔ جن خون آشام چوٹیوں کے اس پار کی سیاہ بخت سرزمین میں نہ جانے کتنی کھوکھلی روحیں اور کھوکھلے جسم آج بھی طلسم دوش و فردا کے اسیر ہیں''۔ ''برفیلے لمحوں کا جنگل، کشمیر کے پس منظر میں تحریر کیا جانے والا نیا ناول جو عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے۔ ایک اور ضخیم ناول شعاعوں کی صلیب'' اب تکمیل کے مراحل میں ہے۔ یہ ناول ان عزیزوں کے نام منسوب ہے جو وطن کی جھیل

پر کنول بن کر ہمیشہ مسکراتے رہیں گے۔

---

1 آداب صحافت ص ۱۸۸

2 بادام واری جون ۱۹۶۷ء ص ۲۲

3 وادیاں بلا رہی ہیں: پیش لفظ ص ۵

4 روزنامہ آفتاب (نئی کتابیں) ۱۰ ر فروری ۱۹۸۱ء

5 شیرازہ جون جولائی ۱۹۸۱ء ص ۱۰۱

6 آواز ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۳

7 کشمیر جاگ اٹھا: پیش لفظ ص ۶

8 پیش گفتار آداب صحافت ص ۹

9 یہ جائزہ بعد میں روزنامہ خدمت میں بھی شائع ہوا۔

10 ماہنامہ تعمیر مارچ اپریل ۱۹۸۹ء

11 افق ص ۱۹ ر آداب صحافت

12 روزنامہ ہمدرد ۱۴ ر مئی ۱۹۸۹ء

13 ہفت روزہ چٹان ۲۶ ر فروری ۱۹۸۹ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

بشیر شاہ

آواز کی دنیا کے سامعین کے لئے بشیر شاہ کا نام اجنبی نہیں ہوسکتا۔ ماہ و سال کی آشنائی نے سننے والوں کو ان کے سٹائل سے مانوس کر دیا ہے۔ وہ خود گو پس منظر میں رہتے ہیں لیکن براڈ کاسٹنگ کے جس شعبے سے بھی وابستہ ہوں اس میں ایک نفاست اور ایک نئی جہت کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس نفاست اور جاذبیت کا خمیر دار اصل ان کی شخصیت سے ابھرتا ہے۔ انہیں دیکھ کر نیلے بیکراں آسماں میں اڑنے والے ان سفید دھلے دھلائے بادلوں کا تصور آتا ہے جن کی ایک ایک نوک اور ایک ایک قوس کو دست فطرت نے تراش خراش کر ترتیب دیا ہو۔

اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق میرے استفسار پر ان کی آنکھیں ان ہی بدلیوں میں کھو گئیں جیسے دور کہیں ماضی کی سرزمین میں بھٹک رہے ہوں۔ ''جھیل کے کنارے کا خطہ کشمیر میں ادب کی تشہیر و تبلیغ میں معاون ثابت ہوا ہے۔ میں بھی ڈل گیٹ کے اسی خطہ میں ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوا۔ اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ جہاں ایک ادبی ماحول سا تھا۔ ملک کے ممتاز افسانہ نگار ''نور شاہ'' میرے بڑے بھائی تھے۔ امر سنگھ کالج کے میگزین کے اردو سیکشن کا میں ایڈیٹر رہا۔ اسی میگزین میں میرے کئی

ابتدائی افسانے شائع ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد میں نے مستند ناقد سروؔری صاحب کی نگرانی میں وؔلی دکنی پہ تحقیقی کام شروع کیا تھا۔ لیکن سروؔری صاحب کی موت کے بعد پروجیکٹ تشنہ تکمیل رہا اور اسی دوران میں نے ریڈیو کشمیر میں ملازمت اختیار کی''۔

اس دوران آپ کے افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ شاعر، کتاب، بانو اور آج کل کے علاوہ ملک کی نشریاتی نیٹ ورک کے ترجماں رسالے ''آواز'' میں آپ کی چیزیں پابندی سے شائع ہوتی رہیں۔ کلچرل اکیڈیمی نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کا جو''انتخاب اردو ادب'' شائع کیا اس میں آپ کا افسانہ ''محبوبہ'' شامل ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس:

> اس کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے۔ کسی پَر کٹے پرند کی مانند۔ حلق کی رگیں تن سی گئیں۔ ہونٹوں پہ زبان پھیرتے وہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ رہے تھے۔ میں نے سسٹر سے پانی کے گلاس کے لئے کہہ دیا۔ وہ اب کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا ہو۔ میں اس کے پلنگ پر جھک گیا۔ اس کا آخری وقت قریب تھا۔ ''محبوبہ؟'' اس کے ہونٹوں پہ کسی لڑکی کا نام تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بار بار اس نام کو دہرا رہا تھا۔ نرس پانی لے آئی لیکن وہ اپنی محبوبہ کا نام ہی گھول گھول کر پی گیا تھا''۔

یہ کہانی بھی بشیر شاہ کی دیگر کہانیوں کی طرح کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت

کچھ کہہ جاتی ہے۔ جو درد اس افسانے کے مرکزی کردار نے اپنے رگ وپے میں تحلیل کیا ہے۔ وہی درد اپنی توانا تخلیق کے ذریعہ کہانی کارقاری کو بھی منتقل کرتا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کی کھینچا تانی نہیں۔ یہ اپنا مافی الضمیر نہایت صاف اور نکھری ہوئی نثر میں ادا کرتے ہیں۔ ریڈیو سے اس دوران آپ کی جو تحریریں نشر ہوتی رہیں ان میں سے بعض مقصدی اور اصلاحی ہوتی تھیں۔ کئی ایک علمی اور ادبی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ مختصر اور ہلکی پھلکی چیزوں کی طرف زیادہ راغب ہونے لگے۔ اخلاقی اقدار کی حامل آپ کی کی تحریریں ''بوند بوند روشنی'' کے عنوان سے برسوں تک نشر اور شائع ہوتی رہیں۔ اظہار کی اس اکانومی کے متعلق وہ کچھ یوں سوچتے ہیں۔

> ''میں ادب کی ضخامت میں محض Quantitative اضافے کا قائل نہیں ہوں۔ جب ہم ادب کو عصری معنویت دینے کے متحمل نہیں ہوسکتے، فن اور زبنان سے مستحسن طور لوہا نہیں لے سکتے۔ تو غیر متعلق فکشن کے انبار لگانے کا کوئی جواز نہیں۔ ایسے کچھ تخلیقی ساحر تو بہرحال نکل ہی آئیں گے جو اس صنف کی شایانِ شان تخلیق زمانے کے سامنے رکھ دیں گے''۔

اپنی علالت کے زمانے کی محسوسات ''ذات نامہ'' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ پھر اپنے روزنامچے کے کچھ اوراق ''تیز ہوا تنہا پھول'' کے عنوان سے ترتیب دئے ہیں۔ لیکن یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوسکی ہے۔ کشمیر میں کتابوں کی اشاعت اور ان کا نکاس کس قدر صبر آزما مرحلہ ہے۔ یہ بات اس کا ایک عندیہ دے سکتی ہے۔

ریڈیو ڈراموں کی طرف بھی بشیر شاہ سنجیدگی سے توجہ دیتے رہے ہیں۔ ہمارے بیشتر ڈرامہ نگاروں کے برخلاف آپ نے اس صنف کی تکنیک سمجھنے میں عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ آپ کا ریڈیو کشمیر سے نشر ہونے والا ڈرامہ "تم میرے پاس رہو" بے حد مقبول رہا ہے۔ اس کا ہر کردار جیتا جاگتا اور متحرک ہے۔ یہاں بھی ایک حساس فن کار کچھ کرامات کو اپنے خونِ جگر سے پینٹ کر کے تہہ در تہہ انسانی نفسیات کی گرہیں کھولتا ہے۔ اردو کے سرکردہ ادیب اوپندر ناتھ اشک نے اسے ریڈیو ڈراموں میں ایک بہترین اضافہ قرار دیا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

شمس الدین شمیم

شمس الدین شمیم نے اپنا ادبی سفر روزنامہ آفتاب سے شروع کیا۔ اس کی بعض ابتدائی کہانیاں اسی روزنامہ کے ادبی صفحے میں شائع ہوتی رہیں۔ انجمن آرائی کا چسکہ انہیں نوعمری سے ہی تھا۔ چنانچہ مختلف ادوار میں نیم تہذیبی، نیم سیاسی اداروں کے علاوہ بعض ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے۔ اپنی ان سرگرمیوں کی وجہ سے ہم عصر افسانہ نگاروں میں خاصے معروف بھی رہے۔ ۱۹۷۴ء میں اپنے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''ویرانے'' شائع کیا اور اس کی تشہیر کے لئے زبردست کوششیں کیں۔ ''ویرانے'' کے ایک پیرے گراف پر مشتمل پیغام نما دیباچے میں ڈاکٹر حامدی یوں اظہار کرتے ہیں:

''شمس الدین کے افسانوں میں گرد وپیش کی معاشرتی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا شعور آئینہ ہو جاتا ہے۔ وہ دردمندی اور خلوص سے سماجی بُرائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر افسانوی تانے بانے میں بُننے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ ابھی چند برسوں سے ہی افسانے لکھ رہے ہیں امید ہے کہ آئندہ وہ

اس فن کے تکنیکی رموز سے گہری واقفیت پیدا کریں گے''

ان کے افسانے کبھی جدیدیت کے پرستار دکھائی دیتے ہیں اور کبھی روایتی پسندی کے۔ ''عمارت'' اور ''قیدی'' میں یہ تجریدی رجحان سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن یہ بہت مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ اس کے مختلف قوموں، تہذیبوں اور علامتوں کی واقفیت نہایت ضروری ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے ابہام کا شکار نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنی بلند خیالی میں تجریت کی نئی منزلیں چاہے طے کرے لیکن افسانے کی معنویت بہر حال واضح ہونی چاہئے۔

ان کے بعض افسانوں میں عصری زندگی کی زخمی تمنائیں سسکتی نظر آتی ہیں۔ ''انگلیاں'' اس سلسلہ کا ایک منفرد افسانہ ہے اس افسانے وہ جدید اور قدیم کے درمیان جھولتے نظر نہیں آتے ہیں۔ یہ ایک شال باف ممہ جو کی کہانی ہے جو اپنی فنکارانہ چابک دستی سے شالوں کی زیبائش میں چار چاند لگاتا ہے۔ جو زندگی کے شام کے سائے میں شکستہ پا کھڑا ہانپ رہا ہے۔ ایک طرف اُس کی چار جوان لڑکیاں اپنے ہاتھ کھولے مہندی کے انتظار میں کھڑی ہیں اور دوسری طرف خواجہ سبحان کھڑا ہے جو برسوں سے اس کی عرق ریزی کا استحصال کرتا رہا ہے۔ حالات اُسے مایوس کر دیتی ہیں اور وہ خود اپنی اُن انگلیوں کو کاٹ ڈالتا ہے جن کی عظمت سے خود اسے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ یہاں انہوں نے اردو افسانے کے مفہوم کو نئی وسعتوں اور انداز بیان کی نئی کفالت Economy of Expression سے روشناس کرایا ہے۔ ''پھاوڑے کی بیٹی'' بھی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں نچلے طبقے کے لوگوں کی بے بسی کا گہر

مطالعہ جھلکتا ہے۔ کردار نگاری کا فن بھی پختہ ہے اور اکثر کردار متحرک نظر آتے ہیں۔ شمیم کے بعض ڈرامے بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے پیش کئے گئے ہیں۔ اب وہ خود بھی دوردرشن کیندر سرینگر سے وابستہ ہیں۔ ادھر آپ کے افسانے ملک کے بعض مقبول رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ تاہم اس معروف اسلوب تحریر سے فکشن کی دنیا کافی امیدیں لگائے ہوئے ہے۔

پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ایم،نسآء

آپ کا اصلی نام میمون النساء ہے۔ آپ یکم جنوری ۱۹۵۱ء کو شہر سرینگر کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ فتح کدل کے ایک سرکاری اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نوا کدل کے زنانہ کالج سے بی اے پاس کرنے کے دوران ہی آپ کے دل میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ادبی زندگی کا آغاز اسی کالج کی ایک محفل میں ایک بلاعنوان کہانی پڑھنے سے ہوا لیکن آپ نے باقاعدہ طور جنوری ۱۹۶۹ء سے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا۔ ''تیری یاد ستائے'' پہلی کہانی تھی جو کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کی ادبی محفل میں پڑھی۔ اس محفل میں اور لوگوں کے علاوہ ادبیات شناس پروفیسر سرورؔ بھی بیٹھے تھے جنہوں نے یہ کہانی سُن کر ایم نساء کے شاندار ادبی کیریر کی بشارت دی۔ اس کے آگے کی روئیداد ایم نساء خود سناتی ہیں۱:

''کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد میں نے ایک کہانی ''کیا میں قاتل ہوں''؟ لکھکر پروفیسر سرورؔ صاحب کو دکھائی۔ انہوں نے کہانی پڑھی اور مجھ سے کہا کہ یہ کہانی کسی مقامی روزنامہ میں شائع کراؤ۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی میرے حوصلے کسی حد تک بلند ہوئے۔

حامدی صاحب اور پروفیسر شکیل الرحمان صاحب وقتاً فوقتاً میری اردو کہانیوں کی اصلاح کرتے رہے"۔

ایم نساء کا افسانوی مجموعہ "گلدستہ نساء" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ یہ افسانوی مجموعہ فنی اور لسانی غلطیوں سے پُر تھا۔ لہٰذا ادبی حلقوں میں اسے ڈاکٹر حامدی اور ڈاکٹر شکیل الرحمان کے دیباچے کے باوجود وہ قدر و منزلت حاصل نہیں ہوسکی۔ تاہم نساء بہت دیر تک اور بہت دور تک سماج کی فرسودہ قدروں کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھتی رہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ستھر کی دہائی کے دوران آفتاب کی ادبی محفلوں میں اس خاتون افسانہ نگار کے مداحوں اور معترضوں میں قلمی جنگیں چلتی رہیں۔ ان پر یہ الزام تھا کہ ان کی تحریروں میں بے ریا حقیقت نگاری کے باوجود کہیں کہیں عصمت چغتائی کا سا شوخ رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ ایم نساء اب برسوں سے ادبی میدان سے کنارہ کش ہوگئیں ہیں۔

---

1 ارمغان کشمیر ص ۳۱۵

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
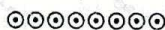
ویریندر پٹواری

ویریندر پٹواری نے ادبی ماحول ورثے میں پایا ہے۔ ان کے والد پریم ناتھ پٹواری مسرور تخلص کرتے تھے۔ ویریندر پٹواری نے ۱۹۶۵ء سے افسانے لکھنے شروع کئے اور پھر مسلسل چند برس تک اُن کی کہانیاں اُردو کے بعض معروف جرائد میں چھپتی رہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''فرشتے خاموش ہیں'' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں اُن کے چودہ افسانے شامل ہیں۔ جن میں اچھے، بہت اچھے اور بعض کم اچھے افسانے ہیں افسانوں میں اسلوب کی تازگی بھی ہے اور افسانہ نگار کے منفرد اسلوب کے ساتھ موضوعات کے تقریباً عدم تنوع کے باوجود تخلیقی کرب کی کھائیاں عبور کرسکنے کا حوصلہ بھی۔ جدید میلانات اور رجحانات نے انہیں شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ بعض افسانوں میں تکنیک کے اچھوتے تجربے کئے گئے ہیں۔

''ریت کی دیوار'' بڑی دردناک کہانی ہے۔ ایک ایسے نوجوان کا افسانہ جو اپنی بڑی بہن کے سہارے عیش وعشرت کی زندگی گزارتا ہے لیکن ایک روز جب وہ ایک نئے مرمریں جسم کو خریدنے نکلتا ہے تو اُسے خود اپنی ہی بہن کا بدن پیش کیا جاتا ہے......! یہ ایک اچھا نفسیاتی مطالعہ ہے اور موضوع کے انوکھے پن نے اس کی تاثیر

اور بھی بڑھادی ہے۔ ویریندر کو اپنے افسانوں میں عصری آگہی کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کا بھی احساس رہا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے مشاہدے سے دردمندی اور انسان دوستی کے زندہ پیکر تراشتے ہیں۔ ''فرشتے خاموش ہیں'' اور ''انتظار'' عنوان کی کہانیاں افسانہ نگار کے بالیدہ شعور کی غماز ہیں۔ لیکن افسانوں میں بالعموم ''مقامی رنگ'' نظر نہیں آتا بعض کہانیاں فلمی دنیا کے شب وروز کے محور پر گھومتی ہیں۔ خواب وخیال کا یہ جہاں زیادہ وسیع مشاہدے اور ادراک کا متقاضی تھا۔!

دوسری کرن کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جوتیشور جی 1 لکھتے ہیں کہ اس مجموعہ میں ان کا افسانہ ڈرپوک قابل ذکر ہے جس میں ویریندر پٹواری نے ایک بچے کی نظروں سے اپنے گرد کے اُن کرداروں کا محاسبہ کیا ہے جو یا تو اُس سے پیار کرتے ہیں یا اس کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ انہیں کرداروں کے ذریعے وہ اچھے اور برے کا موازنہ کرتا ہے۔ اس کہانی میں چڑیل کا کردار ہمارے سماج پر ایک سیاہ فام آسیب کی مانند ہے جس سے تمام تر ماحول سراسیمہ ہے۔ یہ علامتیں ایک گھر کی کہانی تک محدود نہیں بلکہ ان میں ہمارے پورے معاشرے کی عکاسی ہے۔

ہمدرد ہمارے متوسط طبقے کے اُن لوگوں کی کہانی ہے جو اپنی سماجی ضروریات کے پیش نظر سرکاری امانت میں خیانت کرکے پولیس کے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں۔ مسٹر کول انہیں مجبوریوں سے گھیرا ہوا ایک کردار ہے۔

اس مجموعہ کی آخری کہانی ''کل کیا ہوگا'' علامتی کرداروں پر مبنی ہے۔ اس کہانی میں عورت کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے چنانچہ یہاں دکھایا گیا ہے کہ

کس طرح ادب کے نام پر لوگ لیڈری کی دکان چمکاتے ہیں اور حقیقی طور مظلوم کو فراموش کر دیتے ہیں۔

احمد عثمانی 2 ویریندر کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں ''پٹواری کی کہانیوں میں روایتی پن ضرور ہے لیکن جدید امتزاج کا فقدان ہے۔ ان کی کہانیوں میں کوئی نیا پن نہیں ملتا جس نے جگن ناتھ آزاد کو چونکا دیا ہے۔ دراصل دوستانہ تعلقات میں بعض لوگ نئے لکھنے والوں کی غلط پشت پناہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے اچھا فنکار پیدا ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ تعلقات کا زہر فن کار کو گھلا کے رکھ دیتا ہے۔

---

1 تعمیر مئی ۱۹۸۸ء ص ۴۷

2 ماہنامہ جواز مالیگاؤں اپریل تا ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۰۷

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

بشیر گاش

ڈاکٹر بشیر گاش اُن مہم پسند ادیبوں میں پیش پیش ہیں جنہوں نے ادب کی دنیا کے خودساختہ دیوتاؤں کے بُت پاش پاش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی۔ اس بُت شکن نے ہم عصر افسانوی جواہر ریزوں کو ادبی سطح پر محفوظ کرنے کے لئے ''ارمغان کاشمیر'' نام کی کتاب مرتب کی۔ یہ ضخیم مجموعہ سال ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۲۴ر افسانہ نگاروں کی نوخیز تخلیقات شامل ہیں۔ دراصل یہ اُن نوعمر قلم کاروں کی کہانیاں ہیں جن کی صلاحیتوں کا علمی وادبی حلقوں میں اعتراف نہیں ہورہا تھا۔ حالانکہ سرزمین کاشمیر میں اردو نثر کا مستقبل ان ہی سے وابستہ تھا۔

حصول تعلیم کے بعد گاش نے محکمہ صحت میں ملازمت اختیار کی۔ ان کے افسانے اور مضامین آفتاب اور دیگر اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ لکھتے ہیں1:

''میری ایک ہی تمنا ہے کہ نئے لکھنے والوں میں اتنی ہمت اور صلاحیت پیدا ہو کہ وہ اس ریشمی اور خوشنما کفن کو چاک کرسکیں جس میں اس وادی کی سڑی گھلی لاش چھپائی گئی ہے تاکہ یہ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی جائے اور یہ جانا جائے کہ کون سے زہر سے اس کی موت واقع ہوئی ہے''۔

''اُگالدان 2'' اسی رجحان کی کہانی ہے۔ یہ ایک توانا تخلیقی شخصیت کی نثریت، ادبی دلآویزی اور عمیق خیالات کی نمائندہ کہانی ہے۔ صدیوں کی محرومی اور نامُرادی کس طرح عصر کا المیہ بن جاتی ہے۔ آپ بھی مُلاحظہ کیجئے:

''ماں! مجھے بکاولی کی کہانی مت سُناو۔ میں پھولوں کا شہزادہ نہیں۔ مجھے کہانی سُناو ایوبی کی، ٹیپو کی، مجھے زندہ رہنا ہے ماں ہزاروں جعفروں کے نرغے میں جلیانوالہ باغ میں، ہیروشیما میں، بندوقوں کے سائے میں، بموں کی زد میں، توپوں کے منہ میں''۔

''ڈل میں یہ پانی نہیں بلکہ قادر کے اسلاف کا پسینہ جمع ہے۔ رفتہ رفتہ عرق ریزی ہوتی رہی۔ ڈل بھرتا گیا، بھرتا گیا۔ کیا یہ پسینہ ایک دن تمام کشمیر کو بہا لے جائے گا۔ پھر سب کچھ بہہ جائے گا۔ نشاط بہہ جائے گا۔ شالیمار بہہ جائے گا!......''

''......اور کوئی سیاح اس کے ہاتھ سے چپو چھین کر اُسے طمانچہ مارے اور کہے اے ذلیل مخلوق! تمہارا ڈل ہماری لویٹری ہے۔ بین الاقوامی بیت الخلاء کو کوئی اپنی ملکیت نہیں کہہ سکتا۔ ہم نے اس خطِ زمین کو اسی لئے خریدا ہے''۔

''نوری! میرا تو جی چاہتا ہے کہ ڈل کے گیٹ کو ڈائنامیٹ سے اڑادوں۔ اس ساکت پانی کو آزاد کردوں۔ مدتوں سے ڈل کے پانی میں گناہوں کے جوہڑ کھلتے آئے ہیں۔ میں یہ پانی بدل دوں گا۔ نیل سے، ایمزن سے، نیاگرا سے، کوثر سے، زمزم سے، اپنی آنکھوں کے سمندر سے......''

یہ حروف برہنہ کشمیر میں اردو نثر کے ایک درخشندہ باب کی اولین عبارت ہے۔

1　ارمغان کاشمیر ص ۳۱۵

2　''رات پیاسی ہے'' کے جس افسانوی مجموعے میں یہ کہانی شائع ہوئی ہے اُسے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا گیا۔ (آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

سید ذیشان فاضل

سید ذیشان ایک ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ادب کا ذوق انہیں اپنے والد ''فاضل کاشمیری'' سے ورثے میں ملا ہے فاضل صاحب کشمیری کے ایک معروف شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو میں دیگر کئی تصانیف کے علاوہ ''تصویر حج'' کے نام سے ایک کتاب بھی تحریر کی ہے۔ سفر محمود میں عازمین کے جملہ ضوابط پہ سیر حاصل روشنی ڈالنے والی یہ کتاب اگرچہ ۱۹۵۹ء میں شایع ہوئی تھی تاہم اس کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ سید ذی شان اپریل ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۷۵ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر دوردرشن سے وابستہ ہو گئے۔

آپ اب گزشتہ کئی برسوں سے اردو کے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ آپ کا افسانوی مجموعہ ''سلسبیل'' ۱۹۸۲ء میں شایع ہوا۔ اس مجموعے میں دس کہانیاں شامل ہیں۔ ہر کہانی سے افسانہ نگار کی انفرادیت، اس کے منفرد اسلوب اور بے باک قلم کی توانائی صاف جھلکتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان۱ ان افسانوں کا جایزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......ان کہانیوں میں ہمارا سابقہ ایک صاف ستھری نثر اور حساس

ذہن سے پڑتا ہے جو موجودہ سماج میں سانس لے رہا ہے لیکن جس نے ہر جگہ آداب فن کو ملحوظ رکھا ہے......''

''آئیڈیل'' خوابوں کے ان شہزادوں کی کہانی ہے جو برسہا برس تک خیالوں کے صنم خانوں میں پوجے جاتے ہیں لیکن وہ گھڑیاں کتنی حوصلہ شکن ہوتی ہیں جب جوگن کو پتہ چلتا ہے کہ وہ جس بھگوان کی ساری عمر پرستش کرتی رہی ہے وہ محض ایک پتھر کا بت تھا۔ ''دہلیز'' انسان کی اپنی بازیافت کی کہانی ہے۔ ذی شان کی بیشتر دیگر کہانیوں کی طرح اس افسانے میں بھی کہانی اور ڈرامے کی سرحدیں پگھلتی نظر آتی ہیں۔ دوردرشن کے ماہ وسال کے دوران آپ نے ''کسک'' ''ضمیر'' ''تعبیر'' ''احساس'' '' کالے گلاب کی رات'' اور نہ جانے کتنے اور ڈرامے لکھے اس دوہرے رشتے نے آپ کے افسانوں کی تیکنیک پر بھی اثر ڈالا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں میں بیانیہ کے ساتھ مکالموں پر بھی اصرار کیا جاتا ہے۔ ''اجالوں کا شہر'' آج کی برق رفتار زندگی کا المیہ ہے لیکن اس کی تجرید میں کافی تشنگی ہے۔

''دھواں دھواں سورج'' آپ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں آپ کے چھے افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے آپ کی عصری آگہی کے غماز ہیں ان کہانیوں میں بقول ڈاکٹر کیول دھیر 2 تخیلات اور تمثیلات کا ہجوم نہیں ہے بلکہ حقیقی زندگی کے زندہ تلخ وشیریں حقائق ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار متحرک زندہ جاوید ہیں۔ آپ کی نئی کتاب ''پیغمبر'' کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ پیغمبر آخرالزماںؐ کے مکتوبات ومعاہدات پہ مشتمل یہ آپ کی ایک مستند اور

مستحسن کاوش ہوگی۔ ادھر آپ کے ڈراموں کا مجموعہ ''یادوں کا موسم'' بھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ یہ مجموعہ آپ کی تخلیقی فکر کے نئے رجحانات کا تعین کرنے میں تعاون ثابت ہوگا۔

---

1 سلسبیل: تقریظ از ڈاکٹر مسعود حسین خان

2 دھواں دھواں سورج: ڈاکٹر کیول دھیر ص ٦

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

واجدہ تبسم

کشمیر میں اردو فکشن کے ارتقا میں جن خواتین نے اپنی ادراک کے چراغ روشن کئے ہیں ان میں ایک اہم نام واجدہ تبسم کا بھی ہے۔ واجدہ ایک باسلیقہ افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا جنم سرینگر کے پائین علاقے عالی کدل کی گنجانیت میں ہوا تھا۔ آپ کا بچپن اور لڑکپن ان ہی تنگ وتاریک گلیوں میں گزرا۔ کشمیر کی حسین وادیوں کے بیچ یہ ایک اور پُر پیچ دنیا تھی جہاں نچلے اور متوسط طبقے کی معاشرتی اور نفسیاتی الجھنیں لوگوں کی نظروں سے مستور تھیں۔ واجدہ نے اس درد کو اپنے وجود میں تحلیل کر کے اسے فن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان ایام کی یادیں تازہ کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

"ان دنوں مجھے ریڈیو سننے کا بے حد شوق تھا اور اسی جنون کے تحت میں ریڈیو سے نشر ہونے والے بچوں کے پروگرام میں شریک ہونے لگی۔ اسی پروگرام نے میرے ذوق کو تحریک دی اور میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں مباحثوں اور مذاکرات کی محفلوں میں سرگرم حصہ لینے لگی۔ وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ میرا شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ دسویں

جماعت میں مجھے ایک بزرگ استاد کی رہنمائی حاصل ہوئی جو اردو کے معلم تھے۔ جب بھی کوئی مضمون، افسانہ، نظم یا غزل تخلیق ہوتی تو ان سے مشورہ و صلاح کی طالب ہوتی۔ مشفق استاد میری تحریر کو بڑی توجہ سے سنتے اور میں ان کے گرانقدر مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحریروں کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کرتی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ میرے افسانے اور میری غزلیں ملک کے مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہونے لگے۔ روزنامہ چنار کی خاص اشعار میں میرا پہلا افسانہ ''آہ کے اثر ہونے تک'' شائع ہوا......''

''ڈولتی نیا'' واجدہ تبسم کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جو دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل ۱۳/افسانے شامل ہیں۔ جن میں سے بیشتر جرائد واخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ افسانوں کی زبان نہایت ستھری نکھری اور الفاظ نہایت جچے تلے ہیں۔ اس سلاست اور روانی میں جھرنوں کا سا آہنگ ہے۔ اس سہل، سادہ اور سلیس ادائیگی میں نفاست اور نزاکت کا ایک اچھوتا امتزاج نظر آتا ہے۔ ''ڈولتی نیا'' اس مجموعے کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ یہاں محبت کے بھنور میں ہچکولے کھاتی ہوئی ریحانہ کی ناؤ بلآخر کنارے سے لگ جاتی ہے۔ کہرے میں گھری اس کی زندگی حقیقت کے اجالے سے خیرہ ہوجاتی ہے۔ وہ گمراہی کی دلدل میں گرنے سے بچ جاتی ہے۔ لیکن پل صراط کے اس سفر میں اس پر کیا کچھ گزرتی ہے اِس سے اُس کا شوہر اور اس کا محبوب دونوں بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہاں عصری حیثیت بہت تیز وتند ہے۔ شعریت کی مٹھاس کا رنگ بھی اس افسانے میں نمایاں ہے۔ ایک اقتباس:

''شام ڈھل چکی تھی۔ دلآویز نظارہ شب ماہ کا تھا۔ کوہستان مشرق سے ماہ کامل نے اپنا سر اٹھا کر وادیٔ تاریک کو اپنی نورانی شعاعوں سے بھر دیا تھا۔ پہاڑوں کے آسیب دار سایوں کا سمٹنا اور سمٹ کے ان دامنوں سے لپٹ جانا اور میدان پر چاندنی کا چھٹکنا گویا کہ تاروں بھری رات زمین پر اتر آئی تھی''۔

لیکن ''وقت کے گھاؤ، بیوہ'' اور بعض دیگر افسانوں میں مشاہدہ اتنا تہہ دار نہیں۔ یہاں معنوی وسعت بھی سمٹی سی ہے۔ وہ ایک کنوینشنل افسانہ نگار کی طرح یاسیت پسندی میں مقید ہو کر رہ گئی ہیں۔ دراصل یہاں فن کی جڑیں موضوع کی زمین اور فن کار کے وجود میں پوری طرح پھیل نہیں سکی ہیں۔ تاہم ''بے نور چاندنی'' میں جہیز کی زنجیروں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ سماج کے ان مکروہ رسموں نے نجمہ جیسی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگی برباد کر دی ہے۔ واجدہ ان دقیانوسی رسومات میں بدلاؤ کی متمنی ہیں۔ جذباتیت سے مغلوب ہو کر افسانہ خطیبانہ رنگ اختیار کرتا ہے۔ افسانہ نگار پوچھتی ہیں کہ کب تک معصوم جانیں ایسے رسوم کی صلیب پر چڑھائی جائیں گی۔ کب تک آشاؤں کے تاج محل ریزہ ریزہ کیے جاتے رہیں گے؟ لیکن ناصحانہ رجحان افسانے کو تخلیقی بلندی سے محروم رکھتا ہے۔

واجدہ ایک شیریں کلام شاعرہ بھی ہیں۔ انہوں نے متعدد ملکی سطح کے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ ایک شعری مجموعہ ''گل ہائے تبسم'' شائع بھی ہوا ہے۔ ریڈیو اور دوردرشن سے آپ کے بہت سے افسانے وغیرہ نشر اور ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔ اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان دنوں دوردرشن کیندر

(سرینگر) سے وابستہ ہیں۔ آپ مجلس نسواں اور بعض دیگر فلاحی و ادبی تنظیموں میں بھی سرگرم حصہ لیتی رہی ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
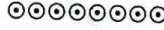
بشیر احمد نحوی

وادیٔ کشمیر کے ادبی و علمی حلقوں میں ''اقبالؒ اکیڈیمی'' کے قیام کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ اس انجمن کی چند یادگار مجالس کے دوران اسلامی آداب کے سانچے میں ڈھلا ایک نوجوان بار بار ناظرین کی توجہ کا مرکز بنتا۔ اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ اس بات کا غماز تھا کہ اسے علامہ اقبالؒ کی ذات سے عشق کی حد تک شغف ہے۔ وہ ہر مضمون کے ساتھ علامہ کی منسوب نظم اس بے تکلفی اور بے ساختگی سے سناتا کہ حاضرین کے منہ سے بے اختیار واہ نکلتی۔ اشعار کا یہ چلتا پھرتا دیوان کوئی اور نہیں بشیر احمد نحوی تھا۔

نحوؔی کا تعلق ضلع اسلام آباد کے بجبہاڑہ تحصیل سے ہے۔ ادب کا ذوق اسلام آباد کالج کے رسالے میں پروان چڑھا۔ آپ اس رسالے ''ویری ناگ'' کے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک ایڈیٹر بھی رہے۔ یہاں آپ نے متعدد مجلس مذاکرات میں حصہ لیا اور تحریر کے علاوہ تقریر کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ آب ولر کے یہ گوہر بھلا کہاں چھپے رہتے ہیں۔ ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد آپ نے ''اقبال اور تصوف'' کے موضوع پر پروفیسر آل احمد

سرور اور پروفیسر ضیاء الحق فاروقی کی مشترکہ نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس تحقیقی پروجیکٹ کے ساتھ سالہا سال کی Involement نے بادلوں میں چھپی بجلیوں کو آخر علمی ادب کی زمین پر گرا کے رکھ دیا۔ نحوی کے فکر وفن کا ایک سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے اردو کے مقتدر ناقد جناب مظہر امام تحریر کرتے ہیں:

''بشیر احمد نحوی ایک فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کے یہاں علم وآگہی کی صلابت بھی ہے اور خلوص ومحبت کی نرمی بھی۔ آپ تحریر وتقریر دونوں میں فکر وخیال کے گل بوٹے کھلاتے ہیں۔ آپ کی دلچسپیاں متنوع ہیں۔ اسلامی فکر وتاریخ پہ نظر کے علاوہ سیاسیات وعمرانیات آپ کی توجہ کے مراکز ہیں۔ اقبالؒ کا لگ بھگ سارا کلام حفظ ہے۔ اردو بھی، فارسی بھی۔ متعدد شعرا کی طویل نظمین بھی آپ کو یاد ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ادیبوں کے نثر کے ٹکڑے بھی وہ بلاترمیم پیش کر سکتے ہیں۔ نحوی کی تحریروں میں روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اسلامیات، عمرانیات اور اقبالیات آپ کے محبوب موضوعات ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ حضور پاک صلے اللہ علیہ وسلم کی کتاب زندگی کے روشن ابواب آج کے ظلمت کدے کو منوّر کر سکتے ہیں۔ ''تصوف'' نحوی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس موضوع کے مضامین میں آپ بہت عام فہم زبان میں یہ بتاتے ہیں کہ تصوف کا ماخذ ومخرج کیا ہے اور صوفیا کے وہ کون کون خاص سلسلے ہیں جنہوں نے ہندوستانی عوام کے دلوں پر گہرے نقش ثبت کیے''۔

گلشن مصفا اور حکیم مشرق کے علاوہ آپ کی کتاب ''اقبالؒ افکار و احوال'' بھی منظر عام پر آ گئی ہے۔ اس کتاب میں تصوف اور اقبالؒ کے حوالے سے کئی مقالے شامل ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری کے ابتدائی دور ہی سے وحدت الوجودان کے فکر وفن پہ چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بعد میں علامہ نے راہبانہ طرز فکر پر تنقیدیں بھی کیں۔ نحوؔی اپنے مقالات میں ان اسرار ورموز پہ ایک اتھارٹی کی طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔ آپ کی فکری بالیدگی آپ کی بصیرت اور انداز بیان کی سادگی ہر مکتب فکر کے قاری کو مستفیض کرتی ہے۔

نحوؔی اقبالؒ کے نور بصیرت کو عام کرنے کے متمنی ہیں۔ وہ اپنے زوال آمادہ معاشرے کی عظمت رفتہ کی بازیافت چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے درجنوں مختصر اور ہلکے پھلکے مضامین مقامی اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہاں آپ نے حالات حاضرہ پر برمحل بے لاگ اور دلچسپ تبصرے کئے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح اپنے عہد کی معاشرت کی روشن تصویریں اجاگر کی ہیں۔ بشیر احمد نحوی اب اپنے ان مضامین کا مجموعہ ''محسوسات'' کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔ غالباً اس مجموعے کے مضامین میں نحوی اس خطیبانہ وناصحانہ رجحان کو زیادہ سر ابھارنے نہیں دیں گے جو کہیں کہیں آپ کی تحریروں میں غالب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

بشیر احمد نحوؔی مناظرت قدرت کی عکاسی خوب کرتے ہیں۔ آپ کی تحریر میں جا بجا فطرت کا حسن انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا مصنف ان دلآویز مناظر سے خود ہی لطف اندوز نہیں ہوتے بلکہ قاری کو بھی اپنے ہمراہ لئے چل رہے ہیں۔ پھر اس ظاہری حسن کے باطن میں جھانکنے کا بھی انہیں حوصلہ ہے اور اس

طرح آپ کے مضامین میں معاشرہ اپنے حسن وانحطاط دونوں کو لے کر مجسم ومتحرک ہوجاتا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

انیس ہمدانی

آپ ۲۴؍دسمبر ۱۹۵۶ء کو سرینگر کے کلاش پورہ علاقہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام عبدالعزیز ہمدانی تھا۔آپ نے سوپور کے زرعی کالج سے بی ایس سی اگریکلچر کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں آپ نے ہماچل اگریکلچر یونیورسٹی سے دو برسوں میں اپنی پوسٹ گریجویشن مکمل کر لی۔محکمہ ایگریکلچر میں اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ اردو میں افسانے، ڈرامے، اور فیچر وغیرہ لکھتے رہے۔

انیس ہمدانی کا پہلا افسانہ کشمکش ۱۹۷۲ء میں روز نامہ آفتاب میں شائع ہوا۔آپ کی اس اولین ادبی کاوش میں سماجی مسائل کی شدت اور بے روزگاری کے عذاب کی صحیح ترجمانی ملتی ہے۔آپ نے بہت جلد افسانے کی روایتی تکنیک سے انحراف کر کے علامتی فریم ورک میں کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ''لہو ایک گونگے کا'' اس سلسلے میں آپ کی پہلی کہانی تھی۔اکتوبر ۱۹۷۹ء میں ماہنامہ شیرازہ کے نوجوان نمبر میں آپ کی کہانی ''آہٹ'' شائع ہوئی۔ ہمارے معاشرے میں آج تضاد اور تناو کے جو زہریلے سانپ پھنکار رہے ہیں انہوں نے جس طرح آشتی اور امن کے اقدار کو ڈس لیا ہے۔اس افسانے میں نوجوان افسانہ نگار نے اسی ماحول کو کامیابی

سے پیش کیا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

" اور یہ آہٹ...... ہاں یہ آہٹ...... نہ جانے کیوں میرے دھڑکتے دل کے ہر گوشے میں اپنا تسلط جمارہی ہے۔ اجنبی بالکل انجان، نا معلوم...... یہ آہٹ میری نس نس میں جمع ہورہی ہے۔ آخر یہ آہٹ ہے کس کی ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ اس کی حقیقت میرے ذہن کے ہر گوشے کو مفلوج بنارہی ہے۔ جیسے میرا وجود ہی مفقود ہے...... ہاں میرا مفقود وجود...... لیکن پھر بھی...... یہ آہٹ...... یہ کرب...... یہ بیقراری...... اُف"۔

بہار اردو اکیڈیمی کے ممتاز رسالے "زبان وادب" میں بھی انیس ہمدانی کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ اسی رسالے میں آپ کے شائع ہونے والے افسانے "مکمل ہونے تک" میں بھی وہی ذات کا کرب اور وہی منفرد انداز جھلکتا ہے۔ اس کے بعد آپ کا ایک اور افسانہ "کئی سورج کئی راتیں" یاران نکتہ داں میں طویل مباحث کا موضوع بنارہا۔ یہاں فنکار اپنی ذات کے گھنے تاریک اور گہرے جنگل میں روشنی کی ایک کرن کا متلاشی ہے۔ یہاں ذات کی مرکزیت کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

صحرائے ہوس کے تھکے تھکے چہروں کی یہ کہانی بعد میں آپ کے ریڈیائی ڈرامے کی تحریک ثابت ہوئی۔ یہ ڈرامہ اسی عنوان سے ریڈیو کشمیر سے نشر ہوا اور لگ بھگ اسی زمانے میں آپ خود بھی اس ادارے سے وابستہ ہوگئے۔

ریڈیو کشمیر میں آپ نے مختلف حیثیتوں میں اپنی مستحسن کاوشوں سے قابل قدر کام کیا۔ آپ زرعی پروگراموں کے علاوہ متعدد ثقافتی اور ادبی پروگراموں سے

وابستہ رہے اور انہیں خوب سے خوب تر بنانے کے لئے بے پناہ عرق ریزی سے خدمات انجام دیتے رہے آپ نہایت خلیق اور مشفق شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی زبردست دفتری مصروفیات کے باوجود آپ کے مضامین اور افسانے ملک کے مقتدر رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ ریڈ سے آپ کے جتنے بھی ڈرامے نشر ہوئے اُن میں سے بیشتر ریڈیو ڈرامے کی تکنیک پر کھرے اترتے ہیں۔ ان میں عصری آگہی کا شدید احساس ملتا ہے ان کے کردار ہمارے گرد و پیش کے جانے پہچانے شناسا لوگ ہیں جن کی روح کی گہرائیوں میں جدید دور کی میکانکیت تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انیس ہمدانی ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۲ء تک اپنے نشر شدہ بارہ ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ کی نمائندہ اردو کہانیوں کا ایک اور مجموعہ ''کئی سورج کئی راتیں'' کتابت وطباعت کے مراحل میں تھا۔ ۳۱ر لیکن تب ہی اگست ۱۹۸۹ء کو آپ ایک دردناک حادثہ کے بعد عین عالم شباب میں رحلت کر گئے۔ آپ کی حسرت ناک موت سے وادی کشمیر کے نشریاتی اور ادبی حلقوں میں صدمے کی جو شدت محسوس کی گئی اُس کی خلش برسوں تک برقرار رہے گی۔

زمانہ بڑے غور سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

◎◎◎◎◎◎◎◎◎

مقبول احمد

مقبول احمد کا تعلق اسلام آباد کے زرخیز خطے سے ہے۔ آپ کے نانا شمس الدین بانہالی بڑے ہی علم دوست، سخن فہم اور ادب نواز تھے۔ فارسی اور اردو ادب پر اُن کی گہری نظر تھی اور خود بھی شعر کہا کرتے تھے۔ یہ اُن ہی کی صحبت کا اعجاز تھا کہ مقبولؔ اردو ادب کے ادبی سرمائے سے متعارف ہوا اور اپنے ہم عصر اسلام آبادی ادیب دوستوں کے ساتھ مل کر تخلیقی تعمیر کے عمل میں جُٹ گیا۔ یہ اس صدی کے ساتویں عشرے کے آخری سال تھے جب یہ سب دوست مل کر نت نئے معرکے سر کرنے لگے۔ اس گروپ میں سب سے آگے بشیرؔ دادا تھے۔ اُن کے بعد قاسم سجاد، زاہد مختار، ظفر فاروق صلاتی، ثنا اللہ میر، عطا اللہ میر اور دوسرے لوگ تھے 1۔ مقبول کی ابتدائی نثری چیزیں ''دلکشؔ مقبول'' کے نام سے شائع ہوئیں۔ وہ خود اس بارے میں یوں وضاحت پیش کرتے ہیں:

''والدین نے میرا نام مقبول احمد رکھا تھا، لیکن میں اپنی دلکشی کے زعم میں دلکشؔ مقبول بن گیا۔ پھر جب یہ دلکشی نہیں رہی تو تخلص کی قبا اُتار کر اپنے اصل نام کا پیرہن زیب تن کیا۔

آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''خاموش صدائیں'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں آپ کے سولہ افسانے شامل ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آیا انہیں افسانوں کے زمرے میں رکھا بھی جاسکتا ہے۔ یہ نثری نظمیں ہوسکتی ہیں یا پھر محض تاثراتی تحریریں۔ یہ آج کی پیچیدہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے نامکمل اقتباسات ہیں جو زندگی کے بطن میں مستغرق ہوکر بظاہر فن کا موتی حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ دراصل مصنف اپنے تحریروں میں بے حد اختصار پسند واقع ہوئے ہیں۔ آپ انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کو ایک نئی نگاہ سے دیکھتے تو ہیں لیکن قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ آپ جیسے ساحل سے ہی طوفان کا نظارہ کررہے ہوں۔ ''ضرورت اور ایجاد'' جیسے افسانے عامیانہ پن لئے ہوئے ہیں جب کہ ''میں'' ''خاموش صدائیں'' اور خصوصاً ''شوہر کی خاطر'' جیسے افسانے عصری زندگی کی پیچیدگیوں کو نفسیاتی انداز سے پیش کرتے ہیں لیکن مصنف اپنی معنویت کا بھرپور اظہار نہیں کرپائے ہیں۔

شاعری کے علاوہ مقبول احمد صحافت سے بھی قریبی طور وابستہ رہے ہیں۔ آفتاب، چراغ آرزو، شیش ناگ اور ہلال نو کے بعد آپ نے اسلام آباد سے ''کشمیریت'' شروع کیا۔ یہ اخبار آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ آپ ان دنوں سرینگر کے روزنامہ ''الصفا نیوز'' سے وابستہ ہیں۔

---

1 بشیر دادا بڑی سحر آفریں شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں آپ نے اردو میں کئی ایک افسانے لکھے لیکن سٹیج سے ان کی ماہ و سال کی آشنائی نے بلآخر ایک واضح سمت لی اور پھر یہ ٹیلی ویژن کے مقبول ترین سٹار تسلیم کئے گئے ہیں۔ زاہد مختار شیریں

لہجے اور باوقار طرز ادا کے ادیب وصحافی ہیں۔ ''لفظ لفظ'' جیسے ادبی جریدے کو کئی سال تک پابندی سے نکالتے رہے۔ اُردو میں آپ کی کئی ایک کہانیاں شیرازہ اور تعمیر وغیرہ میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ زاہد مختار کی شخصیت کی طرح آپ کی تحریروں میں بھی ادبیت اور برجستگی نظر آتی ہے۔ گو آپ ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں، لیکن آپ کی ادبی وصحافتی خدمات کو سراہا جاتا رہے گا۔ ان کے ہم عصر عطا محمد میر کی طبیعت تفریحی ہنگاموں سے مناسبت نہیں رکھتی۔ شگفتہ قلم مصنف اور مترجم ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں دہے کے دوران اسلام آباد کی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ آپ کے درجنوں مضامین روزنامہ آفتاب اور دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ اپنی کوہ پیمائی کے ایام کے دوران یہ تین کتابیں بھی تحریر کر چکے ہیں۔ ''فطرت کے اوراق'' ''پہاڑ بلا رہے ہیں'' اور ''میرے انشائیے'' نام کی ان کتابوں کے متعلق برسوں پہلے یہ مجھے تحریری طور مطلع بھی کر چکے ہیں۔ غالباً ان کی یہ کتابیں ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں۔ (جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اظہر نعیمہ احمد

نعیمہ احمد ۱۹/اگست ۱۹۵۵ء کوڈل گیٹ (سرینگر) میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے اردو اور ایجوکیشن میں ایم اے کرنے کے علاوہ ایل ایل بی (آنرز) اور ڈپلوما ان جرنلزم بھی کیا ہے۔ ریڈیو کشمیر کے معروف کشمیری پروگرام ''زونہ ڈب'' کے ساتھ آپ برسوں تک وابستہ رہیں۔ اب آپ آل انڈیا ریڈیو سرینگر میں پروگرام ایگزیکٹو کے ذمہ دار عہدے پر کئی برسوں سے کام کر رہی ہیں۔

نعیمہ جی کے افسانے بیشتر ممتاز ماہناموں میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ اپنے مختصر افسانوں میں سلگتے ہوئے عصری مسائل کو بڑی چابک دستی سے پیش کرتی ہیں۔ آپ کا افسانہ ''اس بستی کی رات'' شیرازہ کے نومبر ۱۹۸۳ء کے نوجوان نمبر میں شامل اشاعت ہے۔ اس افسانے میں آپ نے زندگی کے ادھورے پن کی عکاسی کی ہے۔ یہ افسانہ مشینی دور کے انسان اور اس کے کرب، فرد کی شکست وریخت اور بکھراؤ کا اظہار کرتا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

''ایک دن اسی عمر رسیدہ پیڑ کی چھاؤں میں میرے دادا جی کی چتا میں آگ لگادی گئی۔ بستی کی آنکھ نم تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی

فرد کسی حادثے کا شکار ہوا ہو...... لیکن غموں اور حادثوں کا کیا...... برساتی
پانی کی طرح آتے ہیں اور گھنے جنگلوں میں برس کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن
اپنے پیچھے دائمی یاد کی شکل میں ایک نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ جو حادثوں کو
بولنے نہیں دیتے''۔

آپ کا ایک اور افسانہ ''آگ'' علامتی فریم ورک میں بُنا گیا ہے۔ اس افسانے کے نامانوس اسلوب کے باوجود یہاں فن کارانہ رکھ رکھاؤ اس بات کا غماز ہے کہ مصنفہ تقلیدی رجحانات سے انحراف کر کے اپنا راستہ خود تلاش کرنے کی متمنی ہیں۔ یہی بات نعیمہ احمد کے بعض دوسرے افسانوں پہ بھی صادق آتی ہے، جن میں بندریا، اس بستی کے لوگ، سفید چاندنی، پچھتاوے کا رونا اور سیاہ رات کی چاندنی بھی شامل ہیں۔ ''سیاہ رات کی چاندنی'' اپنی تکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے ایک منفرد افسانہ ہے۔ یہاں جنس کے بعض ایسے مظاہر پیش کئے گئے ہیں جو حقیقت سے قریب لگتے ہیں۔ اس افسانے سے ایک اقتباس:

''بدن کے انگ انگ کو لباس جیسی بے باک چیز سے آزاد کر کے
اس نے سنگ مرمر جیسا سڈول جسم پانی میں اتارا۔ سامنے ہی قد آدم آئینہ اس
کا عکس لئے قدرت کی کاریگری پر عش عش کر رہا تھا۔ پانی کی حرارت پڑتے
ہی اس کا نس نس ڈھیر پڑ گیا اور سانسوں کی رفتار بھی قدرے تیز ہوگئی۔ ایک
عجیب سی لذت اس کی رگ رگ میں سرایت کر رہی تھی۔ یہ حالت تو اس وقت
ہوتی ہے جب میں نرمل کی بانہوں میں زخمی پرندے کی طرح رقصاں ہوتی
ہوں اور وہ اچانک ''مجھے معاف کرو'' کہہ کر الگ ہو جاتا ہے''۔

نعیمہ جی کے افسانوں کے البم میں شامل مندرجہ بالا کہانیاں آپ کے تخلیقی سفر کی معتبر مثالیں ہیں۔ ادھر آپ کے بعض مضامین بھی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کا مضمون ''وازہ وان'' ہمارا ادب کے جموں و کشمیر نمبر میں شائع ہوا ہے۔ تحقیقی نوعیت کا یہ مضمون کشمیری تمدن کے پس منظر میں موضوع کا ایک موثر جائزہ پیش کرتا ہے۔ ریڈیو کشمیر میں براڈ کاسٹنگ کے اپنے وسیع تجربات کے دوران آپ ''ثقافت'' کے عنوان سے پروگرام بھی ترتیب دیتی رہی ہیں۔ اس پروگرام نے ریاست کی تمدنی تاریخ کی ترتیب و تہذیب میں ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

---

1 نعیمہ احمد مہجور اب برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (بی بی سی لندن) سے وابستہ ہیں۔ (آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ایس، ایم، قمر

ایس، ایم، قمر ۳ر دسمبر ۱۹۴۴ء کو سرینگر کے ایک چھوٹے سے محلّہ پلہ پور سونہ وار میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے نوجوان قمؔر میں ماحول کی محرومیت کے باوجود ستاروں پہ کمند ڈالنے کا عزم تھا۔ آپ کے گھر کے احباب محنت اور مشقت کو اپنا ایمان تصور کرتے تھے۔ آپ بھی نیک نیتی اور ثابت قدمی سے ان روایات کی پاسداری کرتے رہے۔ اسکول میں عمر مجید ان کے ہم جماعت تھے۔ دونوں دوست شنکراچاریہ پہاڑی کے دامن میں بہت دور چلے آتے اور کسی دیودار کی گھنی چھاؤں میں اطمنان سے بیٹھ کر کہانیاں تحریر کرتے۔ یہ لڑکپن کی البیلی دنیا تھی جب نوخیز ادیبوں کے اذہان میں ایک محشر خیال ایک جہان آرزو مچل رہی تھی۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں خود نوآموز قلم کاروں کے اپنے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں لیکن پھر دونوں دوستوں کا جنون رنگ لایا۔ اسکول کے میگزین ''اسرافیل'' میں ان کی بعض ایسی تخلیقات شائع ہوئیں جو سکوت دامن کہسار میں لکھی گئی تھیں۔ یہ رسالہ ہاتھ سے لکھا ہوا ہوتا تھا۔ ایس ایم قمر دسویں جماعت تک اس رسالہ سے وابستہ رہے آپ کی پہلی کہانی ''شاہ راہ کی دھول'' روزنامہ آفتاب کے ادبی ایڈیشن

میں ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس پہلے ہی افسانے کا لہجہ نشتر کی طرح کاٹتا تھا اس کے الفاظ کانٹوں کی طرح چبھتے تھے۔ بھوک افلاس اور گھٹن کا یہ احساس تو ان کی رگ رگ میں رچا بسا تھا۔ ماہ وسال کی تاریکیوں کی سوغات تھا دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں جو کچھ دیا مجھے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ آپ کا افسانہ ''ساحل دور ہے'' ۱۹۷۰ء کے آس پاس شائع ہوا۔ کہانی میں مرکزی کردار ایک دودھ جیسی سپید رنگت کی برقعہ پوش خاتون کا شام کی تاریکیوں میں تعاقب کرتا ہے۔ وہ خاتون کے ساتھ رومانوی روابطہ کے خیالی قلعے باندھتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہے لیکن گلی کی نکڑ میں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ مذکورہ خاتون سبزی فروش کی پھینکی ہوئی سبزی تھیلی میں بھر رہی ہے۔ آپ نے افسانہ میں بتایا ہے کہ کس طرح آج کا انسان جہیز اور دیگر غلط رسومات کے سمندر میں غرق ہوگیا ہے۔ اس کا ساحل بہت دور ہے۔ انسان کو وہ کشتی خود ہی تیار کرنی ہوگی جو اُسے ساحل تک پہنچا سکے گی۔ آپ کا اور ایک افسانہ ''جھیل کے سائے'' رسالہ گوجر دیس میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ اس افسانہ میں نیلگوں ڈل کے حسین نظاروں کے پس منظر میں اس کے باسیو کی دلکش تصویر اُجاگر کی گئی ہے۔ ڈل کے دلفریب نظاروں سے تو سبھی مسحور اور محظوظ ہوتے ہیں لیکن اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے والے ملاح لوگوں کے درد سے کوئی بھی آشنا نہیں۔ یہ کہانی دراصل ڈل کے موضوع پہ آپ کی کہانیوں کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ اس سلسلے میں آپ نے بعد میں مزید کئی کہانیاں تحریر کیں جو ''تلاش ادب'' کی نشستوں میں یاران نکتہ داں کو بے حد پسند آتیں۔ مجموعی طور لگ بھگ ایک سو افسانے تحریر کر چکے ہیں۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''جلتے چنار'' ابھی تک شائع نہیں

ہوسکا ہے۔اس کی ایک کہانی ''تیسرا پتھر'' سے اقتباس:

''زمین کے سیاہ کینوا اس پر ایک عمارت کی پرچھائی تھرتھرانے لگتی ہے۔ ہمارے جسم سے چوسے گئے خون سے اس کی بلند دیواریں مضبوط ہوچکی ہیں۔آج کی رات مجھے اس عمارت کو ڈھانا ہے۔روشنی ہونے سے پہلے ہی میں اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔لیکن......ابھی تو میرے راستے میں جہلم حائل ہے۔ مردہ جہلم۔ مجھے ایک سہارا چاہئے۔جہلم کو جگانے کے لئے۔ایک خونی عمارت کو ڈھانے کے لئے۔ یکبارگی آسمان زور سے گر پڑتا ہے کالے بادل گھر آتے ہیں بجلیاں چمکنے لگتی ہیں۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔آسمان اور جہلم مل کر مجھ پر حملہ کررہے ہیں۔جہلم کے کنارے بھیگ رہے ہیں۔اچانک ایک سایہ میری طرف بڑھنے لگتا ہے۔وہ ایک دس بارہ سالہ لڑکا ہے۔ڈبل روٹی کا آدھا ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں دبا ہوا ہے۔وہ اُسے چھپا رہا ہے۔ میں نے اپنا کوٹ لڑکے کو پہنا دیا...... ''میری چھت ٹپک رہی ہے......میری ماں بھوکی ہے......''

''میں بھی بھوکا ہوں......ساری دنیا بھوکی ہے......دنیا کی چھت بھی ٹپک رہی ہے۔آؤ اس روٹی کو ساری دنیا میں تقسیم کریں۔!''

آج کل قمر صاحب ''اشین سونگ مشینز'' کے ادارے سے وابستہ ہیں۔غم روزگار کی مصلحتوں نے انہیں ادبی سرگرمیوں سے دور کردیا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

سجاد حسین

شاید پندرہ سال ہوئے ہوں گے۔ رایٹرس کلب کے ایک جلسہ میں ایک دبلے پتلے سے شخص نے ملنے میں خود ہی پہل کی تھی اور اپنا تعارف سجاد حسین کی حیثیت سے کرایا۔ اس کے بعد ماہ وسال کی آشنائی کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور میں اس دھان پان باریش ادیب کی نوازشوں اور محبتوں سے مستفیض ہوتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ سجاد حسین اردو کے اچھے انشاپرداز ہیں۔ ان کے الفاظ نشتر بھی ہوتے ہیں اور مرہم بھی۔ مزاج کی اس بے باکی نے انہیں برسوں تک دنیاداری سے دور رکھا۔ ایک سچے اور کھرے قلم کار کی طرح آپ معاشرے کی غلط کاریوں پر کس کر تنقید کرتے رہے۔ لیکن آپ نے اپنے لئے اظہار کے جس میڈیم کو منتخب کیا وہ اپنے معاصرین کے یکسر مخالف تھا۔ جہاں آپ کے بیشتر ہم عصر دوست شعروافسانہ میں اپنا مافی الضمیر بیان کررہے تھے وہاں آپ نے ناول کی صنف کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء اور اس کے بعد کے برسوں میں آپ بے تکان مضامین نو کے انبار لگاتے رہے۔

اڑان آپ کا پہلا ناول تھا جو آپ نے یونائٹڈ نیوز ایجینسی کے اشتراک سے شائع کرایا۔ اس کے بعد پنجے، دامن کے تار، سایہ، ننگی یکے بعد دیگرے آپ

کے کئی ناول منظر عام پر آئے۔ اکثر ناول سوسوا سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ بعض کی کتابت معیاری ہے لیکن طباعت کا معیار حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اردو کے سنجیدہ ناقدین نے انہیں سستا اور غیر معیاری ادب کہہ کر گویا رد کرنے کی کوشش کی لیکن ان ناولوں کو عام قارئین نے نہایت ذوق وشوق سے پڑھا اور پسند کیا۔ ممکن ہے کہ ان میں فن کار کے ابتدائی ایام کی آرزومندی اور کوتاہیاں بھی جھلکتی ہوں لیکن بقول منیب الرحمان ۱، سجاد حسین دیو قامت ادیبوں اور مفکروں کے لئے نہیں لکھتے ہیں۔ وہ صرف ان لوگوں کے لئے لکھتے ہیں جنہیں ناول سے دلچسپی ہے۔ قارئین کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ناول نگار ناول میں اپنے گردوپیش کی زبان اور حالات پیش کرے تا کہ قاری ناول کو سمجھ سکے اور اس کا پورا لطف اٹھا سکے۔ سجاد حسین کے ناول اس لحاظ سے کامیاب ہیں کہ ان کے ناول اور ماحول کی ہم آہنگی قاری کے لئے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔

اب برسوں سے سجاد حسین خاموش ہیں۔ ان کی تحریر کے حقوق اب گویا ٹیلی ویژن ڈراموں کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ منزلیں یہ راستے اور کروٹ جیسے سکرپٹس اس بات کے غماز ہیں کہ ٹی وی کی میڈیم میں، برسوں کے خوابیدہ قلم کار نے اپنی صلاحیتوں سے نئے اجالے بکھیرنے شروع کر دئے ہیں۔

---

1 دامن کے تار: دو لفظ صفحہ ۴

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

بشیر اختر

ریاستی کلچرل اکیڈیمی اُردو مصنفین نثر کی قلمی کاوشوں کو جس خاص اہتمام سے شائع کرتی رہی ہے۔ بشیر اختر اُس اشاعتی پروگرام کے ایک کلیدی کردار ہیں۔ چنانچہ درجنوں ادب پاروں کی شیرازہ بندی اوران کی تشہیر اس محنتی محقق کی بے پناہ لگن کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ کشمیری زبان میں ''شیرازِ'' اور ''سون ادب'' کی اشاعت کے نمایاں کنٹری بیوشن کے علاوہ آپ نے کلچرل اکیڈیمی کے بعض تاریخ ساز کارناموں میں بھی خصوصی تعاون دیا ہے۔ یہ اسی نمایاں اشتراک کا نتیجہ ہے کہ ''کشمیری انسائیکلو پیڈیا'' کا ایک مدلل جائزہ جب شیرازہ میں شائع ہوا تو اس میں نشاط انصاری کی طرف سے اُبھارے گئے متعدد پیچیدہ نکات کی تشریح کے لئے آپ ہی کودعوت سخن دی گئی۔ اکیڈیمی کے Spokesman کی حیثیت سے آپ کے وضاحتی بیان سے ایک اقتباس1''

''کشمیری زبان میں الفاظ کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے خاص کر اُن الفاظ کا Gender جو دوسری زبانوں سے مستعار ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ تاریخ یا تواریخ کو ہمارے لکھنے والے بطور مذکر بھی

استعمال کرتے ہیں اور بطور مونث بھی۔ اسی طرح شرارت، تحقیق، غزل وغیرہ۔ ''زیارت ہاؤنی'' کشمیری میں مستعمل ہے اور فصیح ہے ''زیارت کرناؤنی'' کشمیری میں نہیں کہتے، ''مویہِ مقدسچ زیارت ہاؤ کھ'' کہا جاتا ہے نہ کہ مویہِ مقدسچ زیارت کرناؤ کھ''۔ دراصل کشمیری میں لفظ زیارت دیکھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کسی مقدس یا مخصوص چیز کے نام کے لئے بھی جس کی زیارت کروانی مقصود ہو۔ عرض ہے کہ تکھسکبھ ناگ سے برآمد ہونے والی چیز جڑ نہیں تھی بلکہ Bulb یا گھنٹی تھی۔ اسی Bulb سے زعفران کا پھول اُگتا ہے......''

اردو نثر کا یہ ایک اقتباس ہی آپ کے معلومات کی وُسعت کا عندیہ دیتا ہے۔ جسمانی طور آپ بظاہر کتنے ہی نحیف نظر آتے ہوں لیکن آپ کے علمی، ادبی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین ایک توانا انشا کی جامعیت رکھتے ہیں۔ ''فصلوں کے لوک گیت'' ایک ایسا ہی مضمون ہے۔ اس میں اہل کشمیر کی ثقافت اور اہلیت کا ایک سلیس نثر میں کس طرح جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے2:

''کشمیر میں بہار کے آتے ہی ہر طرف ہریالی چھا جاتی ہے۔ ہر مکان کے روشندان کھُلے چھوڑ دئے جاتے ہیں اور لوگ سرمائی کپڑوں کو تیاگ کر باغوں اور کھیتوں کا رخ کرتے ہیں۔ بہار آنے کے ساتھ ہی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ کسان ہل اُٹھائے کھیتوں کا رُخ کرتے ہیں۔ کشمیر کا ذرہ ذرہ بہار میں نیرنگیوں کا نگار خانہ بن کر دعوت نظارہ دیتا ہے۔ ''گونگل'' یعنی مصروفیات کی اس شروعات کے موقع پر چاول اور اخروٹ نذر و نیاز کے طور پر بچوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ڈلے توڑنے کے دوران گائے جانے والے گیت لئے اور طرز کی بنا پر مسحور کن ہیں۔ ان میں نعت

ومناقبت کا ورد بھی کیا جاتا ہے۔لیکن موسیقیت کے لحاظ سے یہ گیت پیداواری عمل کے ساتھ بالواسطہ علاقہ رکھتے ہیں۔اچھی فصل اور ہرے بھرے کھلیان۔اس سہاونے خواب سے بڑھکر ایک کسان کا اور کون سا مقدس خواب ہوسکتا ہے"

---

1 شیرازہ: جون ۱۹۸۷ء صفحہ ۵۴

2 ہمارا ادب: لوک ادب نمبر صفحہ ۱۶۳

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

سید رسول پونپرؔ

سید رسول پونپر کی پیدائش بجبہاڑہ کشمیر میں مارچ ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید غیاث الدین احمد تھا۔ آپ نے پچھلی چوتھائی صدی کے دوران اردو نثر میں اپنی تخلیقات سے جو تاج محل تعمیر کیا اس کے طفیل کشمیریت کے باطن کے منظر نامے اپنی تمام تر جہتوں کے ساتھ درخشندہ ہوئے ہیں۔ کشمیری زبان وادب میں اپنی گرانقدر عطا کے ساتھ ساتھ پونپرؔ صاحب اردو میں بھی ابتدائی زمانے سے ہی اظہار خیال کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں بحیثیت ایڈیٹر اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ ہی اردو میں آپ کی تحقیقی سرگرمیاں مسلسل جاری رہی ہیں۔ مختلف اصناف سخن میں آپ کی متعدد کتابیں ناقدین سے دادِ تحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔ اردو میں ایک مترجم کی حیثیت سے بھی آپ اپنا کنٹریبیوشن پیش کرتے رہے ہیں۔

آپ نے ملک کے بعض ممتاز رسائل میں شائع ہونے والی اپنی تازہ تحقیقی اور تنقیدی کاوشیں رشحات ایام کے عنوان سے شائع کیں۔ یہ ضخیم کتاب آپ کے ۲۵ رمقالات کا ایسا مجموعہ ہے جس کے ہر صفحے سے یہ حقیقت عکس ریز ہوتی ہے کہ

پونپر صاحب کو اردو زبان پر یکساں طور قدرت حاصل ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے شاہراہ حیات کے نہ جانے کتنے ایسے نشانات ابھر کر سامنے آئے ہیں جو وقت کی ریت تلے دب چکے تھے آپ اپنی ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ اس تخلیقی وسعت کے لئے آپ کو کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا، ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ لیکن جس خاص وصف نے آپ کو امتیاز بخشا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ہر وقت سرگرم رہتے ہیں اور نہایت ثابت قدمی سے اپنی روح کی ساری توانائیوں کو سمیٹ کر مضامین نو کے انبار لگا دیتے ہیں۔ ریاست کے ممتاز تہذیب شناس جناب محمد یوسف ٹینگ اردو میں تحریر کئے گئے آپ کے مضامین کا ایک مدلل تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]۔

رسول پونپر کی اس کتاب کو میں کشمیر پر آئے دن چھپنے والی کتابوں میں ایک ہیرے کی کنی جیسی پائیدار شے سمجھتا ہوں۔ ان کے مضامین بصیرت افروز ہی نہیں عبرت آموز بھی ہیں۔

---

1 رشحات ایام...... پیش لفظ

م،م،صدیق

ایک اور افسانہ نگار ہیں جو ۱۹۷۰ء کے آس پاس روزنامہ آفتاب میں لکھا کرتے تھے۔ انہیں اپنے ''آفتاب برانڈ'' ہونے پر فخر بھی تھا حالانکہ وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتے تھے[1] کہ بعض ''کہنہ مشق قلم کار'' انہیں پاس پھٹکنے نہیں دیتے کیونکہ ان کے نزدیک اخباروں کے قلمی معاون ادیب نہیں ہوتے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ (احساس کے گھاؤ) ۱۹۷۳ء کے ایام میں ہی شایع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۱۷ افسانے ہیں جن میں سے بعض افسانے رضیہ تبسم ایم اے (رابعہ دلشاد) سے بھی منسوب ہیں۔ وادی کشمیر میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ صدیق نے زندگی کے دکھوں کو مختلف زاویوں اور مختلف گوشوں سے دیکھا ہے اور اس دکھوں بھری زندگی کے اُن کے احساس میں ایک خاص طرح کی شدت پیدا کی ہے۔ ''پُل صراط کے راہی'' اور کرب کی صلیب اس مجموعے کی نمایندہ کہانیاں تخلیقات کے جس دوسرے مجموعے ''جب پرچھائیں بھاگی'' کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ وہ کبھی منظرہ عام پر نہ آسکا۔

---

1 احساس کے گھاؤ ص ۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

رشید پروین

آپ کا پورا نام عبدالرشید ہے۔ آپ ۱۴ر اپریل ۱۹۴۸ء کو خوشحال متو سوپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ غلام رسول چنگال تھا۔ آپ متصوفیانہ خیالات کے آدمی تھے۔ رشید پروین کے بڑے برادر گلشن سوپوری کشمیری کے شاعر ہیں جن کی بہت سی مطبوعات ہیں۔ رشید پروین کا گھریلو ماحول اس لحاظ سے نہایت ادبی اور روحانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ کا پہلا افسانہ ''تیرے پھول میرے گھاؤ'' ۱۹۶۵ء مین مقامی روزنامہ ''روشنی'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کی کئی ایک چیزیں روزنامہ آفتاب کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوتی رہیں۔

رشید پروین کے پہلا ناول ''دل اور دیا'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا مرکزی کردار سلیم ہے، جس کی زندگی کی تاریکیاں خلوص کی ایک کرن کے لئے ترستی رہیں۔ وہ جنم جلا تھا۔ آنکھ کھولی تو ماں کو موت کی تاریک وادی میں دھکیل دیا۔ اس کا بچپن ممتا کے لئے بلکتا رہا۔ پھر ایک حادثے میں اس نے اپنے ڈیڈی کا شفیق سہارا بھی کھو دیا۔ اس کی بھابھی شبنم نے اس کے اور اختر کے درمیان نفرت کی اینٹوں

اور تنفر کے سیمنٹ سے ایک مضبوط دیوار کھڑی کردی۔ شبنم کی چھوٹی بہن شہناز ایک بے باک لڑکی تھی۔ سلیم کی سردمہری نے اسے انتقام پہ اکسایا۔ شہناز نے اسے رسوا کیا۔ اس کے بے داغ کردار پر دھبہ لگایا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے بھاگ نکلا۔ اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لئے اسے کبھی موٹر میکنک، کبھی پیانوسٹ اور کبھی فوٹو گرافر بننا پڑا اور پھر بانڈی پورہ کے جنگلوں میں دیودار کے لمبے لمبے درختوں اور چنار کی گھنی چھاؤں میں نازو اس کی باہوں میں سما گئی۔ نازو سیٹھ اکبر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جس کے غرور کا شیشہ سلیم نے توڑ دیا تھا۔ جنگل میں خوابوں کی یہ رات نہ جانے سلیم کی کن دعاؤں کا ماحصل تھی۔ نازو اس کی زندگی کے لق ودق صحرا میں ایک شاداب نخلستان بن کر آئی۔ پھر ایک امیر اور عیاش نوجوان رحمان نے اسے ایک حادثے میں اپاہج کردیا۔ وہ تین ماہ بعد ہسپتال سے بیساکھیوں کے سہارے باہر نکلا تو اس کے مستقبل کی ٹانگ بھی کٹ چکی تھی۔ وہ اب لوگوں کے بہتے ہوئے دریا کے ساتھ قدم نہیں ملا سکتا تھا۔ نازو اس سے بہت دور اس کی چاہت سے بہت دور رحمان کی امارت سے متاثر ہو کر کلبوں میں دادِ عیش دیتی رہی۔ رحمان نے اسے اپنے دام میں پھنسالیا تھا۔ سلیم کے لئے ایک ایک کر کے ہر دئے نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ تین دنوں کا بھوکا پارک کے ویران گوشے میں پڑا نازو کو یاد کرتا رہا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو منتشر بال اور چہرے کی ہڈیاں اسے کوئی بھکاری ظاہر کررہی تھی۔ لیکن وہ مرنے سے پہلے صرف ایک بار نازو کی آواز سننے کا متمنی تھا۔ لیکن پھر اس پہ یہ بھرم کھلا کہ جہاں اس نے جبیں جھکائی تھی وہ چوکھٹ ایک پتھر کے صنم کی تھی۔ حالات نے پہلگام پہنچا دیا جہاں کے نایٹ کلب مین اسے پیانوسٹ کی نوکری مل گئی۔ وقت کی آندھی نے

نازو کو بھی پہلگام میں لا پھینکا۔ وہ رحمان کے ناجائز بچے کو جنم دینے کے لئے اتنی دور آ گئی تھی۔ نازو کو جب پتہ چلا کہ رحمان نے اسے دھوکہ دیا ہے تو ایک رات اس نے اسے گولی سے ہلاک کر دیا۔ لیکن سلیم نے الزام اپنے سر لیا اور پولیس کی ہتھکڑی پہنے خلاؤں میں گم ہو گیا۔

یہ ناول رشید پروین کی بے باک انفرادیت کا عکاس ہے۔ آپ کے کردار چلتے پھرتے اور ٹھوس نظر آتے ہیں۔ یہ کردار اس انداز سے ابھارے گئے ہیں کہ ان کی داخلی کشمکش باریک سے باریک نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ آپ کی فطرت کا تیکھا پن آپ کی فنی پختگی میں معاونت کرتا ہے۔ لیکن ان کے فن کی سب سے بڑی خوبی ان کی سچائی ہے جو ہر گام پر اپنے جوہر دکھاتی ہے۔ اس کے علاوہ جس انداز سے کرداروں اور قاری میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اس سے ان کی فنی چابک دستی کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی زبان نہایت دھلی دھلی اور پہاڑی ندی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ مناظر فطرت کی عکس ریزی بھی نہایت خوب ہے۔

آپ کا دوسرا ناول ''پیاسی پایل'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ یہاں بھی آپ کا قلم الف لیلیٰ کے قصے نہیں اگلتا بلکہ معاشرے کے ناسوروں پر نشتر زنی کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں ایسے مہروں کے چہروں سے نقاب الٹ دی گئی ہے جو ملک کی کشتی کو بھنور میں پھنسانے کے درپے ہیں۔ یہ لوگ بقول مصنف ہر اس آئینے کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں انہیں اپنی مکروہ صورت نظر آتی ہے۔ یہ استاد کی کہانی ہے جو قوم

کے مستقبل کا ضامن کہلاتا ہے۔لیکن جسے معاشرے نے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ بلاشبہ یہ رشید پروین کا ایک شاہکار ناول ہے جو اردو ادب میں ایک اضافہ تسلیم کیا جائے گا[1]"۔

---

1 پیاسی پائل: آخر صفحہ اظہر حسین راہی

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد احمد اندرابی

آپ مولنا سید نبیہہ احمد اندرابی کے صاجزادے ہیں۔ کشتواڑ میں کامگار صاحب سے اپنی یادگار ملاقات کا احوال تحریر کرتے ہوئے آپ کامگار نمبر 1 کے حرف اول میں یوں رقمطراز ہیں:

''......جب میں نے کامگار صاحب کے سامنے اپنے والد مرحوم، جو ان دنوں بہ قید حیات تھے، کا نام لیا تو ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔ باتوں باتوں میں اپنی برف ایسی سفید ڈاڑھی اپنی مٹھی میں کستے ہوئے انہوں نے کہا: کشتواڑ میں اپنے قیام کے دوران اس سنت کا اتباع کرانے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔ وہ یہاں تین سال بحیثیت مدرس رہے۔ جامع مسجد میں ہر جمعہ بلاناغہ تقریر کرتے......''

آپ کا خانوادہ وادئ کشمیر میں گزشتہ صدی ڈیڑھ صدی تک اقلیم علم وآگہی کا سرچشمہ اور سرخیل رہ چکا ہے2۔ اس علمی ماحول میں آپ کی فطری صلاحتیں نکھر اٹھیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران آپ نے اعلیٰ معیار کے بعض تنقیدی اور تحقیقی مضامین تحریر کئے ہیں۔ ''ہمارا ادب اور جدید حسیت3'' کے عنوان سے آپ کا

مضمون شیرازہ کے سیمنار نمبر میں شائع ہوا ہے۔اس میں آپ نے اکادمی کے تین روزہ سیمنار کی سیر حاصل رپورٹ پیش کی ہے۔آپ کے اسلوب اور طرز بیان سے عصری آگہی کے رجحانات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔شیخ العالم سے پہلے کے ریشی4 آپ کا ایک اہم تحقیقی مقالہ ہے۔اس مقالے میں آپ نے کشمیر کی تہذیبی قوس قزح کی اس تابندہ علامت کی معنویت کے نئے آسمان اجاگر کئے ہیں۔آپ کے تجزیے سے اس موضوع کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑی ہے۔ آپ کا ایک اور اہم تحقیقی مضمون ''تہواروں کے گیت5'' ہے۔یہ مضمون ہمارے تحقیقی سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے مواد کے حصول میں آپ نے عرق ریزی سے کام لیا ہے۔آپ کی زبان نہایت خوبصورت ہے۔تنقید اور تحقیق کے شعبوں میں آپ کے کارنامے اگرچہ قلیل ہیں لیکن کوئی بھی سنجیدہ قاری آپ تحقیقی ہم جوئی کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔آپ نے کئی ایک مقالوں اور افسانوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ ہنومان مندر6 کے ترجمے میں جو سلاست اور جدید کاری ہے وہ آپ کی تخلیقی صلاحیت کی عکاس ہے۔

''شیرازہ'' کے صفحات آپ کے حسن ادارت کے امین ہیں۔آپ کی ادارت میں اس رسالے کے جو خاص نمبر شائع ہوئے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ کی جواں فکر ادارت نے اس رسالے کی عظمت رفتہ کو ایک نئی توانائی ایک نئی جہت اور تابندگی دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

---

1 شیرازہ: کامگار نمبر ص ۷

2 کوہستان کا کاہن: محمد یوسف ٹینگ ص ۱۲

3 شیرازہ: سیمنار نمبر ص ۱۸۷

4 شیخ العالم نمبر شیرازہ ص ۹۷

5 ہمارا ادب لوک ادب نمبر ص ۱۳۶

6 شیرازہ افسانہ نمبر: رتن لال شانت ص ۱۸۶

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اقبال عظیم چودھری

علامہ اقبالؒ نے ایک بار کہا تھا کہ شعر ڈھالا نہیں جاتا ڈھل کر آتا ہے۔ کہا نہیں جاتا بلکہ نازل ہو جاتا ہے۔ گجری غزل کے مرزا غالب کہلائے جانے والے ''اقبال عظیم چودھری'' کے فکر وفن کے بارے میں کم وبیش یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ آپ کا جنم بیسوی صدی کی چوتھی دہائی میں وانگت شریف کی بابا نگری میں حضرت بابا نظام الدین کے خاندان میں ہوئی جن کی عقیدت سے ریاست کے اطراف میں ہزاروں لوگوں کے دل آج بھی منور ہیں۔ اس علمی وادبی ماحول نے آپ کے فکر و فن کو تحریک بخشی اور آپ غیب سے نازل ہونے والے اشعار کو صفحہ قرطاس پہ بکھرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی اردو افسانہ بھی آپ کی دلچسپیوں کا محور بنا رہا۔ اردو میں آپ کے بیشتر افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے معتبر ادبی رسائل میں نمایاں طور شائع ہونے لگے اور اردو کے قارئین آپ کی خلاقیت کے شوخ اور فطری رنگوں سے مستفیض ہونے لگے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۷۵ء کے آس پاس آپ نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی ماہنامے ''گجر دیس'' کا ایک بڑا حصہ مقامی طور اردو کے ابھرتے افسانہ نگاروں کے لئے

مخصوص رکھا۔ اقبال عظیم کسی ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز اپنی قلندرانہ فطرت کے تحت ایسے کئی Mile Stones پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ وہ ابھی چند برس پہلے تک ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں ایڈیٹر و کلچرل آفیسر کے اہم عہدے پر فائض رہے اور آج کل بابا نگری کی مقدس وادی میں اپنے نئے ادبی سفر کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ کیونکہ ایک سفر کا خاتمہ دوسرے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں ہم آپ کے افسانے ''لباس'' سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

''وہ اپنی ننگی چھاتیاں دونوں ہاتھوں سے اچھال اچھال کر کہہ رہی تھی'' آ میرے شیر دودھ پی لے تو بھوکا ہوگیا ہے۔ ان ظالموں نے تجھے مارا ہے یہ مجھ سے جلتے ہیں'' لوگ اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظریں اس کے برہنہ جسم کو چیر رہی ہیں۔ وہ چلا رہی ہے'' تم کیوں میرے نئے لباس کو غلیظ نظروں سے گھور رہے ہو۔ یہ مجھے اپنے بیٹے نے دیا ہے۔ میں اسی بیٹے کی تلاش میں دیوانی ہوگئی تھی مگر اب مجھے ہوش آ گیا ہے۔ میرے جسم سے چیتھڑے جدا ہو گئے ہیں۔ آہ میرا نیا لباس''۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

زینت فردوس زینت

زینت فردوس زینت کا ناول ''نئی سحر'' ۱۹۷۷ء میں مگھر مل باغ (سرینگر) سے شایع ہوا۔ اس ناول کا ٹائیٹل نہایت جاذب نظر اور اس کی کتابت ریاست کے ایک ممتاز خوشنویس محمد صدیق نے کی ہے۔ کتاب کا انتساب ''کشمیر کے سچے ادیبوں کے نام'' ہے۔ پونے دو سو صفحات پر پھیلے اس ناول کے پیش گفتار میں مصنفہ اپنے فن کے ارتقا کا جائزہ پیش کرتے ہوئے یوں لکھتی ہیں:

''شروع شروع میں تو میں نے لکھنا ایک شوق ہی سمجھا اور لکھتی رہی۔ لیکن اب یہ شوق زندگی بن کے رہ گیا ہے اس ناول میں جتنے بھی جذبات، احساسات اور خیالات ہیں۔ یہ سب مجھے اپنی قوم اور اپنے ملک سے حاصل ہوئے ہیں۔ میری والدہ نے مجھے بچپن سے ہی اس بات کا درس دیا کہ سب انسان برابر ہیں۔ سب کو ایک ہی خدا نے بنایا ہے......''

''نئی سحر'' کا موضوع انسانیت اور اتحاد کے اقدار کا اظہار کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اشوک محبت اور اخوت کے ایک مسیحا کی طرح جذب باہم اور رواداری کے اٹوٹ آدرشوں کی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ ہندو ہو کر ایک مسلمان لڑکی شکیلہ کی پرورش

کرتا ہے کیونکہ اُس کے ماں باپ ایک حادثہ میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس معصوم لڑکی کی ماں اشوک کی منہ بولی بہن ہوتی ہے۔ شکیلہ کے ماں باپ اپنی اکلوتی بچی کو مرنے سے قبل اشوک کو سونپتے ہیں۔ اشوک اس مقدس امانت کو اپنے خون جگر سے پروان چڑھاتا ہے۔ اُس کے لئے اسلامی تعلیمات کا خصوصی اہتمام کرتا ہے اور پھر جس دن اُسے اپنی اس نازوں پلی لاڈلی بیٹی کے لئے جاوید جیسا باہمت اور با صلاحیت لڑکا ملتا ہے تو اُسے ایسا لگتا ہے کہ شکیلہ کی زندگی پر چھائے ہوئے سیاہ بادل ہٹ گئے اور ایک نئی سحر طلوع ہونے والی ہے لیکن حالات کے بھنور نئے مدوجزر پیدا کرتے ہیں اور اشوک اپنا بلیدان کر کے مرتے مرتے اس بات کی آگہی دلاتا ہے کہ بے غرض پیار ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔

فنی لحاظ سے دیکھیں تو زینت صاحبہ کا مذکورہ ناول زیادہ کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی پیشکش کا انداز گھسا پٹا ہے۔ اس کی زبان میں فنی اختصار نہیں بلکہ بے معنی طوالت ہے، لیکن جس چیز کے لئے ''نئی سحر'' کو بلا تامل سراہا جا سکتا ہے وہ اس کا اچھوتا موضوع ہے۔ مصنفہ نے نہایت دیانت داری سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔

مصنفہ کے ۵۶ افسانوں کا مجموعہ ''گہرائی'' بھی شائع ہوا ہے۔ آپ نے بچوں کے لئے بھی کئی کہانیاں تحریر کی ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

نظیر نذر

ایک جواں سال افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا مجموعہ "سلوٹیں" ۱۹۷۵ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں سولہ کہانیاں شامل ہیں۔ چند ایک کے عنوانات اس طرح ہیں۔ "رنگوں کا بھنور، سلوٹ، دادی اماں، صفر کی تعبیر، افق کی موت وغیرہ۔ کتاب میں پروفیسر شکیل الرحمان اور اکبر جے پوری کی آرا شامل ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ نذر کے ہاں نئے حسیاتی تجربات ملتے ہیں لیکن یہ برائے نام تجربات اظہار اور ابلاغ میں کامیاب نہیں رہتے۔ تہہ در تہہ رمزیت قاری کے ذہن پر دستک ضرور دیتی ہے، لیکن انجام کار قاری الجھ کر رہ جاتا ہے۔ "رنگوں کا بھنور" بھی ایک ایسا ہی بھنور ہے اس کے بعض نکات قلب وجگر میں جگہ ضرور کرتے ہیں۔ لیکن پھر پڑھنے والا گویا ایک بھنور میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔ کہیں کہیں انسان اور مذہب کے نازک رشتے پر بعض متنازعیہ فیہ نکات ابھارنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ اگر "جدیدیت" کے یہی تقاضے تھے تو انہیں نظیر نذر نے ہر ممکن طریقے سے پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ ان کا فن اس محدود دائرے سے باہر نہیں آتا۔ نظیر نذر کو اردو زبان پر بھی مناسب حد تک عبور حاصل نہیں۔ بے ربط الفاظ اور غیر مروج

فقرے اکثر جگہوں پر رہی سہی ترسیل کو بھی ناممکن بنا رکھ دیتے ہیں۔ روزنامہ آفتاب 1 (سرینگر) میں بھی نئی کتابوں پر تبصرے کے کالم میں فاضل جائزہ کار نے اس مجموعے کو فنی اور لسانی اعتبار سے ایک انتہائی کمزور کوشش قرار دیا ہے۔ نظیر نذر سرینگر دوردرشن سے وابستہ ہونے کے بعد پھر بھی اپنا ''ادبی درشن نہیں دکھا سکے''۔

---

1 روزنامہ آفتاب ۹/اپریل ۱۹۷۶ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ہمراہ کشمیری

جدید اردو افسانے پر ادھر کئی برسوں سے ابہام کی اس قدر گرد اڑائی گئی ہے کہ اس کی شناخت ناممکن ہوگئی ہے۔ بعض فیشن زدہ جدیدیوں نے جنہیں دراصل انسانیت کا چہرہ پہچاننے میں بڑی دشواری ہورہی تھی آدمی کے چہرے کا ملمع اتار کر کہانی کے چہرے پر چڑھا دیا ہے۔ ان کے ہاتھ جتنے نقاب لگے وہ سب کے سب انہوں نے افسانے کے چہرے پر ڈال دئے۔ اس بے چہرگی کے اہتمام میں افسانے کا تو خیر دم نکلنا ہی تھا۔ خود اردو فکشن کے قارئین کا حلقہ بھی سرعت سے سکڑتا گیا۔ کیونکہ بار بار مطالعہ کے باوجود افسانے کی تہہ در تہہ چھپی حقیقت ان کے پلے نہیں پڑسکی۔

دراصل ادب محض ایک انفرادی دریافت نہیں بلکہ سماجی شعور کا عطیہ ہے۔ اس کے مطالعے کا حاصل وہ طفلانہ مسرت نہیں ہوسکتی جو اس کی علامتوں کو کھولنے اور سمجھنے کی ذہنی ورزش سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمراہ کشمیری صاحب اپنے افسانوں کے مجموعے ''آوارہ احساس'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں

''نئی کہانی جدید دور کی عظیم پیداوار ہے جب ایک جدید کہانی کار کا

اپنے تجربے کو کہانی کے رنگ سے سنوارتا ہے۔تب اسے چین ملتا ہے۔یہاں پہنچ کر اسے کہانی کا کردار اپنا کردار معلوم ہوتا ہے اور اس طرح ایک کہانی ایک شاہکار بن جاتی ہے......''

اس اتفاق سے اس مجموعے میں ان کے بیک وقت ''ساٹھ شاہکار'' جمع ہو گئے ہیں۔دو ایک سے آپ بھی مستفیض ہو جائیے۔

''ایک خوبصورت نوجون ہوتے ہوئی بھی اس وقت اپنے بڑھاپے کا احساس ہوا۔جب سنیتا نے مجھے ''انکل جی'' کہہ کر پکارا......''اس ایک سطر کی منی کہانی کا عنوان ''ایک ادھوری کہانی'' ہے۔اب ایک اور منی کہانی ملاحظہ کیجیے۔اس کا عنوان ہے ''دل اور محبت'' کیبن میں افسانہ نے پھر وہی الفاظ دہرائے ''میں تمہیں سب کچھ دے سکتی ہوں مگر دل کے سوا''۔

کسی بھی زاوئے سے جہاں جہان محرومیوں اور استحصال نے زندگی کا چہرہ مسخ کیا ہے اس چہرے کو حقیقی مان کر بنسی بجانا اور مجہول ادب پیدا کرنا کسی سچے فنکار کا وصف نہیں ہوسکتا۔سچا فنکار تو وہی ہے جو زندگی کے مختلف حقائق پر نہ صرف نظر رکھ سکے بلکہ اپنے اندر اور باہر کی بہتی ہوئی دنیاؤں کا سنگم کر سکے تا کہ قاری محسوس کر سکے کہ احساسات زبردستی ٹھونسے نہیں جا رہے ہیں بلکہ یہ فن کار کے اندر سے پھوٹ رہے ہیں۔

آوارہ احساس اور ہمراہ کے دوسرے افسانوی مجموعے کی بیشتر کہانیاں پڑھ کر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مصنف کا مشاہدہ اور ان کی بصیرت نہایت سطحی قسم کی ہے۔ان کی ہر کہانی میں نثر اور نظم کی سرحدیں ٹوٹتی سی نظر آتی ہیں۔محمد اسد اللہ وانی ان کہانیوں کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]:

''ہمراہ کی تخلیقات میں تضاد ہے مثلاً فطرت میں مصنف نے انسان کا دین جرم قرار دیا ہے۔ ''میری کہانی'' جسے فہرست میں انہوں نے اداریہ اور اندر دیباچہ لکھا ہے، میں دولت کو دھرم مانتے ہیں۔ میں نے اسے تضاد اس لئے قرار دیا ہے کہ یہ الفاظ خود فنکار کے ہیں۔ ان کے کرداروں کے نہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں زبان کی جابجا غلطیاں ہیں۔ افسانہ شرافت میں چھاتیوں کو تھن لکھا ہے۔ ایک اور کہانی میں لکھا ہے ''تو کتنا بھدا لگ جائے گا'' اس کتاب کا مصنف خود ہی کاتب اور آرٹسٹ بھی ہے۔ اس لئے کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ افسانے تسلیم شدہ روایتی درجہ بندی سے ہی انحراف نہیں کرتے بلکہ منی افسانوں کے دبستان کا حصہ بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا''۔

---

1 شیرازہ ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۸۰

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

شہنواز ٹینگ

شہنواز ٹینگ وادی کشمیر کے شگفتہ نگار انشا پرداز ہیں۔ آپ کی تحریروں میں ''کونگ وٹن'' کے سبزہ زاروں کی شادابیت بھی ہے اور اہرہ بل کے آبشار کا جلال بھی ہے۔ آپ کے یہاں تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا اعلیٰ اور تخلیقی اظہار ملتا ہے۔ اس تخلیقی نثر میں کچھ مصوری ہوتی ہے کچھ نغمگی ہوتی ہے۔ لیکن ان بظاہر شانت اور شیتل لہروں کے نیچے طنز کے جو طوفان چھپے ہوتے ہیں نکتہ داں ان کے امنڈتے بپھرتے تیرو نشتر سے بخوبی آگہی رکھتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو شاہنواز کے نثر کے یہ نشتر ہی ان کے اسلوب اور اظہار کی شناخت ہیں۔ یہ حروف برہنہ ہی ان کی انفرادیت کے امین ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کے وہ درجنوں مضامین پیش کئے جاسکتے ہیں جو گزشتہ برسوں کے دوران وادی کے مقبول اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں ہفت روزہ ''جبروت'' میں ''یہ مسلمان ہیں کہ انہیں دیکھ کر شرمائیں یہود'' کے سلسلے سے اقتباسات پیش ہیں:

''انجینئر صاحب دن کی روشنی میں اولیائے کرام کی درگاہوں پر حاضری دیتے ہیں اور رات کی تاریکی میں اپنے ماتحتوں اور ٹھیکیداروں کے

ساتھ سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی جیب کو جادوئی تھیلا بھی کہا جا سکتا ہے جس میں سے جب چاہو جتنے چاہو پیسے نکالو۔اس کے خالی ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔وکیل صاحبان بار ایسوسی ایشن کی شکل بنا کر سیاست کے پری محل میں بھی تاک جھانک کرتے رہتے ہیں۔استاد استانی اسکول میں بچوں کو سبق ذہن نشین کرانے کے بجائے ''ذہن نشین'' کراتے ہیں''۔

''ہڑتال نیم مردہ بستی کو یخ بستہ کرنے والا جدید ترین ہتھیار ہے۔ سڑکیں سنسان اور گلی کوچے ویران ہو جاتے ہیں اور خلقت گھروں کے اندر ٹیلی ویژن تاش یا نیند کی نذر وقت کر دیتی ہے''۔

محفلوں کو اپنی پُر لطف باتوں سے باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔لیکن اپنی محرومیوں کو ذات کے زنداں میں قید کر دینے کا گُر اب ان میں آ گیا ہے۔بعض یارانِ کہن شہنواز ٹینگ کو مجموعہ اضداد بھی کہتے ہیں،لیکن آپ کے ذات میں جو عجب سی قلندرانہ شان پائی جاتی ہے اس کی بنا پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

ادیبوں کی دنیا کے درویش ہیں یہ

---

1 ہفت روزہ ''جبروت'' ۱۳/دسمبر ۱۹۹۰ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

تسکینہ فاضل

تسکینہ فاضل یکم مئی ۱۹۵۵ء کو ڈب تل (سرینگر) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد فاضلؔ کاشمیری وادی کے ایک معروف شاعر ہیں۔ اس ادبی و علمی ماحول نے آپ کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ آپ نے ایم اے اردو کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی آف کشمیر کی طرف سے آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ فراقؔ گورکھپوری پہ آپ کے گراں قدر تحقیقی کام کا اعتراف پروفیسر آل احمد سرورؔ اور گوپی چند نارنگ نے بھی کیا ہے۔ اقبالؔ کے معاصرین اور اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات جیسے اہم مقالات تسکینہ فاضلؔ کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بعض دیگر مقالات ملک اور ریاست کے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری کے فن پر آپ کا ایک تحقیقی مقالہ ''اقبالیات'' میں شائع ہوا ہے۔ فراق کے فکروفن پر تسکینہ فاضلؔ کے مزید کئی مقالے شائع ہوئے ہیں۔ چنانچہ سہ ماہی ''اردو ادب'' کے فراق نمبر میں ''فراق کی رباعیات'' کے عنوان سے آپ کا ایک اور مضمون شائع ہوا ہے۔ اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی خدمات انجام دینے کے علاوہ آپ روزنامہ ''وادی کی آواز'' سے بھی

وابستہ ہیں۔اس روزنامے میں آپ کے درجنوں مضامین شائع ہوئے ہیں جو صحافتی سطحیت سے علیحدہ اپنی ایک الگ شناخت متعین کرتے ہیں آپ نے اپنے والد فاضلؔ کاشمیری پر بھی ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں اُن کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل بحث وتمحیص کی گئی ہے۔

اس کتاب میں فاضل صاحب کو محض ایک والد کی حیثیت سے پروجیکٹ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ مصنفہ نے ایک بے ریا ناقد کی طرح غیر جانب دارانہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔چنانچہ وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں خود لکھتی ہیں۔

"اس کتاب کو میری جانب سے فاضل صاحب کے تئیں کسی عقیدت کے نذرانے پر محمول نہ کیا جائے۔تخلیقی فن کار کے حصے میں ایک وقت وہ ضرور آجاتا ہے جب اس کی شاعری اپنا دماغ آپ کرتی ہے"۔

بہر حال یہ امر واضح کہ اس کتاب کے طفیل فاضل صاحب کی تخلیقی شخصیت کے مختلف پہلو روشن ہوئے ہیں۔جنہیں تسکینہ صاحبہ نے اپنی سلیس نفیس اور لطیف الفاظ کے میڈیم سے زبان بخشی ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

غلام نبی غمگین

سوکھی راتیں بھیگے دن، غمگین کی پہلی تصنیف ہے۔ افسانوں کے اس مجموعے کی اشاعت کا اہتمام بیوٹی سنٹر بارہمولہ نے کیا تھا۔ ''ہم تینوں'' ان کی دوسری تصنیف ہے۔ یہ کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ایک عشقیہ داستان ہے۔ ایک سوبیس صفحات پر پھیلی اس روایتی کہانی میں کوئی جدت یا نفاست نہیں ہے۔ بعض کہانیاں علامتی فریم ورک میں بُنی گئی ہیں۔ ''ام ل'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ یہاں بے رحم حقیقتوں کی پردہ کشائی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی گندی ذہنیت کی غمازی کی گئی ہے۔ اس کہانی سے ایک اقتباس:

''دماغ ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دو نسیں زنجیر بنتی ہیں تو بننے دو۔ اور وہ...... جو الف ننگا ہے۔ اور وہ...... جو الف بھوکا ہے۔ سوچتا رہا۔ زنجیر تنگ ہوتی گئی اور ٹوٹتی گئی۔ سینکڑوں ٹکڑوں میں اور ہر ٹکڑا ایک لمبی زنجیر بنتا گیا۔ ہزاروں میل لمبی۔ زمین سے آسمان تک۔ فرش سے عرش تک...... وہ الف بنتا گیا۔ سوکھتا گیا۔ سر سے پاؤں تک اوپر سے نیچے تک''۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

طاہر محی الدین

صحافت ہر معاشرے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس میں انفرادی اور اجتماعی طور زندگی کے سارے رنگوں کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے ریڈیائی صحافت ہو، رسائل یا اخبار نویسی ہو یا پھر الیکٹرانک میڈیا، جدید تقاضوں اور اطلاعاتی نظام کی زبردست پیش رفت نے خبروں کی تحریر ترتیب اور تشریح کو نئی وسعت اور نئی معنویت دی ہے۔ چنانچہ صحافت ایک باوقار پیشہ خیال کیا جاتا ہے لیکن صرف اُن لوگوں کے لئے جو بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی محض رزق اور موت کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے صحافت کی دنیا میں وارد نہ ہوئے ہوں بلکہ جن کے وجود میں اظہار اور ابلاغ کی امنگ اور تڑپ طوفان کی طرح بھپرتی رہی ہو۔

طاہر محی الدین ہماری وادی کے ایک ایسے ہی تخلیقی صحافی ہیں۔ آپ کا اصلی نام غلام محی الدین وانی ہے۔ کپوارہ کے دور دراز پہاڑی علاقے میں آپ کا جنم خواجہ محمد مقبول وانی کے ہاں ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم ترہ گام کے ہائی اسکول میں حاصل کی اور پھر سوپور کالج میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۹۷۷ء میں روزنامہ آفتاب سے منسلک ہوگئے۔ یہاں آپ خبروں کی تحریر کے علاوہ ''خبروں

کے آئینے میں'' کا دلچسپ کالم ترتیب دینے لگے۔ آپ کا یہ کالم موضوعاتی اور اخباری دلچسپی کے مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان موضوعات کا تعلق مذہب سے لیکر کھیلوں کی دنیا تک اور ادب سے لے کر قومی اور بین الاقوامی سیا سیاست تک ہوتا تھا۔ ممتاز کالم نویس ظفر پیامی نے ایک انٹرویو میں اس موضوع کی تشریح کرتے ہوئے بتایا تھا...... ''دراصل ہم لوگ خبر نہیں دیتے بلکہ خبروں کی خبر لیتے ہیں''۔ طاہر محی الدین کے اس کالم کی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ گو ان کے ہر کالم کی جڑیں کسی خبر میں مضمر رہتیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کا جری و بے باک قلم خبر کے پس پردہ دل آویزیوں اور سیاہ کاریوں کی ساری داستان بھی سنا دیتا تھا۔ اس طرح آپ اپنی شگفتہ نگاری سے ایک معمولی سی خبر کو افکار کی نئی کائنات سے آشنا کر کے رکھ دیتے تھے۔ اس سچے اور کھرے صحیفہ نگار کی ان ابتدائی تحریروں کا اطراف و اکناف میں والہانہ استقبال کیا گیا۔

پھر جب ۱۹۸۵ء کے آس پاس آپ نے ہفت روزہ چٹان کی ادارت سنبھالی اور اپنے تیشہ قلم سے بڑی بڑی شخصیتوں کے پندار کے بت توڑ کے رکھ دئے تو آپ کے حرف برہنہ اور حق گوئی کی دھوم مچ گئی۔ غیر موافق حالات کے باوجود آپ کا قلم تحریر میں کسی رو رعایت کا قائل نہیں ہوسکا بلکہ ہر بندش کے آگے شمشیر خون آشام بن کر عزیمت و استقامت سے ڈٹا رہا۔ چٹان جتنا مقبول ہوتا گیا آپ کی شہرت بھی بوئے گل کی طرح پھیلتی چلی گئی لیکن ''چٹان'' کے آٹھ برس پورے ہونے پر آپ نے اپنی کشمکش کا احوال ''ہر داغ ہے اس دل میں بجز ۱......!'' کے عنوان سے ان الفاظ میں کیا ہے:

''چٹان نے اس عرصے میں بہت اتار چڑھاو دیکھے کبھی حکومت کا عتاب کبھی حالات کی سنگینی لیکن قدرت کی خاص کرم فرمائی نے ہمیں احساس شکست سے بچایا۔ نامساعد حالات میں ایک غیر منافع بخش عمل سے جڑے رہنے کے لئے عقل سے زیادہ جنوں کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر اصولوں کے ساتھ والہانہ وابستگی۔ ہم نے عشق کی یہ ریت نبھانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ موجودہ حالات میں آدرش وادی صحافت محض ایک مفروضہ ہے۔ کاغذ کے چند صفحے سیاہ کرنا بہت آسان کام ہے لیکن درحقیقت ترجمانی کا حق ادا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ قربانیوں کا طویل سلسلہ ہے جس کے لئے صحافی کا قلم اُس کی رگوں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیتا ہے......''

طاہر محی الدین کی تحریروں میں ایسی انفرادیت کے نقش جا بجا اُبھرتے رہتے ہیں۔ ان تحریروں میں صحافیانہ عُجلت پسندی نظر نہیں آتی۔ ان کے ایک ایک لفظ سے عصر حاضر کا ہر لمحہ جھانکتا رہتا ہے۔ زندگی اور اس کی کشمکش یہاں بلا کم و کاست اپنے حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے 2:

''......کیا ہمیں یاد ہے کہ اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے محض ہمارے درمیان کچھ عارضی تنازعات ہی زمہ دار تھے۔ ہم نے چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے مل جل کر جینے کی صلاحیت کھو دی تھی۔ حکمران جابر اور رعیت ناعاقبت اندیش بن گئی چنانچہ ہم نے کھلی اور تازہ ہوا کے لئے اپنے گھر کے کواڑ کیا کھول دئے کہ باد مموم کے طوفان اندر گھس آئے۔ مغل، پٹھان، سکھ اور ڈوگرے غول کے غول اندر در آئے اور ہماری قسمت اور عصمت سے وہ کھلواڑ

کیا کہ وہ اندھیری رات ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے......"

یہ عبارت عندیہ دیتی ہے کہ صحیفہ نگار کا ابلاغ اور اظہار کس قدر کامل ہے۔ اُس نے لامحدود حقیقت کو کس طرح محدود الفاظ میں اسیر کیا ہے۔ اس توانا انشا کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو3:

"وقت خُدا کا ایک ایسا مظہر ہے جو اپنے فیصلے سُناتے وقت رحم سے کام نہیں لیتا۔ اس کے فیصلے قُدرت کے اُن اٹل قوانین کے تابع ہوتے ہیں جن سے اس پوری کائنات میں مُسلسل شکست و رنجیت اور تخریب و تعمیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہر وہ شئے وقت کے بطن میں کھو جاتی ہے جو اندرونی انتشار کی وجہ سے برقرار رہنے اور اُبھرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو۔ یہ قانون ملکوں اور قوموں کے حق میں بھی اتنا ہی صحیح ہے"۔

طاہر محی الدین کی ایسی نگارشات سلاست اور لطافت سے سج کر ادب پاروں کی حیثیت حاصل کرتی ہیں۔ بعض یاران نکتہ داں اسے ہنگامی نوعیت کا سطحی ادب قرار دیتے ہیں لیکن اگر معقول واقعہ نگار نے ایک سچی بات کو ایک اچھی بات بنا کر پیش کیا ہو تو کیا وہ ادب کی ہر کسوٹی پر سچا اور کھرا نہیں نکلتا۔ یہ سچ ہے کی ادب ادب ہے اور صحافت صحافت ہے لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ صحافت ہی ہے جس نے لگ بھگ ہر بڑی زبان کے فکشن کو پروان چڑھانے میں اپنا اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سرشار کی معروف تصنیف "فسانہ آزاد" اودھ اخبار میں برسوں تک قسط وار شائع نہ ہوتی۔ "زمانہ" میں کالم لکھنے والا گمنام دھنپت رائے کبھی "پریم چند" نہ بنتا۔ "الہلال" میں خطیبانہ تحریریں لکھنے والے مولانا آزاد سے "غُبار خاطر" جیسی

عالمانہ انشا منسوب نہ ہوتی اور شمیم احمد شمیم جیسے صحیفہ نگار منظر عام پر نہیں آتے جو ہمارے یہاں صحافت اور ادب کی تابند اور توانائی کی علامت ہیں۔ طاہر محی الدین اسی قافلے کے تازہ قلم راہرو ہیں۔ وہ صحافت کے صحرا میں ادب کے نخلستان سے کھلنے والا گُلِ لالہ ہے۔ ایک ایسا نادر پھول جس کی تازگی پر کہنگی کا کوئی سایہ نہیں۔ جس کے شائستہ لیکن بے لاگ انتقاد سے کوئی بالاتر نہیں۔ ملاحظہ کیجئے 4:

"آدم کی اولاد جب انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتی ہے تو کس طرح درندگی کے سبھی ریکارڈ مات کر دئے جاتے ہیں۔ اس خونی ڈرامے کے پس پشت کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ اس سلسلے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہیں گی تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ دنیا کا کوئی بھی شخص جس کا ضمیر جوہرِ انسانیت سے بالکل ہی خالی نہ ہو گیا ہو اس شرمناک واقعہ کی مدت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والا کسی مذہب اور کسی قوم کا دوست نہیں ہوتا۔ قاتل صرف قاتل ہوتا ہے۔ بے رحم سیاست دان انسانیت کا کفن تک بیچ کھانے میں ذرا بھر عار محسوس نہیں کرتے اور انہیں جب اور جہاں موقع ملتا ہے تو انسانی لاشوں سے اپنی دکانیں سجا لیتے ہیں"۔

اس طرح کے ادارئے بلا شبہ ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ملت اسلامیہ کے ایک سچے بہی خواہ کی پاکیزہ افکار کے ایسے آئینے ہیں جن میں ملت کی تصویر کو پوری دیانت داری اور خلوص سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کا انداز صحافیانہ نہیں ہے۔ یہ اپنے عہد کی آواز ہیں۔ اس سے قاری کے ذوق کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اہل علم کے لئے ایک ارمغان سے

کم نہیں۔ ان اداریوں کی نثر میں وہ تمام خوبیاں ہیں جن سے اردو نثر کا بنیادی اسلوب عبارت ہے طاہر محی الدین کے قلم نے اس اسلوب کو مزید نکھارا ہے اور اپنی ادبی صحافت سے اس میں چار چاند لگائے ہیں۔ گردش آفاق کی دبیز گرد بھی ان تحریروں کو دُھندلانے کی متحمل نہیں ہوسکتی......"

اب جاوداں ہوں اپنی کتابوں کے درمیان

---

1 ہفت روزہ چٹان سالگرہ نمبر ۱۹۹۳ء

2 تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ چٹان ۲۸ رجون ۱۹۹۲ء

3 ہفتہ روزہ چٹان ۲۰ رجون ۱۹۹۳ء

4 اُف یہ تذلیل کے داغ: ہفتہ روزہ چٹان ۲۳ راگست ۱۹۹۳ء

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ڈاکٹر اشرف آثاری

آپ نے ہومیو پیتھی میں ڈگری لینے کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا ہے۔ ان دنوں اسلامیات میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ آپ کے افسانے اور تنقیدی مضامین رسائل واخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

اردو کے ہفت روزہ ''سٹیٹ رپورٹر'' سے بھی وابستہ رہے ہیں لیکن ان کا اہم کارنامہ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے ان کے وہ طبی مضامین ہیں جنہیں وہ اب کئی کتابوں پر مشتمل ایک سیریز کے تحت شائع کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کتاب ''ذیابطیس اور ہومیو پیتھی'' پہلے ہی شائع ہو چکی ہے۔ یہ علمی نثر پر شائع ہونے والی کشمیر میں اپنی نوعیت کی پہلی کتابوں میں سے ایک ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ''دارالترجمہ'' میں برسوں پہلے علم طب سے متعلق متعدد انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کئے گئے تھے لیکن یہ ڈاکٹر اشرف آثاری کی طبع زاد کوشش ہے۔ تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل یہ کتاب آفسیٹ پر بڑے اہتمام سے شائع کرائی گئی ہے۔ آپ نے کشمیر کی تقریباً ایک سو جڑی بوٹیوں پر بھی تحقیقی کام کیا ہے جسے آپ عنقریب شائع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مشتاق مہدی

آپ کا اصلی نام مشتاق احمد ہے۔آپ ۱۳ر فروری ۱۹۵۲ء کو سورہ ٹینگ خانیار میں پیدا ہوئے۔آپ نے گریجویشن ۱۹۷۲ء میں مکمل کی اور محکمہ صحت میں ملازم ہوگئے۔آپ کی پہلی کہانی کا عنوان ''کمینہ'' تھا اور یہ ۱۹۷۴ء کے وسط میں فلم سنسار (ممبئی) میں شائع ہوئی۔اُس زمانے آپ مشتاق احمد مشتاق کے نام سے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔۱۹۷۶ء میں آپ نے اپنے دو اور دوستوں کے تعاون سے افسانوں کا ایک مجموعہ ''مٹی کے دیے'' شائع کرایا۔اس مجموعہ میں کُل ۱۴ر افسانے ہیں جن میں چھ افسانے کشمیری میں ہیں۔ادبی حلقوں میں افسانوں کا یہ حسین مجموعہ اس لئے ایک چونکا دینے والا عجوبہ ثابت ہوا کیونکہ یہ بیک وقت دو زبانوں کی نمائندگی کرتا تھا۔اس مجموعہ کی کلیدی کہانی ''مٹی کا دیا'' خود مشتاق کی ہی تخلیق ہے۔آپ نے اس کہانی میں معاشرے کے دامن پر لگے بدنما دھبوں کو اجاگر کرنے کے علاوہ اوباش قسم کے مردوں پر طنز کے تازیانے برسائے ہیں۔اس مجموعے کے دوسرے افسانوں مثلاً ''نشہ اور ٹھوکر، احساس کا گھاو اور پاگل'' کے موضوع بھی اچھوتے اور انفرادیت کے حامل ہیں۔

۱۹۷۸ء سے آپ نے مشتاق مہدی کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اس دور کے بعد آپ کے افسانے نے نئی سمت اختیار کی۔ آپ کے افسانے ''دو بہنیں، اقرار، نئی کہانی اور دیوتا'' نہ صرف موضوعاتی تازگی اور اسلوب کی شادابیت کے مظہر ہیں بلکہ ان میں زندگی کی نئی معنویت اور اقدار کی شکست و رنجیت کے نئے مراحل کی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ تجریدیت کی ایک توانا تخلیق ''دیوتا'' سے اقتباس:

''......اُس کے قبضے میں کائنات کی حرکت ہوگی۔ وہ روحوں کا مالک بن جائے گا۔ اپنے آنسوں سے لوگوں کے خشک پیالے بھرے گا۔ اپنی جھولی میں چھپائے قرمزی پھولوں سے ننگی عصمتوں کو سنبھالے گا۔ اپنے نورانی تو سے سیاہ جھونپڑوں میں روشن آفتاب چمکائے گا۔ خواہش کتنی معصوم تھی۔ پڑاو کتنا سخت تھا۔ ایک بزدل انسان کے لئے موت کا باعث لیکن ایک بااعتماد شخص کے لئے محض ایک طبی چھلانگ ایک لمبی چھلانگ''۔

شیرازہ کے ''نوجوان نمبر'' اور تعمیر کے جموں وکشمیر میں اردو ادب نمبر میں آپ کی کہانیاں بھی جدیدیت کا مزاج لئے ہوئے ہیں۔ آپ عصری آگہی سے تھکی ہوئی ذات کے المیوں اور اذیتوں کا برہنہ اظہار کرتے ہیں لیکن آپ کی آواز صاف اور نکھری ہوئی ہے۔ اپنے بعض دیگر ہم عصر دوستوں کی طرح آپ کی علامتیں دھند میں لپٹی ہوئی نظر نہیں آتی ہیں۔ ماہنامہ ''شاعر'' کے ایک حالیہ شمارے میں آپ کا ایک اور افسانہ ''آخری دن'' شایع ہوا ہے۔ یہاں آپ نے اظہار کا ایک نیا برّ اعظم تلاش کیا ہے لیکن استعاروں اور علامتوں کے نئے پیکر تراشنے کے ساتھ ہی کچھ نکات بھی ابھرتے ہیں۔ اپنی تخلیق میں ادیب کی موضوعی موجودگی یہ مطلب رکھتی

ہے کہ معاشرے کو ایک خاص فرد کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ایک طرف جہاں افسانہ نگار اپنے آپ کو وجودیت پرست Existentialists کہلواتے ہیں اور شعور کی رو جیسی تکنیکیں استعمال کرتے ہیں لیکن پھر یہی افسانے ادیب کے تصوات وجذبات اور احساسات کے آئینے کیونکر بن جاتے ہیں؟ یہ افسانے راوی یا مرکزی کردار کے داخلی تاثر کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ راوی اور ادیب کے نقطۂ نظر میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ ''آخری دن'' ایسے افسانوں میں وہ Irony نہیں ملتی جو غیر معتبر راوی والے افسانوں میں مل سکتی ہے۔

مشتاق مہدی نے ریڈیو کے لئے بعض اچھے ڈرامے بھی تحریر کئے ہیں۔ آپ کے ڈرامے ''خواب'' اور ''کالے نگر میں'' اس میڈیم سے آپ کی کماحقہ آگہی کے غماز ہیں۔ آپ کا ناول ''دل کا دھواں'' شائع نہیں ہوسکا ہے۔ یہ ناول ماں باپ بہن اور شعلہ ریز جوانیوں کے بیچ بھٹکتے ہوئے ایک حساس نوجوان کی تلخ وحسرت ناک داستان ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

پریمی رومانی

آپ کا اصلی نام سبھاش چندر ایمہ ہے۔ رنگ ٹینگ (سرینگر) کے ایک اہلِ علم کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ڈاکٹر برج پریمی اردو اور کشمیری کے ایک ممتاز افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ جدید شعراء کے انفرادی مطالعوں پر مبنی ان کی کتاب ''جدید اردو شاعری: چند مطالعے'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں دس شاعروں کے مطالعے پیش کئے گئے ہیں۔ جن میں خلیل الرحمان اعظمی، بلراج کومل، مخمور سعیدی، شہریار اور حامدی کشمیری بھی شامل ہیں۔ پریمی رومانی جدید شاعری کے ایک اچھے پارکھ ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک شگفتگی ہے۔ انہوں نے اپنے نقد ونظر میں نہایت اعتدال احتیاط اور عزم سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے اس کتاب کے مختصر لیکن اپنے عالمانہ دیباچے میں جواں سال ناقد کو ان الفاظ میں داد دی ہے:

''پریمی رومانی نئی اردو شاعری کے مزاج آشنا ہیں۔ مجھے خوشی ہے
کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق وامتیاز سے واقف ہیں''۔

''اوراق'' پریمی کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں انہیں نے جوش سے لے کر طالب کشمیری، وزیر آغا اور شہر یار تک متعدد شعراء کے فکر وفن پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان مضامین میں ان کی شاعری کے نئے خط و خال اور نئی وسعتوں کو اجاگر کرنے کی ایک مستحسن کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اپنی تشریحات کو مناسب ذیلی حوالوں کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ پریمی رومانی ہمارے ایک باصلاحیت قلم کار ہیں اور ان کے قدم خوب سے خوب تر کی تلاش میں بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں۔ اختر الایمان کی شخصیت اور فن پر آپ کی ایک اور کتاب عنقریب ہی منظر عام پر آ رہی ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مجید مضمر

ڈاکٹر مجید مضمر کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اردو زبان وادب کے اس کہنہ مشق استاد نے مختلف ادوار میں مختلف انداز کی ایسی تحریریں رقم کی ہیں۔ جن کے نقوش کو Erase نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تحریریں آپ کی تنقیدی بصیرت اور تخلیقی وسعت کی غماز ہیں۔ ''بازیافت'' شعبہ اردو کا ایسا رسالہ ہے جس کی ترتیب وتہذیب کے کام کے ساتھ آپ برسوں تک وابستہ رہے اور اسے اردو کی ترویج اور ترقی کا اہم وسیلہ بنانے میں عرق ریزی سے کام کرتے رہے۔ ادبی صحافت کے ان صفحات میں آپ زبان وادب کے معاملات پر اپنے معروف اسلوب میں معقول تجزیہ پیش کرتے رہے۔ مضمر صاحب بات کرتے ہیں تو جیسے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں تو جیسے جگنوؤں کا ایک کارواں گزرنے لگتا ہے۔ آیئے موسیقیت کے ترنم کی ایک ذرا لے سے محظوظ ہونے کی کوشش کریں۔ ملاحظہ کیجئے۔

''حامدی کاشمیری اپنی لہوتابشوں سے ظلمات کو منوِر کرتے ہیں اور نادیدہ تجربوں کے لعل وجوہر سمیٹ لیتے ہیں۔ ظلمات کا یہ طلسم خانہ جہان ہر

طلسم ہوش ربا اور ہر تجربہ حیرت زا ہے شاعر کا تخلیقی وجود یا اس کا باطن ہے۔ اس کی سیاحت بھی ممکن ہو سکتی ہے جب اس کی کلید ہاتھ آ جائے حامدی کاشمیری کو سم سم کی یہ کلید حاصل کرنے میں جانے کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑا ہوا گا کیونکہ خون جگر کے بغیر سبھی نقش ناتمام اور سبھی نغمے سودائے خام ثابت ہوئے ہیں"۔

رفیق اشبری

آپ ۴/اپریل ۱۹۵۲ء کو کشمیر کے سحر انگیز خطے نشاط باغ کے قریب ایک گاؤں ''اِشبر'' میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو آپ اپنے بعض معاصرین کے برعکس اردو اور کشمیری میں بیک وقت اپنی تخلیقات کے چراغ روشن کرنے لگے۔ کشمیری زبان میں آپ نے ایک ابھرتے ہوئے طنز نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت پیدا کرلی۔ اردو میں آپ کے ادبی مضامین اور افسانے مختلف رسالوں، اخباروں اور جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ تعمیر کے جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارے میں آپ کا ایک افسانہ ''پل صراط کے راہی'' شائع ہوا۔ افسانے میں عہد حاضر کے تناظر میں فرد کے اندر اس کی اپنی خامیوں، وقت کی سفاکیوں اور خودغرضانہ روئے کے احساسات اور جذبات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اشبری کے بیشتر افسانوں کے موضوعات عصری حسیت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اخبارات میں شائع ہونے والے آپ کے ادبی مضامین کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مافی الضمیر کو نہایت ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

آپ کا ناول ''اور پتھر پگھل گئے'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ آج کا نوجوان ان راہوں پہ چل پڑتا ہے۔ جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ بعض پیش بین حال کی رنگین صحبتوں کو نظر انداز کر کے کل کی تعمیر میں جٹ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل ان کی سرگوشیاں کوئی نہیں سنتا لیکن بلآخر فتح ان کا مقدر بن جاتی ہے۔[1] ''پتھر پگھل گئے'' اسی مرکزی خیال کے گرد گھومتا ہے۔ اشبری کی زبان میں روانی اور بیان میں رومانیت اور سماجی احساس کا اچھا امتزاج نظر آتا ہے، لیکن فنی تخلیق خون جگر کی جس مکمل نقش گری کی متقاضی ہے یہ ناول مجموعی طور اس کے ارتکاز سے انحراف کرتا ہے۔ اشبری صاحب کی توجہ اب زیادہ مزاح نگاری کی طرف مبذول ہوئی ہے اور اس شعبے میں وہ زیادہ سرگرم نظر آتے ہیں۔

---

1 اور پتھر پگھل گئے: رفیق اشبری ص ۸۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد یوسف خان

محمد یوسف خان عادلؔ ۱۹۴۷ء میں عالی کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ اردو اور ایجوکیشن کے مضامین میں ایم اے کرنے کے بعد ایم فل کر چکے ہیں ۱۹۶۹ء میں آپ نے ایک ہفتہ روزہ ''شمیم گُل'' جاری کیا جسے بقول اُن کے نوجوان ادیبوں نے شمیم وقت بنا دیا۔ جہد مسلسل میں زبردست یقین رکھتے ہیں۔ اس وقت محکمہ تعلیم میں اُردو لیکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

عادلؔ کی شعری اور نثری نگارشات ریاست کے ممتاز جرائد میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ آپ کا تحقیقی پروجکیٹ ''کشمیر میں اردو شاعری'' ۱۹۸۸ء میں شایع ہوا۔ آپ کا مطالعہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی اُردو شاعری تک محدود ہے۔ ڈاکٹر حامدیؔ کاشمیری کے مطابق بقید حیات ہم عصر شعرا پر قلم اُٹھانا خاصا ہم جویانہ کارنامہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور عادلؔ کا اپروچ تنقیدی کم اور تحسینی زیادہ رہا ہے۔ اس تحقیقی کام کو جامع بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بیشتر ہم عصر شعرا کا تخلیقی سفر ابھی جاری وساری ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب سے اردو شعر وادب کے طلبہ کو کافی فائدہ ہوگا اُن کے لئے یہ ایک لازوال تحفہ ثابت ہوگی۔ اس پہلی کوشش کے بعد

اس محفل میں کئی چراغ روشن ہوں گے۔

شجاؔع سلطان، اقبال فہیؔم، عابدؔہ احمد، اشرف ساحؔل، غلام محمد آجؔر، پرتپال سنگھ بیتاؔب، فاروق آفاؔق نئے شعری رجحان کو ریاست میں نمایاں اور مستحکم عطا پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان سبھی کا عادل صاحب کی کتاب میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عادؔل صاحب کا حتمی اور مکمل کام تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے وہ اس کی تلافی اپنی زیر تکمیل پی ایچ ڈی کی تحقیق میں کردیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

میر سید مشتاق ہمدانی

آپ ہمدانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔آپ نے حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی حیات پر اپنی کتاب ''کشمیر اسلام کے سائے میں'' کے عنوان سے ۱۹۸۴ میں شایع کرائی۔اس ضخیم کتاب کے تعارف میں بزرگ شاعر و صوفی سید مبارک شاہ گیلانی فطرت یوں رقم طراز ہیں:

''مدت سے میری آرزو تھی کہ حضرت امیر کبیرؒ کے حالات و واقعات قلم بند کروں اور جو اختلافات و روایات مورخوں سے سرزد ہوئے ہیں۔اُن پر ایک تحقیقی مقالہ لکھوں لیکن یہ آرزو میرے دل میں خار کی طرح کھٹکتی رہی۔اب اچانک حضرت شاہ ہمدانؒ کے خاندان سے ہی ایک تارا چمکا جس نے اس مضمون پر کماحقہ ایک مستند مقالہ تحریر کیا جو قدیم تاریخ کا آئینہ دار ہے۔اس عزیز نے میرے دیرینہ خواب کو باعث تعبیر کیا ہے''۔

خود میر مشتاق ہمدانی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''میں ان صاحب بصیرت اہل علم حضرات سے جو اس کتاب کا مطالعہ کریں گے معافی کا طلب گار ہوں جنہیں رب العزت نے اپنے علم و عمل کے

خزانوں سے مالا مال کیا ہے شاید اُن کو میری یہ کوشش بے ادبی لگے......"

راقم الحروف نے جب اس سلسلے میں خانقاہ شاہ ہمدانؒ کے بعض ممتاز لوگوں سے رابطہ قایم کیا اور اُن سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اُن میں سے اکثر کی بات چیت سے یہ عندیہ ملا کہ مصنف نے اس کتاب کی ترتیب وتہذیب میں وسیع اور صحیح تحقیقی جذبے سے کام نہیں لیا ہے۔ چنانچہ مسعود احمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ "کشمیر اسلام کے سائے میں" کے بیشتر واقعات میں جھول ہے اور ان میں مزید تحقیق وتجسس کی ضرورت تھی۔ تاہم مصنف کے جذبے کو بلا تامل سراہا جاسکتا ہے۔

---

1 کشمیر اسلام کے سائے میں: مبارک شاہ فطرت ص ۸

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

میرک شاہ طالب

آپ کا پورا نام محمد میرک شاہ طالب کاندہامی ہے۔آپ کا جنم کاندہامے کے ایک سید گھرانے میں ۱۹۵۳ء میں ہوا۔میرک شاہ کے مطابق آپ کے آباواجداد مکہ شریف سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوئے تھے جہاں سے سو سال پہلے آپ کا خاندان ہجرت کر کے کشمیر آیا تھا۔آپ کو علمی ماحول ورثے میں حاصل ہوا۔بی اے کا امتحانِ امتیاز سے پاس کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ایک مدرس کی حیثیت سے متعین ہوئے۔

میرک شاہ کو بچپن میں ہی دنیا کی بے ثباتی اور ناپیداری کا احساس ہو چکا تھا۔شعر و شعری سے لگاو اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ اردو، فارسی اور کشمیری کے ممتاز شعرا کے ساٹھ ہزار اشعار آپ نے حفظ کر لئے۔عشق و عرفان کا یہ لاوا بالآخر ۱۹۸۸ء میں ''پیام وحدت'' کے نام سے پھوٹا۔یہ آپ کا پہلا شعری مجموعہ تھا۔اردو نثر میں آپ کی مرتب کردہ کتاب ''بحر توحید'' ۱۹۹۰ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی مالی معاونت سے شائع ہوئی۔

''بحر توحید'' وحدت الوجود، تصوف اور عشق حقیقی کے موضوعات پہ طالب

صاحب کے ۲۷ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ بیش بہا موتی ہیں جنہیں آپ نے کافی عرق ریزی کے بعد ایک مالا میں پرویا ہے۔ مصنف نے پامال تحریرات کو ایک نئی نگاہ دیکھا ہے اور روایات سے ہٹ کر عرفان وآگہی کے موضوعات میں نئی روح سی پھونک دی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں صوفیای باصفا کے افکار وعقاید اس دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں کہ ایک نیا سماں سا بندھ جاتا ہے۔ ''انسان اور حیوان'' عنوان کے تحت انسان نما حیوانوں سے انسانیت کی بازیافت کی تلقین کی ہے۔ ''مستی وپستی'' کے بیان میں دنیا پرستوں کی عاقبت سنوارنے کی سعی کی ہے۔ اسی طرح ''حیات وممات'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں عظیم المرتبت شخصیت کی سدابہار حیات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ممکن ہے کہ میرک شاہ کے عقائد سے بعض ارباب کو اتفاق نہ ہو اور ''زیارت قبور'' جیسے مضامین میں آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُسے اُن کے شرک سے تعبیر کیا جائے تاہم یہ امر باعث اطمینان ہے کہ آپ نے حقیقت ومعرفت کے متعلق اپنے خیالات نہایت آسان اور سلیس زبان میں ترتیب دئے ہیں جن سے قارئین اپنے فہم و ادراک کے مطابق استفادہ کرسکتے ہیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

مشتاق بھدرواہی

آپ کا پورا نام ڈاکٹر مشتاق احمد بھدرواہی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب بھدرواہ کی حسین وادیوں میں آپ نے ہوش سنبھالا تو پدرانہ شفقت کی محرومیوں نے بھی اپنے لرزاں وترساں سائے پھیلا دئے۔ پھر آپ سرینگر آئے اور یہاں کے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ تب سے آج تک آپ یہاں کے مختلف حصوں میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے ہیں لیکن اس دوران آپ کے اندر کا کہانی کار اور شاعر بھی اظہار کے مختلف پڑاؤ بتدریج طے کرتا رہا۔ مقامی روزناموں میں آپ کی کہانیاں شائع ہوتی رہیں جن میں ''غریب کا لہو'' اور ''سگریٹ کا دھواں'' جیسی کہانیاں بھی شامل ہیں۔

۱۹۸۳ء میں آپ کا ناول ''لہو کے چراغ'' شایع ہوا۔ اس ناول میں مشتاق صاحب نے زندگی کے تضاد اور شکست ومحرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ دیکھا جائے تو آپ کا موضوع جدت کا کوئی پہلو نہیں رکھتا۔ اس میں گھسے پٹے واقعات کو فلمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش نہایت نمایاں نظر آتی ہے، لیکن دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ چند معصوم اور سادہ لوح لوگوں کی کہانی ہے جو خوابوں، حسرتوں اور

آرزوں کے تاج محل تعمیر کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن ان کے یہ تاج محل اکثر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتے۔ اس لحاظ سے یہ ناول رومانی آرزومندی کا ایک سطحی خاکہ ہے جس میں تہہ آب کے نیچے مچلنے والے طوفان کا کوئی اندازہ نہیں۔ تہہ داری اور گہری معنویت کے جس عرفان سے ناول نگار کو بات کرنی تھی وہ بات اس ناول میں پیدا نہیں ہوسکی ہے۔ اشعار سے ابواب شروع کرنے کے انداز نے اسے ایک صدی قبل کے ناولوں کی قبیل میں ڈال دیا ہے۔ اختصار کے بدلے داستانویت کے یہ رجحانات اُردو فکشن میں نقش کہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۰ / دسمبر ۱۹۹۳ء میں آپ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

یوسف منتظر

یوسف منتظر کے تنقیدی مضامین اور افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں اپنی تخلیقات کا ایک انتخاب بھی ''تخلیقات منتظر'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ اس مجموعے میں دیگر اصناف سخن کے علاوہ مُنتظر صاحب کے بعض مضامین اور افسانے بھی شامل ہیں۔ جن افسانوں کو اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے اُن میں سے بعض کے عنوان یہ ہیں:

''صراحی ٹوٹ گئی، عشق پر زور نہیں ہنی مون، راہ چلتے چلتے، ادھورے سپنے''

ان کے اکثر افسانوں کا موضوع کشمیر ہے اور رومان افسانوں میں ٹھسا ہوا ہے۔ یخ بستہ ڈل میں شکاروں کے چلانے کا منظر انجم اپنے محبوب کو اس طرح لکھتی ہے 1۔

''کشمیر کی وہ بہاریں جو آدمی کو تڑپاتی ہیں جاڑے میں بالکل ویران پڑی ہیں لیکن ڈل جھیل کے منظر دیکھنے سے انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اس کے علاوہ ایک اور چیز دیکھنے کو آئی کہ کچھ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھوٹی کشتیاں دھکیلتے ہیں۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتے تھے لیکن اب کشتیاں ہی

آدمیوں پر بیٹھ کر ڈل کی سیر کرتی ہیں"۔

---

1 کشمیر میں اردو تیسرا حصہ ص ۱۸۷

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ڈی، کے، کنول

کشمیر کے اُن افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جن کا کارواں ۱۹۶۰ء کے بعد رواں دواں دکھائی دینے لگا۔ ان کے افسانے زندگی کے اضطرار اور اضطراب سے عبارت ہیں۔ ان کا افسانہ ''یہ کس کا لہو ہے؟'' ہمارے ادب کے ۱۹۷۳ء کے خصوصی شمارے میں شامل ہوا ہے۔ اقدار اور افکار کی شکست و ریخت نے انسان کو نفرت کی جس دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ افسانہ اُسی سانحے کی تفسیر ہے۔ رشی اور روشنی انسانیت کی بقا کے لئے اپنا سب کچھ داو پر لگا دیتے ہیں۔ وہ جن لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں وہی لوگ ان کے پیار کے آشیانے کو جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں۔ شیرازہ کے افسانہ نمبر میں کنول کی کہانی ''شکست'' کی تخلیقی معنویت انہیں ایک منجھا ہوا افسانہ نگار ثابت کرتی ہے۔ یہاں وہ علامتی فریم ورک میں بات کرتے ہیں۔ اس افسانے سے ایک اقتباس:

''.....شاید میں دیوانہ ہی تھا جو میں نے انسان سے بھگوان بننا چاہا۔ درصل میں پیار کی اُن کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا جنہیں نفرت کی زہریلی ہواؤں نے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں اُن پھولوں کو مُسکراتے ہوئے

دیکھنا چاہتا تھا جنہیں توں پو اور بموں نے جھلسا کر رکھ دیا تھا''۔

شیرازہ کے ہی جون ۱۹۸۳ء کے شمارے میں آپ کی ایک اور کہانی ''دیوار'' شائع ہوئی ہے۔اس کہانی میں بظاہر کوئی فنی پیچیدگی نہیں۔ یہاں انہوں نے اپنے احساسات کو واضح کرنے کے لئے کسی گہرے نفسیاتی نکتے کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ وہ زندگی کے کرب کو نہایت سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ ایک ریاکار معاشرے کے لوگوں کے چہرے سے وہ نقاب اُتار پھینکتے ہیں اور بعض کرداروں کے اصلی چہرے ہمارے سامنے اُبھر آتے ہیں۔ہم ساری زندگی بعض شخصیات کی من ہی من میں پرستش کرتے ہیں لیکن انجام کار ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی نخلستان نہیں بلکہ ایک سراب تھا جس کی جستجو میں ہم آبلہ پا ہوئے اختتام پر یہ افسانہ اچانک مُڑ جاتا ہے اور ہم پر کچھ نئی جہتیں روشن ہونے لگتے ہیں۔

''نیا سفر'' آپ کا ایک اہم ناول ہے۔ناول کا پلاٹ ایک کشمیری گھرانے رحمان خان اس کی بیوی زونی، بیٹی راجہ، اور بیٹے گُل کے گرد گھومتا ہے۔ایشر سنگھ اور اُس کی جوان بہن کلونت بھی ناول کے اہم کردار ہیں۔ یہ ایک نیم تاریخی حقیقت ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب کچھ لوگ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے درپے ہوگئے تھے۔ کسی تاریخی واقعے کو ناول کا موضوع بنانے کے لئے اس میں کافی ترمیم اور اضافے کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر قاری اس قسم کے ناول میں تاریخی حقایق تلاش کرنے لگے تو یہ کوشش بے سود ہوسکتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب سارا ہندوستان مذہبی جنون کی آگ میں جل رہا تھا تو کشمیر میں مختلف عقائد کے لوگ بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ جب برصغیر میں انسانیت دم توڑ رہی تھی تو گاندھی

نے کہا تھا کہ...... ''اس اندھیرے میں اگر مجھے کہیں روشنی کی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ کشمیر ہے''۔ دراصل روشنی کی یہ کرن محض کسی حادثہ کی پیداوار نہیں تھی۔ یہ وہ شمع تھی جو یہاں کے رشیوں، منیوں، اور صوفیوں نے سالہا سال پہلے روشن کی تھی۔ ان اقدار کو ہماری عظیم المرتبت شخصیات نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے شیرازہ کے ایک صاحب نظر نقاد یوں تحریر کرتے ہیں 1۔

''یہ ناول مقصدی اور ایک آدرشی ناول ہے جس میں انسان کی فرشتہ سیرت، درندہ خصلت اور روشن خیالی آپس میں دست وگریباں ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ انسانی قدریں سربلندی وکامرانی کا پرچم بلند رکھے ہوئے ہیں۔ ڈی کے کنول کو کردار نگاری پر قابو ہے وہ اجمال اختصار سے بھی واقف ہیں۔ اچھی اور صحیح اردو لکھنے کا بھی سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ناول ایک کامیاب کوشش ہے توقع ہے کہ اسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا کیونکہ اعلیٰ انسانی قدروں کی تقدیس ہم سب کو عزیز ہے......''

1　شیرازہ جلد ۱۷ شمارہ ۱ ص ۱۴۲ رسل پوپنز

○○○○○○○○

جگنوؤں کے قافلے

جموں وکشمیر میں فارسی زبان سالہا سال تک ثقافتی سفیر کی حیثیت سے مقبول رہی۔ اس زبان کا جلال اور وقار لگ بھگ چھ سو سال تک قائم رہا۔ یہ ایک طرف جہاں شہنشاہیت کی ترجمان تھی وہاں دوسری طرف یہ خوشبو کی آواز بھی تھی کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات کی عطر بیز ہواؤں سے جنت بداماں وادیوں کو مہکانے کا فریضہ بھی انجام دیتی رہی تھی۔ لیکن بیسوی صدی کے طلوع ہوتے ہی اس شیریں اور پرشکوہ زبان کا ستارہ جموں وکشمیر کے ادبی آسمان سے ڈوب گیا۔ سچ پوچھیں تو اس کی درخشندگی بہت پہلے سے ماند پڑنے لگی تھی۔ یہ تمام تر جلال وجبروت کے باوجود ایک ڈھلتی شام کا سورج بن کر رہ گئی تھی۔ اردو زبان آگہی کا نور بن کر سرحدوں کو روندتی ہوئی ریاست جموں وکشمیر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس اجنبی زبان کے مزاج میں ایک عجب شناسائی تھی۔ اس میں ترسیل خیال کے امکانات مقابلتاً زیادہ وسیع تھے۔ اس میں ارضِ ہند کے مٹی کی مہک بھی تھی اور عجم کے عرفان کی مقدس خوشبوئیں بھی۔ چنانچہ اردو نے فارسی کی ذی شان جانشین کا رتبہ حاصل کرلیا اور ریاست میں تبلیغ و ابلاغ کی نئی قندیلیں روشن کیں۔

رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں ہی نئے رجحانات کی دستک سنی تھی۔ مہاراجہ کے حکمران بنتے ہی جموں کے ادبی حلقوں میں اس نئے رجحان کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی۔ یہ ریاست میں گویا ایک نئے ادبی عہد کی شروعات تھی۔ رنبیر سنگھ اگرچہ خود زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر بعض ایسے انقلاب آفرین اقدامات اٹھائے جن سے ثقافتی سطح پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جی ایم ڈی صوفی اور بعض دیگر معتبر مورخین نے اگرچہ مہاراجہ کے ادبی رجحانات کو مغل شہنشاہ اکبر کی اندھی تقلید سے تعبیر کیا لیکن ''بدیا بلاس۱، اور ''دارالترجمے'' جیسے مستند اور مفید اداروں کے قیام اور ان کے گرانقدر کنٹری بیوشن کو بہر حال فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بدیا بلاس نام کا ہفت روزہ جموں و کشمیر کی صحافتی اور ثقافتی تاریخ میں بے پناہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اخبار ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں چھپتا تھا2۔ ''دارالترجمہ'' میں فن اور ادب کے علاوہ ارضیات اور سائنس کی کتابوں کے متعدد تراجم کرائے گئے۔ چنانچہ علم طب سے متعلق جن انگریزی عربی اور فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ ان میں علم تشریح امراض اطفال اور اناٹومی جیسے موضوعات کی کتابیں بھی شامل تھیں3۔

چودھری شیر سنگھ نے رنبیر سنگھ کے معتبر کی حیثیت سے ۱۸۶۸ء میں ہزارہ، پشاور، کابل اور بخارا کے علاقوں کا دورہ کیا۔ چودھری شیر سنگھ کا تعلق جموں کے علاقہ راجوری سے تھا اور ان کے پیش نظر بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی اور سیاسی تعلقات کا جائزہ لینا تھا۔ چودھری شیر سنگھ نے واپس آ کر اپنا سفر نامہ رنبیر سنگھ کو پیش کیا۔ یہ سفر نامہ اردو زبان میں ہے۔ ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں

شیر سنگھ نے اپنے سفر کے کوائف اور جائزہ کے نتائج مرتب کر کے پیش کئے۔ یہ سفارشات جموں و کشمیر کے سرکاری ریکارڈ میں اردو کی پہلی تحریر تصور کی جاتی ہے۔ جو مسودے کی صورت میں ڈوگرہ حکمرانوں کے محافظ خانوں میں پوری ایک صدی تک طاق نسیاں بنی رہی۔ برسوں بعد ڈاکٹر کرن سنگھ نے جب خفیہ ریکارڈ کا معاینہ کیا تو دیگر مخطوطات کے ساتھ یہ سفر نامہ بھی برآمد ہوا۔ اس تاریخی انکشاف کے بعد یہ جموں و کشمیر میں سرکاری طور پر اردو کی پہلی تحریر تسلیم کی گئی! اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نئی صدی کے طلوع ہونے سے پہلے ہی اردو زبان ایک نئے شعور کی علامت اور فارسی کا نعم البدل بن کر بتدریج ابھر رہی تھی۔

رنبیر اور رتن جیسے تاریخ ساز اخبار اور رسالے نے اردو کی دبستان کو معرض وجود میں لانے کے لئے ایک ناقابل فراموش رول ادا کیا۔ رنبیر لگ بھگ ایک چوتھائی صدی تک اردو کا ادبی مزاج بنانے اور اس کے نکھارنے میں مسلسل کوششیں کرتا رہا۔ اس کے ادبی صفحات پر اردو کے نقش اول ابھر کر سامنے آتے رہے۔ اس کے صفحات پر ہی دور دراز علاقوں کے ادیب اور شاعر دھندلکوں سے نکل کر آسمان ادب پر جگمگانے لگے۔ اس عہد ساز کام میں لالہ ملک راج صراف کی اعانت کرنے والوں میں شانتی سروپ نشاط، جو بعد میں ڈاکٹر ایس ایس نشاط کے نام سے معروف ہوئے اور لالہ جی کے اپنے فرزند اوم صراف پیش پیش رہے۔ کندن لال کو رسالہ رتن کی ادارت تفویض کی گئی۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں جب رتن پہلی بار عوام کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کے معیار اور میزان نے اسے بہت جلد ہندوستان گیر شہرت دلادی۔ ملک کے چوٹی کے قلم کار اس رسالے میں چھپنے لگے۔ ان دنوں جو ادیب اور شعرا رنبیر اور

رتن میں مسلسل اپنی قلمی معاونت پیش کرتے رہے ، ان میں ایس ایس نشاط، صاحبزادہ محمد عمر، پنڈت نندلال طالب، ویشوناتھ کیرنی، ذوالفقار علی نسیم، بدری ناتھ وکیل، گردھاری لال آنند، سروانا تھ آفتاب، پریم ناتھ پردیسی، مرزا مبارک بیگ، ماسٹر زندہ کول، غلام حیدر چستی، محی الدین احمد گمن اور تارا چند کے نام قابل ذکر ہیں۔ پھر چراغ سے چراغ جلتے رہے۔ جگنوؤں کا ایک قافلہ سا چل نکلا۔ لیکن دیوان نرسنگھ داس نرگس کی طرف سے جاری کئے جانے والے رسالے پریم، کی حیثیت ان سب سے الگ اور منفرد تھی۔

پریم، اپنی ضیا پوش کرنیں بکھیرتا ادبی صحافت کے آسمان پر ۱۹۴۳ء میں طلوع ہوا۔ پریم کے ابھر آنے کے ساتھ ہی ریاست اور بیرون ریاست کے فن کاروں کی ایک جمیعت بھی سامنے آئی جس نے بالخصوص جموں میں اردو کا ادبی مزاج تشکیل دینے میں اپنا تعمیری رول ادا کیا۔ اس رسالے کے خاص اشاعتوں میں ریاست کے مقابلتاً نو آموز قلم کاروں کے ساتھ ساتھ بیرون ریاست کے وہ بڑے بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی جگہ پانے لگے جو کل تلک اس میں چھپنے سے اجتناب کیا کرتے تھے۔ اس طرح پریم نے اپنی طرز کا مخصوص ادبی دبستاں قائم کیا جس میں ابھرتے ہوئے قلم کاروں کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔ اس کے حلقہ معاونین میں جو قلم کار نمایاں تھے ان میں خلیفہ عبدالحکیم، فیروزہ انور بہاری، پشپا سندرداس، بی ڈی مل شرما، عبدالعزیز علائی، قیصر قلندر، معراج الدین احمد، آذر عسکری، رسا جاودانی، عزیز کاش، ایم سلیم بانڈے، کنول نین پرواز، انجم کشمیری، اللہ رکھا ساغر، دیا شنکر گردش، کشمیری لال ذاکر محمود ہاشمی، منشی محمد الدین فوق قیس شیروانی

عشرت کاشمیری، طالب گورگانی، حبیب کیفوی، گلزار احمد فدا، ملک عمرالدین اور لطیف ہاشمی بھی شامل تھے۔

پھر پونچھ کی زرخیز سرزمین سے ضیاء الحسن ضیا کی ادارت میں دیہات کی دنیا کے شائع ہونے کے نتیجے میں ادبی دبستان کو مزید استحکام حاصل ہوا۔ اس کی اشاعت سے پونچھ اور پاس پڑوس کے گم گشتہ علاقوں میں ادبی سرگرمیوں کو ایک نئی جہت حاصل ہوئی۔ ان سبھی رسائل میں نثر و نظم کی ان گنت یادگار تحریریں شائع ہوئیں لیکن کرشنن کی ''سیر ہستی'' پہلا افسانہ تھا جو رنبیر کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔ یہ مجازی افسانہ خود اخبار رنبیر کی تعریف میں تحریر کیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۲۴ء کے آس پاس موہن لال مرواہ نے ریاست میں اردو کا پہلا ناول لکھا۔ داستان محبت عنوان کا یہ ناول اس زمانے میں مروج بعض مذہبی معاملات کو لے کر تحریر کیا گیا تھا۔ رنبیر کے ادبی ایڈیشن میں اس کتاب کی قدر و منزلت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ ایک اور قلم کار شمبھو ناتھ ناظر نے بیوی کی فریاد، نام کا ایک اور ناول انہیں دنوں شائع کرایا۔ یہ ناول بیوہ پر روا رکھے جانے والے مظالم کو لے کر تحریر کیا گیا تھا۔ اگر بیوہ کی شادی کی جسارت کی جاتی ہے تو سماج میں اسے ایک بغاوت کیوں تصور کیا جاتا ہے۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۴ کے رنبیر میں اس ناول کا ایک تنقیدی جائزہ بھی شامل ہے۔ پنڈت ویشو ناتھ نے ۱۹۲۵ء میں ایک کتاب شائع کرائی۔ تلاش حقیقت نام کی یہ کتاب نیم افسانوی نوعیت کی تھی جس کے لئے مصنف کو دو سو روپے کا سرکاری انعام بھی دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایس ایس نشاط ادارت کے فرائض سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اردو

میں کہانیاں بھی تحریر کرتے رہے جو رنبیر اور رتن میں نمایاں طور شائع ہوتی رہیں۔

اس طرح یہ بات واضح طور سامنے آجاتی ہے کہ اس ابتدائی دور ہی سے جموں کے سخن شناسوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ایک ناقابل فراموش رول ادا کیا۔ اس تخلیقی فکر کے بعض روشن چراغوں سے ہم یہ چند ابواب منور کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ تاہم ہمیں اس بار بھی کسی حتمی اور مکمل کام کا دعویٰ نہیں۔ جموں خطے کے بعض باکمال نثر نگاروں کا تخلیقی سفر ابھی جاری و ساری ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ ان نثری شہ پاروں کے تذکرے کے لئے ہمیں اس تحقیقی پروجیکٹ کے اگلے پڑاؤ تک انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔ اس ناتمامی سے قطع نظر آئیے دیکھیں کی جموں کے نثر نگاروں نے مختلف ادوار کے دوران اپنی تحریروں میں اپنی روح کی ساری توانائیاں کس طرح انڈیل کے رکھ دیتے ہیں۔

ہم آپ کے مفید اور معقول مشوروں کے منتظر رہیں گے کیونکہ آپ کی قیمتی آرا سے آگہی حاصل کرنے کے بعد ہی تحقیق کی نئ منزل زیادہ مستحکم اور مضبوط ثابت ہو سکے گی۔

جان محمد آزاد

---

1 آٹھ صفحات پر مشتمل یہ ہفت روزہ اردو میں شائع ہوتا تھا البتہ اس کا ایک کالم ہندی رسم الخط میں بھی ہوتا تھا۔

2 اس دارالترجمہ کی باقیات کا سیر حاصل جائزہ نامور محقق عبدالقادر سروری نے لیا

تھا۔ اس موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ ''ترجمہ کا فن اور روایت'' نام کی کتاب میں شائع بھی ہوا ہے۔

3 حبیب کیفوی اپنی تصنیف ''کشمیر میں اردو'' میں اس اہم انکشاف کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صاحبزادہ حسن شاہ کے ہمراہ ڈاکٹر کرن سنگھ نے اس گنجینۂ ادب کا جائزہ لیا تھا۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

لالہ ملک راج صراف

لالہ مُلک راج صراف ۸/اپریل ۱۸۹۴ءکوسانبہ جموں میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے پتا دیا رام صراف کی چوتھی اولاد تھے۔ آپ نے پرنس آف ویلز کالج جموں اور لا کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ لالہ لاچپت رائے نے ان ہی دنوں امریکہ سے واپس آ کر لاہور سے اردو روزنامہ بندے ماترم جاری کیا۔ ملک راج صراف اس اہم اخبار میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ صحافت کی مبادیات سے ان کی آگہی کی ابتدا دراصل وہیں سے شروع ہوئی لیکن انہیں جموں و کشمیر کے عوام کی بے چارگی بار بار تڑپاتی تھی جس کی وسیع عریض سرزمین بظاہر ایک اخبار کی بھی متحمل نہیں تھی۔ اس خیال نے انہیں اس قدر متحرک کیا کہ آپ بندے ماترم، کو خیر باد کہہ کر جموں آ گئے، اور وہاں اپنے بعض رفقاء سے مشورہ کے بعد آپ نے اخبار جاری کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ پیہم کاوشوں کے بعد بالآخر ۲۴/جون ۱۹۲۴ءکو آپ نے اپنے ہفت روزہ کو جاری کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح ریاست کا پہلا اخبار ''رنبیر'' عوام کے ہاتھوں میں پہنچا۔

رنبیر کے منظر عام پر آتے ہی مقامی ادیبوں اور شاعروں کو تشہیر و ترغیب کا

ایک ایسا وسیلہ مل گیا جس کی کمی وہ ایک عرصہ سے محسوس کرتے آرہے تھے۔ رنبیر اب محض ایک اخبار نہیں رہا اس نے بتدریج ایک ادبی دبستان کا درجہ حاصل کرلیا۔ چنانچہ اخبار میں خبروں کے علاوہ تبصرے، کہانیاں، مضامین اور نظمیں وغیرہ بھی پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ اس کے لکھنے والوں میں لالہ ہنسراج مہاجن، پریم ناتھ پردیسی، سید نسیم، قیس شیروانی، ارجن دیو عرش، غلام حیدر خان چستی، مرزا مبارک بیگ اور ٹھاکر کاہن سنگھ وغیرہ شامل رہے۔ گویا رنبیر کے صفحات پر مقامی ادیبوں کی ایک پوری نسل پروان چڑھی۔ ۱۹۳۴ء میں آپ نے بچوں کا ایک رسالہ رتن جاری کیا۔ یہ قابل ذکر اور پُر وقار ماہنامہ اردو ادب کی حسین تخلیقات سے سج سنور کر زیور طباعت سے آراستہ ہوتا۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ مضامین کے تنوع اور ترتیب کے لحاظ سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر چکا تھا۔ بچوں کی ذہنی سطح کے ادبی مضامین کے علاوہ اس رسالے میں نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ پھر ۱۹۴۵ء کے آس پاس اس رسالے کی مقبولیت اتنی زیادہ بڑھی کہ اس کی اشاعت ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس زمانے کے لحاظ سے ایک زبردست سرکولیشن قرار دی جاسکتی ہے۔ اب قلمی معاونین میں مہجور رسا جاودانی، خوشی محمد طالب، عشرت کاشمیری، نشاط کشتواڑی مرزا عارف بیگ اور محمد عمر نور الٰہی جیسے لوگوں کے اسمائے گرامی بھی شامل ہوگئے تھے۔ کرشن چندر رنبیر سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان دنوں میں پونچھ کی دلفریب وادی میں بیٹھ کر رنبیر، مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اور اس بات کا اعتراف کرتے کرنے میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ کرشن چندر کے اندر کے مصنف کو بیدار کرنے میں رنبیر نے اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

کرشن چندر خود کو ہمیشہ رنبیر پریوار کا ایک رکن تصور کرتے تھے 2۔ ملک راج صراف نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور منجھے ہوئے ادیبوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ آپ نے صاحبزادہ محمد عمر نوار الٰہی کو ادبی سیکشن کا انچارج مقرر کیا۔ وہ اس زمانے میں علامہ ڈرامی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ آپ نے تین مختلف، باب ادب، ادبیات اور تنقید کے تحت مضامین کے سلسلے شروع کئے تھے۔

۱۹۷۹ء میں آپ دو ہفتوں کے لئے پاکستان گئے۔ واپسی پر آپ نے ''میری پاکستان یاترا'' کے عنوان سے ایک دیدہ زیب کتاب تحریر کی۔ یہ کتاب راج محل پبلیکیشنز جموں کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ مولانا عبدالرحمان اس کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

> ''میری پاکستان یاترا'' میں انسانیت کے دل کی دھڑکنیں ہیں، جذبات کا زیر و بم ہے۔ محبت کی گرمی، خوشی کا انبساط اور دبی دبی سسکیاں بھی ہیں۔ اس میں واقعات کی عکاسی سفر کے مشاہدات، رفتار ترقی اور عوام کی پرچھائیوں کی جھلکیاں اور شخصیات کا تذکرہ ہے''۔

اس سے قبل ۱۹۴۶ء میں آپ نے جموں وکشمیر سے متعلق عام معلومات پر مشتمل ایک کتاب اردو زبان میں شائع کرائی تھی۔ جس میں ریاست کی مختصر تاریخ اس کا جغرافیہ اور دیگر تفصیلات عام فہم زبان میں تحریر کی گئی تھیں۔ صحافت اور ادب کے حوالے سے آپ کی خدمات بلاشبہ نا قابل فراموش ہیں۔

---

1 رتن، کے پہلے شمارے کو دیکھ کر علامہ کیفی وتاتریہ نے لالہ جی سے کہا تھا سبحان اللہ! کتنا

دیدہ زیب رسالہ ہے۔ حیران ہو کہ آپ کے نقش اول ''رنبیر'' اور نقش ثانی ''رتن'' میں سے کس کو کس پر ترجیح دوں۔

2 ملک راج صراف ظفر احمد کے ساتھ اپنی ملاقات (تعمیر اردو ادب نمبر) میں اس سلسلے کی تفصیلات دیتے ہوئے بتاتے ہیں ''مجھے صدر جمہوریہ کی جانب سے پدم شری کا ایوارڈ ملنے پر ممبئی میں مبارکبادی کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں کرشن چندر نے کہا'' صراف ہو کر آپ نے کبھی سونے چاندی کی پروا نہیں کی۔ آپ ہمیشہ اس سونے کے قائل رہے جو الفاظ میں چمکتا ہے۔(ج۔م۔ا)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

صاحبزادہ محمد عمر

صاحبزادہ محمد عمر جموں وکشمیر کے ایک علمی وادبی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جموں کے باشندے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جموں کے سری رنبیر اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ علم کے حصول کی جستجو اور تڑپ بچپن اور لڑکپن سے ہی تھی۔ ظہور الدین صاحب اس سلسلے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''صاحبزادہ محمد عمر کے وجود میں اس چنگاری نے بچپن میں ہی سلگنا شروع کردیا جس نے بعد میں شعلہ جوالا کی شکل اختیار کر کے ان کے ادبی ذوق وشوق کے لئے مہمیز کا کام انجام دیا۔ یہ چنگاری ان تھیٹریکل کمپنیوں نے بھڑکائی جو جموں میں ڈرامے دکھانے کے لئے اکثر آیا کرتی تھیں۔ اکبر اعظم، نامی کھیل دیکھتے ہی ننھے محمد عمر کے وجود میں ایک آگ سی ڈہک اٹھی۔ ڈرامے دیکھنے کا ایسا چسکہ لگا کہ بچپن میں ہی عینک لگ گئی۔ عینک بنوانے لاہور گئے تو وہاں نور الٰہی سے ملاقات ہوئی''

یہ وہی نور الٰہی ہیں جو بعد میں آپ کے نام کا اٹوٹ حصہ بن گیا۔ دونوں میں برسوں کی آشنائی سے ایسی دوستی ہوگئی کہ ایک جان دو قالب ہو کر رہ گئے دونوں

کے اسمائے گرامی اس قدر لازم وملزوم ہو گئے کہ اکثر لوگ نورالٰہی محمد عمر کو ایک ہی نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاحبزادہ نے ۱۹۰۸ء کے آس پاس جموں وکشمیر ہائی کورٹ میں بطور مترجم ملازمت اختیار کی۔ ایک مترجم کی حیثیت سے آپ برسوں ریاضت اور مہارت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ آپ نے اپنے علمی اثاثوں میں بے حد وسعت پیدا کی چنانچہ پرتاپ کوڈ اور بعض دیگر قانونی دستاویزوں کا سہل اور سلیس اردو ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے مغربی ادب کے شاہکاروں کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ آپ کے تحریر کردہ بیشتر ڈرامے یا تو انگریزی و دیگر یورپی زبانوں کے تراجم ہیں یا پھر ان کا مرکزی خیال ان ڈراموں سے ماخوذ ہے۔ لیکن صاحبزادہ محمد عمر جیسے تخلیقی مترجم کی عرق ریزی کا کمال یہ ہے کہ یہ ترجمے کم اور طبع زاد زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ روح سیاست، جان ظرافت، بگڑے دل، قزاق اور خواب پریشان ایسے بعض ترجمے ہیں جن کی مقبولیت کی گونج سارے برصغیر میں سنائی دی۔ اس فنی معراج کا اعتراف اور لوگوں کے علاوہ خود شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی شخصیات نے تحریری طور کیا۔ آپ نے سٹیج کے لئے طبع زاد ڈرامے بھی لکھے۔ پہلی پیشی، چُپ کی داد اور عشق ناز ایسے ڈراموں کے عنوانات ہیں۔

''ناٹک کتھا'' سنسکرت کے مختلف اہم ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ زبان و انداز بیان کے لحاظ سے علامہ کیفی نے اسے اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب قرار دیا۔ صاحبزادہ محمد عمر نورالٰہی نے سید امانت لکھنوی کی ڈرامائی کاوش ''اندر سبھا'' کو از سر نو ترتیب دیا۔ اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی سے آپ کی خط و

کتابت اس بات کا عندیہ دیتی ہے کہ تحقیق کے تقاضے آپ نے کس قدر مستحسن طریقے سے انجام دئے ہیں۔ اس دوران انجمن ترقی اردو کے رسالے ''اردو'' میں آپ کے تنقیدی مضامین پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ آپ تنقید ڈرامی، کے ادبی نام سے کیا کرتے تھے۔ جبکہ تصنیف وتالیف کا کام ہمیشہ محمد عمر نورالٰہی کے نام سے ہوتا تھا۔ اپنے اور جتل انداز بیان کی وجہ سے آپ کا شمار ملک کے نامور ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا تھا۔ آپ نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ افسانے اس زمانے کے اہم رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اور ان کا موضوع ان ایام کے سلگتے ہوئے سماجی مسائل ہوتا تھا۔ ظہور الدین ایک افسانے ضیا پاش، کا ذکر کرتے ہیں2۔ جس میں مصنف نے بیو پاریوں کی ان چالوں کو عریاں کیا ہے جو وہ ٹیکس سے بچنے کے لئے چلتے ہیں۔ زبان اگر چہ تھوڑی سی قدیم ہے لیکن طنز کی کاٹ نے اسے موثر بنا دیا ہے۔ تین ٹوپیاں، پنجم مدھم اور نواب سراج الدولہ آپ کی بعض دیگر نثری کتابوں کے نام ہیں۔

صاحبزادہ محمد عمر نورالٰہی نے مشترکہ طور پو اردو زبان میں ڈرامہ کی پہلی تاریخ اور تنقید ''ناٹک ساگر'' کے نام سے تصنیف کی جو ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اردو کے ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معرکتہ الآرا تصنیف میں دنیا کے مختلف مما لک میں ڈرامے کی روایت اور اہم ڈرامہ نگاروں کی خدمات کا سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ گو یہ کتاب ڈرامے کی جامع تاریخ نہیں لیکن ہمیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیئے کہ ''ناٹک ساگر'' کا موضوع اس قدر وسعت لئے ہوئے ہے کہ محض ایک نقش اول اس کے ساتھ پورا

انصاف کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق سے نئی منزلیں اجاگر ہوسکتی ہیں تاہم یہ کتاب جموں و کشمیر میں عملی تنقید کا اولین نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔

صاحبزادہ محمد عمر کا انتقال ۳/اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ہوا۔ آپ جج ہو کر ۱۹۳۶ء میں سبکدوش ہوگئے تھے۔ اُسی سال آپ کے یارِ غار منشی نورالٰہی کی وفات ہوئی تھی لیکن رفاقت کا یہ عالم تھا کہ بعد کے دس برسوں میں صاحبزادہ نے جو کچھ لکھا یا شائع کرایا اس پر نورالٰہی کا نام بھی بدستور مصنف یا مولف کے طور پر ان کے نام کے ساتھ شامل رہا۔ اس طرح تادم آخر ہر تحریر محمد عمر نورالٰہی کے مرکب نام کے ساتھ آتی رہی۔ یہ اٹوٹ رشتے اب یادگارِ زمانہ ہوکر رہ گئے ہیں۔

---

1 شخصیات نمبر۴، ہمارا ادب ص ۲۰۵

2 ہمارا ادب ۸۸-۱۹۸۷ء ص ۲۲۲

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

دیوان نرسنگھ داس نرگس

دیوان نرسنگ داس نرگس کا اصلی نام مولا رام کوٹی تھا۔آپ کا جنم ستمبر ۱۹۰۲ء کو سیالکوٹ میں ہوا جہاں سے آپ کے والد دیوان بیلی رام ہجرت اختیار کر کے جموں شہر میں آباد ہوئے۔نرگس نے میٹرک کا امتحان اکبر اسلامیہ ہائی اسکول جموں سے پاس کیا۔اس زمانے میں جموں کے سانبہ علاقے میں رام کوٹ کی ایک دوافتادہ جاگیر ہوا کرتی تھی۔نرگس کلرک کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے اسی جاگیر کے نگران اور مختار مقرر کردئے گئے۔یہاں کے دیہی ماحول میں آپ نے زندگی کے بہترین ماہ وسال گذارے۔دیہی زندگی کے خمیر میں گندھے ہوئے مظلومیت اور گھٹن کے پیکر لوگوں کو دیکھ دیکھ کر نرگس کے اندر چھپا ہوا فن کار بیدار ہوا تھا،اور سولہ طویل برسوں کے بعد جاگیر کی ملازمت سے مستعفی ہوکر واپس جموں چلے آئے۔

جموں سے آپ نے ہفت روزہ چاند جاری کیا۔بادلوں سے چاند کے نکلتے ہی جموں وکشمیر میں ادبی صحافت کو ایک نیا موڑ ملا۔آپ نے چاند میں مولا رام کوٹی اور پریم منوہر کے نام سے مضامین کے علاوہ مختصر افسانے بھی لکھنے شروع کردئے۔

آپ کو اس زمانے کے بہترین قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا۔ نتیجے کے طور پر چاند نے ادب کے میدان میں کئی معرکے انجام دئے۔ یہ اخبار محنت کش طبقے کی ترجمانی کرتا رہا اور نہایت باقاعدگی اور کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔ صحافت کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے آپ نے بعض کہنہ مشق صحافیوں کی مشاورت حاصل کی۔ اس سلسلے میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں1۔

''بچپن سے مجھے شعر وشاعری کا شوق تھا۔ افسانے بھی لکھتا تھا اور انہیں لاہور کے سربرآوردہ ادبی رسائل میں بھیجتا تھا۔ جب شائع ہوتے تو خوش ہوتا۔ لیکن اخبار نویسی اور افسانہ نگاری میں کافی فرق ہے۔ ایک اخبار نویس اچھا افسانہ نگار نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ایک افسانہ نگار کامیاب اخبار نویس نہیں کہلا سکتا''۔

اس دوران آپ کی طویل کہانیاں اور ناول ''چاند'' میں قسط وار شائع ہوتے رہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں کا موضوع گم گشتہ خوابیدہ دیہات میں بے بس اور مظلوم لوگوں کا افلاس اور ان کی جہالت ہے۔ ان کہانیوں میں جگہ جگہ ڈوگرہ ثقافت کے نقش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ آپ کی کہانیوں کے اکثر کردار مظلومیت، اندھ وشواس اور قناعت کے پیکر ہیں۔ جبریت اور استحصال کے شکار ان بے زبان کرداروں سے متعارف ہوتے ہی منشی پریم چند کے ناولوں کی یاد آتی ہے۔ مثلاً پاربتی نام کے ناول کا مزاج منشی پریم چند کے فن سے ہو بہو مطابقت رکھتا ہے اور غالباً اس کے تتبع میں تحریر کیا گیا ہے۔ پاربتی کے کردار پر منشی پریم چند کی ''بیوہ'' کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ ناول آپ کے اپنے چاند پریس سے ۱۹۶۲ء میں شائع کرایا گیا۔

اس سے قبل جانکی اور نرملا نام کے دوناول اسی پریس سے شائع کیے گئے تھے۔ یہ مظلوم اور صابر دیہی خواتین کی تصویریں ہیں جو اپنی پسپائی کے باوجود سماج کی سنگین چٹانوں سے ٹکر لینے کا عزم رکھتی ہیں۔ آپ کے جو افسانے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے تھے انہیں دکھیا پردیسی پریتم اور سندلیہ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کرایا گیا۔

ممولا رام، پریم منوہر، نرگس اس ہمہ پہلو شخصیت کے مختلف زاوئے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ''رئیس التحریر'' کے لقب کا اضافہ بھی کرتے تھے لیکن آپ کی شخصیت کا جو پہلو یادگار ہو کر رہ گیا ہے وہ ایک مورخ کا ہے۔ رام کوٹ اور ان کے آس پاس کے نظر انداز شدہ علاقوں میں اپنے طویل قیام کے دوران ہی آپ نے سرزمین جموں کی عظمت کو اجاگر کرنے کا عزم کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی دیگر سرگرمیوں سے قطع نظر تاریخ نویس کا کام ۱۹۵۶ء میں شروع کیا۔ گیارہ برسوں کی صحرا نوردی کے بعد ''تاریخ ڈوگرہ دیس'' کی حیثیت ایک نخلستان کی سی تھی۔ ساڑھے گیارہ سو صفحات کی یہ ضخیم داستان جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ کتاب میں ڈوگرہ علاقے کی مختلف ریاستوں کی تاریخ نہایت محنت سے پہلی بار سمیٹی گئی ہے۔ کتاب کے تعارف سے ایک اقتباس2:

''ایڈورڈ گبن کی طرح نرگس نے بھی ماضی کے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر اہل علم کو وہ گہر پارے پیش کیے ہیں جن سے موجودہ یگ کا مورخ قطعی طور پر نا آشنا تھا۔ ڈوگرہ بھومی یقیناً نرگس کے

اس احسان کو فراموش نہیں کر سکے گی۔ نرگس کو اس تاریخی کاوش کے لئے صدیوں یاد کیا جائے گا"۔

علمی بصیرت کا یہ پیکر ایک بھرپور ادبی زندگی گزارنے کے بعد ۱۷ ر نومبر ۱۹۷۳ء کو راہی ملک عدم ہوا۔

بقا کب صاحبِ تصویر کو ہے۔

---

1 بدیو پرشاد شرما: ہمارا ادب: شخصیات نمبر ۳: صفحہ ۲۴۳

2 تاریخ ڈوگرہ دیس، تعارف صفحہ ۲۴۴

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت کی ولادت ۱۹۰۲ء میں بارہمولہ قصبے کے مضافات میں ہوئی۔ آپ کے والد شیخ بدرالدین ۱ نے تبت کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر وہاں سے ہجرت اختیار کرلی تھی۔ حسرت کا لڑکپن بارہمولہ کے آس پاس کے سر بفلک پہاڑوں میں گزرا یہاں آپ اپنے نانا منشی حسن خان کی نگہداشت میں پروان چڑھے۔ لیکن بھر حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ منشی حسن نے اس علاقے کو خیر باد کہا اور سارے افراد خانہ کو لے کر پونچھ مں آ کر بس گئے

پونچھ کی سحر انگیز سرزمین انیسوی صدی کے اختتام سے ہی ایک اہم علمی و ادبی مرکز کی حیثیت سے ابھری تھی۔ حسرت کے نانا کے گھر میں بھی ادبی محفلوں کا اہتمام رہتا تھا۔ ان ادبی محفلوں میں اس زمانے کی اہم ادبی شخصیات شامل ہوتی تھیں۔ چنانچہ نشت و برخاست کی اس سعادت نے چراغ حسن حسرتؔ کے اندر پنہاں صلاحیتوں کو اجاگر کیا اور وہ شعر و ادب کی طرف مائل ہوئے۔

چراغ حسن حسرتؔ کی ہمہ جہت ادبی شخصیت جب اپنے فنی شباب پر تھی تو کرشن چندر جیسے ادیب ابھی اپنے ادبی سفر کے پہلے پڑاو پر تھے۔ کرشن چندر

حسرت سے کس درجہ متاثر تھے اس کا اندازہ کرشن چندر کے لکھے ہوئے اس تعارف سے ہوسکتا ہے2۔

"...... نام چراغ حسن حسرت لیکن احباب پیار سے "لیمپ حسرت" کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ محفل چاہے کتنی بھی سونی اور ویران کیوں نہ ہو یہ اپنی شگفتہ مزاجی خوش کلامی اور بذلہ سنجی سے اس میں اجالا کر دیتے ہیں۔ اصلی وطن کشمیر ہے لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے ہندوستان کے اصلی باشندوں میں شمار ہوتے ہیں ان کے تن وتوش کو دیکھ کر شاعر لوگ انہیں پہلوان سمجھ لیتے ہیں اور پہلوان لوگ شاعر اور حقیقت میں یہ دونوں سچے ہیں...... حسرت کے مزاج میں تلون ہے۔ ہمیشہ ایک اخبار میں کام نہیں کر سکتے ایک مکان میں نہیں رہ سکتے۔ ایک شہر میں نہیں ٹھہر سکتے۔ لیکن اپنی صحافتی زندگی میں اپنے ضمیر کو دبانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اپنی انفرادیت کے پجاری نہیں اور جو کوئی انفرادیت کے راستے میں حائل ہو وہ اسے قطعاً اچھا نہیں سمجھتے"!

مولانا ظفر علی خان نے حسرت کو صحافتی آداب سے آگہی دلائی چنانچہ "زمیندار" کے معیاری صفحات پر حسرت کی صحافتی نگارشات ایک ابھرتے صحافی کی ریاضت کا اندازہ دلا سکتی ہیں۔ بعد میں آپ کئی اور اخباروں سے وابستہ ہوئے لیکن روزنامہ "احسان" میں سندباد جہازی کے نام سے آپ جو مزاحیہ کالم لکھتے تھے اس میں صحافت اور ادب کی سرحدیں کہیں کہیں پگھلتی نظر آتی ہیں۔

مولانا نے صحافت کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف سخن میں بھی نمایاں کام کیا۔

چنانچہ شاعری، افسانہ اور دینیات ایسے اہم شعبے ہیں۔ جموں وکشمیر میں افسانوی ادب کو فروغ دینے میں آپ کی گرانقدر عطا ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ یہ تحریریں آپ کے شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے بے حد مقبول رہیں۔ مولانا اپنی پاکیزگی اور زبان کی شگفتگی کے لئے ویسے بھی نہایت معروف تھے3۔ وہ خصوصی مقالہ نگاری میں منفرد، مزاحیہ کالم نویسی میں لاجواب، ترجمے میں طاق، شعروسخن میں ماہر اور محاورہ زبان کی پابندی میں قدامت پرست تھے۔ کیلے کا چھلکا کے علاوہ جدید جغرافیہ پنجاب، ہردم، دیدہ، پربت کی بیٹی بغاوت، عرب اور کرنل لارنس کشمیر آپ کی دیگر تصنیفات ہیں۔ آپ کے قلم نے گلشن اردو میں ایسے گل ہائے رنگارنگ کھلائے جن سے دبستان ادب تاابد مہکتے رہیں گے!

---

1 خوش دیو مینی لکھتے ہیں کہ آپ کے والد کا اصلی نام لالہ کشمیر چند کپور تھا لیکن وہ عہد شباب میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا اسلامی نام شیخ بدرالدین رکھ کر تحصیل بارہمولہ کے گاؤں بمیار آ گئے۔ یہاں انہوں نے جاگیر کٹھالی کے منشی حسن علی خان کی صاحبزادی سے شادی کی۔ منشی صاحب نے پونچھ منتقل ہو کر وہاں اپنی خاندانی ادب نوازی کی روایت کو برقرار رکھا۔

2 کرشن چندر کا تعلق بھی پونچھ سے رہا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء تک کا دور پونچھ میں اردو ادب کا سنہری دور کہلاتا ہے چنانچہ بزم ادب کی نشستوں میں کرشن چندر حسرتؔ کو غور سے سنا کرتے تھے اور پھر انہوں نے یہ خاکہ تحریر کیا۔ یہ خاکہ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا۔ بعد

میں یہ آج کل (دہلی) کے ستمبر ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں بھی شایع کیا گیا تھا۔

3 ہفت روزہ ''صادق'' حسرت نمبر، میر پور ۲۹ جون ۱۹۶۴ء، خوش دیو مینی کے بقول حسرت کے نانا کے بھائی سراج الحسن پونچھ سے ''صادق'' نام کا اخبار نکالا کرتے تھے۔اس کے حسرت نمبر میں صلاح الدین احمد نے آپ کی نگارشات کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے محمد احمد اندرابی سابق ایڈیٹر شیرازہ کا کہنا ہے کہ حسرت کے اکلوتے بیٹے ظہیر نے کوٹلی میں اپنے والد کے نام پر ایک اکیڈیمی قائم کی ہے۔ایک کالج بھی وہاں حسرت کے نام سے منسوب ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

حبیب کیفوی

حبیب کیفوی ۱۹۱۰ء میں خطہ جموں مین پیدا ہوئے۔ نامساعد گھریلو حالات کی وجہ سے اگر چہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے لیکن علامہ کیفی کے سامنے زانوے تلمذتہہ کیا اور ان کے ہاں شعروسخن کی محفلوں میں پابندی سے شامل ہوتے رہے۔ یہاں منشی سراج الدین چودھری خوشی محمد ناظرؔ اور صاحبزادہ محمد عمر جیسے اہل ذوق موجود ہوتے تھے۔ جن کی نوازشوں نے نوآموز حبیب اللہ کے ذوق سلیم کی کچھ ایسی تہذیب کی کہ وہ کچھ ہی برسوں میں حبیب کیفوی کے نام سے پہچانے جانے لگے[1]۔ ۱۹۵۶ء میں اپنے شعری مجموعے آتش چنار کی اشاعت کے بعد صاجبزادہ محمد عمر نے حبیب کیفوی کے ادبی میلان کونثری صنف کی طرف مائل کیا۔ ان کے بعض ابتدائی مضامین جموں سے شائع ہونے والے اخبار ''امر'' میں شائع ہوتے رہے[2]۔ نثر ہو یا نظم آپ کی ہر تخلیق سے کشمیریات کی مہک آتی تھی۔

حبیب کیفوی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین اردو کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ زبان وبیان کا یہ ڈھلا ڈھلا انداز نہایت شیریں اور شگفتہ تھا۔ آپ نے ڈراموں اور فیچر نویسی کی طرف بھی توجہ کی اور ان شعبوں میں نمایاں

کارنامے انجام دئے۔ لیکن آپ کا جو کارنامہ ایک لازوال سوغات رکھتا ہے۔ وہ ان کی تصنیف ''کشمیر میں اردو'' ہے۔ آپ کا یہ عظیم تحقیقی پروجیکٹ پہلی بار اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام مرکزی اردو بورڈ لاہور نے کیا تھا۔ ۵۶۶ صفحات پر پھیلی یہ ضخیم کتاب جموں وکشمیر میں اردو شعر وادب کے ارتقاء کا سیر حاصل جائزہ بھی لیتی ہے اور ان حالات و واقعات پر بھی کما حقہ روشنی ڈالتی ہے۔ جن کی وجہ سے یہ کشمیر میں فارسی زبان کی وارث قرار دی گئی۔

اس تحقیقی کارنامے کی تحریر اور ترتیب بے پناہ عرق ریزی کی متقاضی تھی۔ انہیں متعلقہ مواد حاصل کرنے اور اس کی شیرازہ بندی کرنے کے دوران سینکڑوں رسالوں اور کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ پھر ان معلومات کی چھان بین اور انہیں Update کرنے کا صبر آزما عمل ایک جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا لیکن فاضل مصنف نے نہایت عزم سے تمام مشکلات پر قابو پالیا انہوں نے کشمیر میں اردو کے موضوع پر بکھرے ہوئے اوراق کی نہایت جانفشانی سے شیرازہ بندی کی اور اس طرح کشمیر میں اردو کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا۔ یہ کتاب جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے گم گشتہ ابواب کی بازیافت ہی نہیں رہی بلکہ اس میں یہاں کے ادبی اور ثقافتی لیل ونہار کا ہو بہو ویژول Visual عکس بھی ابھر کر سامنے آیا۔ مثلاً جھیل ڈل میں تیرتا مشاعرہ، کے عنوان سے جس دلچسپ عکس بندی کا اظہار کیا گیا ہے یہاں اس سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے2۔

''پروگرام کے مطابق یہ مشاعرہ گیارہ جولائی ۱۹۳۹ء کو جھیل ڈل کے سینے پر تیرتے ہوئے شکاروں میں منعقد ہوا۔ شاعروں اور سخن فہموں کا یہ

قافلہ جو میاں بشیر احمد، منشی سراج الدین، محمود علی خان، اثر صہبائی، وشوا ناتھ در ماہ، ملک مقبول احمد اور قیس شیروانی جیسے ادب دوست حضرات پر مشتمل تھا۔ سات بجے سجے سجائے شکاروں میں ڈل کی سیمیں سطح پر روانہ ہوا۔ ہانجیوں نے شکاروں کو کچھ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ شکاروں کا حلقہ سا بن گیا تھا۔ شعراء کے لئے شرط رکھی گئی تھی کہ وہ ترنم سے اپنا کلام سنائیں گے۔ بیشتر شاعروں کے ترنم واجبی تھے لیکن بعض نے اتنی سریلی آواز سے غزل سرائی کی کہ سب جھومنے لگے۔ منزل چار چناری تھی......"

اردو میں اپنی نوعیت کی اس پہلی کتاب کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک ارمغان قرار دیا ہے 3۔ ان کے پیش لفظ سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"کشمیر میں اردو کی یہ کہانی جو حبیب کیفوی صاحب نے بڑی تحقیق اور دیدہ ریزی سے مرتب کی ہے اہل علم کے لئے ایک ارمغان کا درجہ رکھتی ہے۔ میں اسے گنج شائگاں بھی کہہ سکتا ہوں اور سرمۂ دیدۂ اہل بصیرت بھی۔ کشمیر کے مناظر کی دل فریبی و جاذبیت سے لطف اندوز ہونے کے لئے لوگ یہاں آتے ہیں۔ لیکن برصغیر کے علمی و ادبی طبقوں کے لئے یہ سرزمین ایک زیارت کدہ بن گئی۔ چنانچہ ان کی موجودگی سے یہ سرزمین دارالشعراء بن جاتی رہی۔ کیفوی صاحب نے اپنے خاص رنگ تحریر کے ذریعہ کئی یادگار مشاعروں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ میرے خیال میں اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی......"

جموں و کشمیر کی یہ توانا تخلیقی شخصیت تحقیق کے جواہر پارے سمیٹ کر ۱۹۹۱ء

میں ابدی نیند سوگئی لیکن اس نے اردو کے دبستان میں جو گل ہائے رنگارنگ کھلائے ان کی مہک علمی وادبی محفلوں کو سالہا سال تک مہکاتی رہے گی۔

---

1 پنڈت برج موہن وتاتریہ کیفی دہلوی کشمیری الاصل تھے۔آپ ۱۸۶۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کا شماران یادگار بزرگوں میں ہوتا ہے جن کی شخصیت عمدہ صفات کا مجموعہ تھی۔قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ آپ نے نثر میں بھی اپنی ذات کا اظہار کیا۔آپ کی نثری تصانیف میں راج دلاری، مراری پریم دیوی، منشورات اور کیفیہ ہیں۔۱۹۳۴ء میں آپ ریاست کے فارین سکرٹری مقرر ہوئے۔حبیب کیفوی کی کنیت یعنی کیفوی بھی دراصل علامہ کیفی کی قربت کا نتیجہ قرار دی جاتی ہے۔

2 کشمیر میں اردو، صفحہ ۷۵

3 کشمیر میں اردو، پیش لفظ (م)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب ۱۹۱۷ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار عبداللہ صاحب جموں کی ایک ممتاز علمی شخصیت کی حیثیت سے جاتے جاتے تھے۔ آپ نے اپنی ذہانت سے ترقی کے منازل طے کئے اور گلگت میں اٹھارہ بیس برس گزارنے کے بعد کشمیر راج کی طرف سے وہاں کے گورنر بن گئے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران شہاب نے عالمی مقابلے کے لئے ایک مضمون لکھا جو اول قرار دیا گیا۔ جموں وکشمیر کے کسی طالب علم کے لئے یہ ایک زبردست اعزاز تھا۔ خود ریاست کے مہاراجہ ہری سنگھ کے دل میں اس امتیاز حاصل کرنے والے طالب علم سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ بی اے کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد آپ نے آئی سی ایس کا مقابلہ بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔

آپ کا طویل افسانہ ''یا خدا'' سب سے پہلے نیا دور کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد احباب کے اصرار پر اسے ناولٹ کے طور پر کراچی سے جون ۱۹۴۸ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے کتابی صورت میں شائع ہوتے ہی ترقی پسند

مصنفین کی صفوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مُلا علی بخش کی کہانی ہے۔ جو ۱۹۴۷ء کے خون آشام ایام کے دوران امرتسر میں ہلاک کیئے گئے ان کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ اس کی معصوم اور حسین نوجوان لڑکی دلشاد خالصوں کی رکھیل بن گئی۔ جب خالصوں کا دل اور دل شاد کا ''پیٹ'' بھر گیا تو اس لٹی ہوئی عورت کو لاہور پہنچا دیا گیا۔ لیکن اس شہر پناہ میں بھی جوان ماں اپنے بیمار بچے کو لے کر لٹتی رہی ٹپتی رہی۔ ناقدین نے ''یا خدا'' کو فسادات کے موضوع پر لکھے ہوئے افسانوں کا بادشاہ قرار دیا۔ ''یا خدا'' کا موضوع ایک عالمگیر جذبہ انسانیت ہے۔ اس کی بنیاد سکھ اور مسلم پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم پر ہے۔ قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ مظالم ایک کلمہ گو خاتون پر ٹوٹ رہے ہیں بلکہ دلشاد کا کردار ایک بے بس اور مجبور عورت کی صورت میں ابھرتا ہے جس کے بطن کو خالق کائنات نے اپنے تخلیقی شاہکار کے لئے منتخب کیا تھا۔ دلشاد کا بچہ محض ایک ناجائز اولاد نہیں رہتا بلکہ اُس بربریت کی علامت ہے جب انسان اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے درندہ بن جاتا ہے۔ سو اس لحاظ سے دلشاد، دلشاد کوریا دمینتی بھی ہو سکتی ہے۔

سردار جسونت سنگھ، ایک رات کی بات، جلترنگ، نفسانے اور ماں جی غرض ہر تخلیق میں تیکھے پن کی ایسی نشتریت ہے جو قدرت اللہ شہاب کی انفرادیت اس کی اور جلنٹی کی غماز ہے۔ ان کے کردار خواب و خیال کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ گوشت پوست کے زندہ جاوید کردار ہیں۔ افسانہ نگار ناقابل یقین انداز اور جرات رندانہ سے چہروں کے نقاب الٹتا ہے۔ گھناونے رخ سامنے آتے ہیں قارئین بیزاری کے باوجود شہاب کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ کشمیر کی فردوس بریں وادیوں پہ لکھتے ہوئے

بھی آپ شعریت سے احتراز کرتے ہیں اور اس کے باطن کو تلاش کر کے نہایت خلوص اور بے باکی سے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں۔

جموں وکشمیر کے فن کار اکثر اپنی خداداد صلاحیتوں کی داد وطن سے زیادہ غریب الوطنی میں پاتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے سیلاب نے آب ولر کے نہ جانے کتنے گوہر آب دار بہت دور کے ساحلوں کی طرف پھینک دئے۔ شہابؔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد وہاں کی ادبی فضاؤں میں بدر بن کر چمکتے رہے۔ وہ حکومت پاکستان کے کئی ایک اعلیٰ مناصب پر فائض رہے اور ۱۹۷۵ء کے آس پاس ریٹائر ہوئے۔ اظہر سہیل آپ کا قلمی چہرہ کھینچتے ہوئے یوں لکھتے ہیں 1۔

> ''نستعلیق کتابی چہرے پر نیم منتشر داڑھی بھی بڑھا لی ہے۔ یہ الگ بات کہ صوفیوں کی عادت کے برعکس اب وہ مزید نرم دل مزید آہستہ گو ہو گئے ہیں۔ اتنی عاجزی اور انکساری کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ شخص بہت زبردست اور معر کے کا سرکاری افسر بھی رہا ہوگا۔ وہ ساری عمر اپنے متعلقین اور وابستگان کو حیران کرتے رہے ہیں''۔

کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس دھان پان قامت میں ایسی قیامت کی شخصیت پنہاں ہے۔ قامت مختصر سہی مگر داستان طویل ہے۔ میرا اشارہ ''شہاب نامہ'' کی طرف ہے جسے میں گذشتہ چوتھائی صدی کا ایک ادبی معجزہ تصور کرتا ہوں۔ یہ خودنوشت لگ بھگ تیرہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں نہ جانے کتنی عبرتیں اور قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کی شعاعوں کی روشنی میں ہر شخص اور ادارے کے حقیقی خدوخال ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ کتاب ایک قوم اور ایک ملک کے عروج وزوال

کا آئینہ پیش کرتی ہے۔ یہ سربراہوں کی کج رویوں، اہل سیاست کی ہیرا پھیریوں، نوکرشاہی کی جی حضوریوں اور بیوروکریٹس کی من مانیوں کے علاوہ معاشرے کی بے حسی کی بے لاگ داستان ہے۔اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ پوری لطافت اور کثافت کے ساتھ بیدار ہوگئی ہو۔کبھی ایسا بھی لگتا ہے جیسے کہکشاں کی طرح جگمگ کرتی ہوئی شاہراؤں پر عظیم المرتبت شخصیات کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے سے پھوٹنے لگے ہوں۔قدرت اللہ شہاب کی تحقیق وتحریر کا انداز عالمانہ ہے اور یہ ہر قلب ونظر کو نئی تجلیات سے منور کرنے میں کامیاب ہے۔ شائع ہونے سے قبل یہ کتاب سیارہ ڈائجسٹ، معاصر، دستاویز، نیادور اور تخلیقی ادب جیسے معتبر رسائل میں جزوی طور پیش کی جاتی رہی۔ابوالفضل صدیقی کے الفاظ ہیں۔

> ''قدرت اللہ شہاب کے بیان کا طرز ہم پر کچھ ایسا سحر طاری کر دیتا ہے کہ ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے گلے میں باہیں ڈالے ہمیں اپنی دنیا میں لئے پھر رہا ہے۔ وہی دنیا جہاں تلاش ہے جہاں بے بس ومجبور روح انسانی چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کیا مجھے سچی محبت کبھی نہ مل سکے گی''؟

---

1 نوائے وقت لاہور ۲۹ مارچ ۱۹۸۵ء

2 ''یا خدا'' اور اس کا دیباچہ ''شہاب نامہ'' ص ۳۴۰

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

کرشن چندر

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو وزیر آباد ضلع گوجرنوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ڈاکٹر گوری شنکر کا تقرر بحیثیت میڈیکل آفیسر ریاست جموں وکشمیر علاقہ پونچھ میں ہوا۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۸ء میں اپنی تقرری سے تا اختتام ملازمت پونچھ ہی میں رہے۔ اس طرح کرشن چندر نے ابتدائی تعلیم وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ میں حاصل کی اور یہیں سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ اسکول میں اپنے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام کے عجیب وغریب کردار سے متاثر ہوکر آپ نے ''پروفیسر بلیکی'' کے عنوان سے اپنا پہلا افسانہ تحریر کیا جو اخبار ریاست (دہلی) میں شائع ہوا۔ یہ ایک سحر نگار قلم کار کا نقش اول تھا۔ اس نقش گری کی تحریک پونچھ اور اس کے گرد و پیش کے لازوال حسن نے بخشی، ان ایام کی یادیں تازہ کرتے ہوئے مہندرناتھ یوں رقم طراز ہیں[1]:

''کرشن چندر مجھ سے چھ سال بڑے ہیں۔ بچپن کی یادیں بڑی دھندلی سی ہیں۔ ہمارے والد ریاست بھرت پور کی نوکری چھوڑ کر پونچھ میں بحیثیت ڈاکٹر متعین ہوئے۔ پونچھ اتنا ہی خوب صورت ہے جتنا کہ کشمیر۔ وہی

اونچے اونچے پہاڑ خوب خوب صورت مرغزار اور وادیاں۔ گھنے جنگل ندی کا شفاف یخ بستہ پانی اونچی اونچی پہاڑیوں پر خاموش گہری جھیلیں۔ ٹھنڈے شفاف چشمے چیڑھ اور سرو کے درختوں سے سرسراتی ہوئی ہوا۔ ہم نے سارے پونچھ کا پیدل یا گھوڑوں پر سفر کیا کیونکہ ہر تحصیل میں والد صاحب کو تین چار سال ٹھہرنا پڑتا تھا۔ ہر نئی جگہ والد صاحب کو ایک نیا بنگلہ ملتا اور اس کے ساتھ ایک شاندار باغ۔ دیکھ بھال کے لئے نوکر بھی ملتے۔ ہمارے یہاں سے دوا مفت تقسیم کی جاتی تھی اسلئے جو لوگ دوا لینے آتے تھے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ سبزی پھل دودھ انڈے مرغیاں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں بطور تحفہ پیش کرتے......"

کرشن چندر کا افسانوی فن ابتدا ہی سے متنوع رہا۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد آپ نے کشمیر کے فطری حسن کو اپنے افسانوں کا پس منظر بتایا۔ چنانچہ کشمیر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آپ کے ابتدائی افسانوں میں رقصاں نظر آنے لگا۔ ایک طرف کرشن چندر کا درد آشنا دل غریب کسان کا استحصال برداشت نہیں کر سکا۔ پھر محبت کی ناکامیوں سے اس کا دل دکھتا رہا۔ ادھر اس کی رومانی طبیعت فطری مناظر کے حسن سے مسحور ہوتی رہی۔ طلسم خیال اور نظارے کے عنوان سے اس عہد کے دونوں افسانوی مجموعے اسی رجحان کے غماز ہیں۔ ان میں لازوال حسن سے مرعوب ہو کر نثر میں جو شاعری کی گئی ہے اسے دیکھ کر بڑے بڑے شاعر اپنا منہ دیکھتے رہ گئے۔ کرشن چندر کے پاس حسین الفاظ کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور افسانہ نگار کو ان کے صحیح استعمال کا خوب سلیقہ ہے۔ پھر آپ نے

بعض ایسے افسانے بھی لکھے جن میں نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ کوئی کردار ہے۔ ''دوفرلانگ لمبی سڑک'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ یہاں یہ سڑک ایک انسان کے دل کی طرح بے رحم اور بے حس ہے۔ دراصل کرشن چندر کے فنی سفر کا آغاز اسی سڑک سے ہوا لیکن بظاہر اس معمولی مسافت کے بعد بھی کرشن چندر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل گئے۔ ''برفانی رومانیت'' کے پڑاؤ سر کرنے کے بعد سامراجیت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مجبور اور محکوم لوگوں کی بستی تھی۔

یہاں آ کر افسانہ نگار کو کشمیری کسانوں کی غربت اور مظلومیت کا صحیح احساس ہونے لگا۔ یہ وہ مظلومیت تھی جو ایک عرصہ دراز سے فضاؤں میں کراہ رہی تھی۔ اب کشمیر کا ناتراشیدہ حسن اس کی گلپوش فضائیں اور شہری تہذیب کی بخشی ہوئی ریاکارانہ قدریں بتدریج کرشن چندر کے سامنے ابھرنے لگیں۔ تو اس لحاظ سے کرشن چندر کا دوسرا افسانوی دور ''زندگی کے موڑ پر'' کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں آپ کی تحریروں میں زندگی کا واضح شعور نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کے متعلق کرشن چندر کا یہ خیال توجہ کا مستحق ہے2۔

''زندگی کے موڑ پر'' تین طویل افسانوں پر مشتمل ہے۔ زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام اور بالکونی۔ ان افسانوں کا موضوع انسانی محبت ہے۔ زندگی کے موڑ پر، میرا پہلا طویل مختصر افسانہ ہے اور شاید اب بھی مجھے یہ اپنے تمام افسانوں میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ گرجن کی ایک شام، ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہے جو موجودہ تہذیب کی ایک بہت بڑی نشاط گاہ گلمرگ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے لیکن ان دونوں مقامات میں کس قدر

اونچے اونچے پہاڑ خوب خوب صورت مرغزار اور وادیاں۔ گھنے جنگل ندی کا شفاف یخ بستہ پانی اونچی اونچی پہاڑیوں پر خاموش گہری جھلیں۔ ٹھنڈے شفاف چشمے چیڑھ اور سرو کے درختوں سے سرسراتی ہوئی ہوا۔ ہم نے سارے پونچھ کا پیدل یا گھوڑوں پر سفر کیا کیونکہ ہر تحصیل میں والد صاحب کو تین چار سال ٹھہرنا پڑتا تھا۔ ہر نئی جگہ والد صاحب کو ایک نیا بنگلہ ملتا اور اس کے ساتھ ایک شاندار باغ۔ دیکھ بھال کے لئے نوکر بھی ملتے۔ ہمارے یہاں سے دوا مفت تقسیم کی جاتی تھی اسلئے جو لوگ دوا لینے آتے تھے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ سبزی پھل دودھ انڈے مرغیاں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں بطور تحفہ پیش کرتے......"

کرشن چندر کا افسانوی فن ابتدا ہی سے متنوع رہا۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد آپ نے کشمیر کے فطری حسن کو اپنے افسانوں کا پس منظر بتایا۔ چنانچہ کشمیر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آپ کے ابتدائی افسانوں میں رقصاں نظر آنے لگا۔ ایک طرف کرشن چندر کا درد آشنا دل غریب کسان کا استحصال برداشت نہیں کر سکا۔ پھر محبت کی ناکامیوں سے اس کا دل دکھتا رہا۔ ادھر اس کی رومانی طبیعت فطری مناظر کے حسن سے مسحور ہوتی رہی۔ طلسم خیال اور نظارے کے عنوان سے اس عہد کے دونوں افسانوی مجموعے اسی رجحان کے غماز ہیں۔ ان میں لازوال حسن سے مرعوب ہو کر نثر میں جو شاعری کی گئی ہے اسے دیکھ کر بڑے بڑے شاعر اپنا منہ دیکھتے رہ گئے۔ کرشن چندر کے پاس حسین الفاظ کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور افسانہ نگار کو ان کے صحیح استعمال کا خوب سلیقہ ہے۔ پھر آپ نے

بعض ایسے افسانے بھی لکھے جن میں نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ کوئی کردار ہے۔
''دوفرلانگ لمبی سڑک'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔ یہاں یہ سڑک ایک انسان کے دل کی طرح بے رحم اور بے حس ہے۔ دراصل کرشن چندر کے فنی سفر کا آغاز اسی سڑک سے ہوا لیکن بظاہر اس معمولی مسافت کے بعد بھی کرشن چندر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل گئے۔ ''برفانی رومانیت'' کے پڑاؤ سر کرنے کے بعد سامراجیت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مجبور اور محکوم لوگوں کی بستی تھی۔

یہاں آ کر افسانہ نگار کو کشمیری کسانوں کی غربت اور مظلومیت کا صحیح احساس ہونے لگا۔ یہ وہ مظلومیت تھی جو ایک عرصہ دراز سے فضاؤں میں کراہ رہی تھی۔ اب کشمیر کا ناتراشیدہ حسن اس کی گلپوش فضائیں اور شہری تہذیب کی بخشی ہوئی ریاکارانہ قدریں بتدریج کرشن چندر کے سامنے ابھرنے لگیں۔ تو اس لحاظ سے کرشن چندر کا دوسرا افسانوی دور ''زندگی کے موڑ پر'' کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں آپ کی تحریروں میں زندگی کا واضح شعور نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کے متعلق کرشن چندر کا یہ خیال توجہ کا مستحق ہے2۔

''زندگی کے موڑ پر'' تین طویل افسانوں پر مشتمل ہے۔ زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام اور بالکونی۔ ان افسانوں کا موضوع انسانی محبت ہے۔ زندگی کے موڑ پر، میرا پہلا طویل مختصر افسانہ ہے اور شاید اب بھی مجھے یہ اپنے تمام افسانوں میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ گرجن کی ایک شام، ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہے جو موجودہ تہذیب کی ایک بہت بڑی نشاط گاہ گلمرگ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے لیکن ان دونوں مقامات میں کس قدر

فرق ہے یہ چند قدم ہیں۔ لیکن ان میں ہزاروں سالوں کا بُعد ہے۔ گر جن کی ایک شام، کو آپ ایک جزیرہ سمجھئے جہاں سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچی۔ ''بالکونی'' میں گلمرگ کے ایک ہوٹل کا ذکر ہے۔ اس ہوٹل کے کمروں اور ان کے بسنے والوں میں آپ اپنی مُلکی زندگی کا حیرت انگیز تنوع دیکھ سکیں گے''۔

ایک ہی مرکزی خیال کو تین مختلف سحر انگیز قالبوں میں ڈھالنا اور اپنی توانا فنی صلاحیتوں سے ان میں زندگی کے رنگ بھر کر انہیں زندہ و جاوید کر دینا۔ یہ صرف کرشن چندر کا کمال ہو سکتا ہے۔ زندگی کے موڑ پر مرد کے مسائل اور اس کی الجھنوں کی ایک نفسیاتی تشریح ہے۔ یہاں ناکامیوں اور محرومیوں کے ماحول سے ابھرنے والے کردار ہیں جو سب کے سب اپنی تمام پیچیدگیوں کے باوجود مکمل ہیں۔ گر جن کی ایک شام میں شہر کی ریاکارانہ زندگی کا مقابلہ گر جن کی سادہ زندگی سے کیا گیا ہے۔ یہ تجزیہ نہایت معقول اور حسین ہے۔ بالکونی کا موضوع زیادہ متنوع ہے۔ یہاں گلمرگ کے فردوس ہوٹل کی بالکونی پیش کی گئی ہے لیکن یہ بالکونی گلمرگ کے سبزہ زاروں کی طرف نہیں کھلتی بلکہ یہ بالکونی ہوٹل کے اندر کی طرف کھلتی ہے۔

شکست، کرشن چندر کا پہلا اور مشہور ناول ہے۔ یہاں بھی وہ فضا آفرینی کے باب میں بہت کامیاب ہیں لیکن وہ صرف خارجی خصوصیات ہی کو پیش نہیں کرتے بلکہ مناظر و ماحول کی روح کو بھی کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ روح فطرت ان کے سامنے بے نقاب نظر آتی ہے۔ شکست اگرچہ ان نئی کیفیتوں، نئی معنویتوں اور نئی تعبیروں کا ترجمان ناول ہے لیکن تبلیغ اور نعرے بازی کے رجحان

نے اسے قدرے نقصان پہنچایا ہے۔ کرشن چندر کی رومانیت اور انقلابیت ان کے ایک اور ناول ''طوفان کی کلیاں'' کو بھی ایک توانا تخلیق بننے سے روکتی ہے۔ نعرہ بازی کے رجحان نے اس ضخیم ناول کو ایک سطحی چیز بنا کے رکھ دیا ہے۔ شکست کا شیام ہو یا ونتی۔ طوفان کی کلیاں کا عبدل ہو یا بانو یہ سبھی کردار بے جا پروپگنڈے کی وجہ سے کھوکھلے اور سطحی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس بات کا عندیہ خود کرشن چندر کے اس پیش لفظ سے بھی ملتا ہے3۔

''ایک عرصے سے ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو کشمیر سے متعلق ہو جن میں اس کی ساری زندگی ساری روح اور سارا عطر کھینچ کے آ جائے۔ ڈوگرہ شاہی سے اب تک جو کچھ اس ملک میں ہوا اور ہو رہا ہے جس طرح اس ملک کے لوگوں نے ان مختلف ادوار میں اپنی زندگی بسر کی ہے محبت کی ہے جدوجہد کی ہے گھر بسائے ہیں مکئی کے بیج بوئے ہیں آنسوؤں کی فصل کاٹی ہے کبھی اپنے لہو سے اپنی امیدوں کو جوان کیا ہے تو کبھی کسی کے بہکاوے سے غلط راستے پر بہہ نکلے ہیں پھر بہتے بہتے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے اور سچے راستے کی تلاش کی ہے......''

''طوفان کی کلیاں'' کا پس منظر بھی کشمیر ہی ہے، کشمیر کا نوجوان کسان ہے مزدور ہے اس کے مسائل ہے اس کی کشمکش ہے۔ نئے اقدار کا تذبذب ہے جو سرمایہ دارانہ نظام پر ایک زناٹے دار تھپڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام پر اس چوٹ اور جاگیردارانہ نظام کا مضحکہ اڑانے کے باوجود کرشن چندر اکثر واعظ اور ناصح بھی بن جاتے ہیں۔ غالباً لاشعوری

طور پر ان کے ذہن میں وہی ہنگامی تحریک اور اس کی تبلیغ کا جذبہ کام کرتا ہوگا اس کے علاوہ مصنف نے اپنے افکار کے ابلاغ میں کسی اصلاحی طرز عمل کو بھی اپنا شعار بنانے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کی اکثر تحریریں جنسی محبت کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ بے باکی اور عریانی کے ان رجحانات میں مبالغہ آمیزی کے عناصر نے ان کی عہد آفریں تحریروں میں تضادات کو بڑھا دیا ہے۔ کہیں کہیں گیارہ گیارہ ہزار فٹ کی بلندیوں پر چناروں کے سائے نظر آتے ہیں۔ کہیں گلمرگ میں جہلم بہتا دکھائی دینے لگتا ہے اور کہیں بقول اختر محی الدین4 نرگس کے پھولوں اور نیلی جھیلوں کے درمیان باہر سے آیا افسانہ نگار جونہی پاوں رکھتا تو سیب جیسے گالوں والی عورت اس کو ٹیلے کے پیچھے ایزار بند کھولے ملتی ہے۔ کشمیر میں ان منفی رجحانات کے خلاف ناراضگی کے جذبات بڑھتے رہے۔ برج پریمی نے بھی اپنے نقد ونظر میں اکثر کرشن چندر کے فن میں اس رجحان کو غیر متوازن قرار دیا ہے لیکن بعض ناقدین لکھتے ہیں کہ گو جنس بھی کرشن چندر کا موضوع ہے مگر اس موضوع پر لکھتے وقت ان کے لہجہ میں لذت اندوزی کی کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی بلکہ پاکیزگی اور تقدس نظر آتا ہے۔ زندگی کے بیکراں حسن کو کرشن چندر نے دیکھا اور اپنے دل میں جگہ دی مگر اس حسن کو خراب کرنے والے عیوب پر ان کی نگاہ بہت گہری پڑتی ہے۔ اس حسن کو مجروح دیکھتے ہی ان کا زخمی دل چیخ اٹھتا ہے اور وہ زندگی کے کئی نادیدہ پہلو بے نقاب کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں5:

''کسی مخصوص علاقے کی زندگی کو ناول کا موضوع بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ ناول نگار اس علاقے کی جغرافیائی، سماجی اور منظری زندگی کے ہو بہو نقشے کھینچے یہ کام دوسرے لوگوں کا ہے ادیب کا نہیں۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کو خارجی زندگی کے حقائق سے میکانکی طور مربوط کرنے کے بجائے اپنے فن کارانہ شعور سے اس کا رشتہ جوڑ دے۔ یہ شعور گردوپیش کی حقیقی زندگی کا پروردہ ہونے کے باوجود، تخلیقی سطح پر اپنے آزاد اور خودمختار وجود پر اصرار کرتا ہے۔ چنانچہ ناول کا موضوع گردوپیش کے حقیقی منظرنامہ کا دست نگر نہیں رہتا۔ وہ فنکار کے شعور سے آب و رنگ حاصل کرتا ہے اور اپنی ایک کائنات بن جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو کرشن چندر کی نگارشات میں کشمیر وادیوں پہاڑوں اور جنگلوں کے پس منظر میں ابھرنے والی تخیلی حقیقت اپنا جواز پیش کرتی ہے اور ان پر بعض لوگوں کی طرف سے ظاہر کردہ کشمیر ناشناسی کا الزام مسترد ہوتا ہے۔''

کرشن چندر کے مجموعی طور بائیس ۲۲ افسانوی مجموعے شایع ہوئے۔ جن میں مندرجہ بالا مجموعوں کے علاوہ طلسم خیال، ٹوٹے ہوئے تارے، ہم وحشی ہیں، اجنتا سے آگے، میں انتظار کروں گا، دل کسی کا دوست نہیں، دسواں پل، نغمے کی موت، پرانے خدا اجنتا سے آگے، ایک گرجا ایک خندق، سمندر دور ہے، نئے غلام، یوکلپٹس کی ڈالی، نئے افسانے، کرشن چندر کے افسانے اور مسکرانے والیاں قابل ذکر ہیں۔ اس ادبی ظفر مندی کے طفیل آپ کا شمار بین الاقوامی ادیبوں میں ہوا۔ آپ کے تیس ۳۰ ناول شائع ہوئے۔ ان ناولوں میں دل کی وادیاں سو گئیں، آسمان روشن

ہے، باون پتے، ایک گدھے کی سرگزشت، ایک عورت ہزار دیوانے، غدار، سڑک واپس جاتی ہے، دادر پل کے بچے، برف کے پھول، میری یادوں کے چنار، گدھے کی واپسی، چاند کے گھاو، ایک گدھا نیفا میں، ہانگ کانگ کی حسینہ، پہلگام کا بدنام، سونے کا سنسار، زرگاوں کی رانی، پانچ لوفر اور ایک وائلین سمندر کے کنارے نمایاں طور شامل ہیں۔ آپ نے رپورتاژ لکھے ہیں، انتظارئے لکھے ہیں، انشائیے لکھے ہیں، بچوں کے لئے کیانیاں لکھی ہیں۔ آپ کا فن اس قدر لامحدود ہے کہ اس کا احاطہ ان مختصر صفحات میں ناممکن ہے۔ آپ اردو کے واحد ادیب ہیں جن کی کہانیوں کے ترجمے باون زبانوں میں کئے جا چکے ہیں۔ تخلیقات کے اس تاج محل سے آپ نے نہ صرف دنیا کے جدید ادب میں قابل قدر اضافے کئے بلکہ اسے ایک مخصوص فکر و جہت عطا کی۔

---

1 مہندر ناتھ کا پہلا افسانہ ''ریاضت'' رسالہ ساقی میں شایع ہوا۔ آپ کے فن کو برصغیر ہند پاک کے لگ بھگ سبھی بڑے رسائل نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مہندر ناتھ کے مجموعی طور نو افسانوی مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ ان میں ''چاندی کے تار'' ''گالی'' ''پاکستان سے ہندوستان تک'' ''مائی ڈارلنگ'' ''یہاں سے وہاں تک'' ''نئی بیماری'' ''جہاں میں رہتا ہوں'' برات اور ''تنہا تنہا'' شامل ہیں۔ آپ نے اپنا ناول ''آدمی اور سکے'' ۱۹۵۱ء میں تحریر کیا۔ ''رات اندھیری ہے'' ''سورج ریت اور گناہ'' ''ایک شمع ہزار پروانے'' ''تیری صورت میری آنکھیں'' ''درد کا رشتہ'' ''زیرو سے ہیرو'' پیار کا موسم پیاسا بادل اور لیڈر مہندر ناتھ کے بعض دیگر اردو ناول ہیں۔ آپ کی نثر میں بے پناہ جاذبیت اور شگفتگی ہے۔

زبان کی لطافت لفظوں کی نشست، موضوع کی تکنیک اور خیال کی ہم آہنگی آپ کے فن کی اہم خصوصیات ہیں۔ شمیم احمد شمیم ایک جگہ آپ کی یاد تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اگر بڑا بھائی زیادہ مقبول ہو تو چھوٹے کو اپنی شہرت اور شخصیت سب کچھ مانگے کا اجالا معلوم ہوتی ہے اور دنیا کو اس کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ مہندر ناتھ کو زندگی بھر کرشن چندر کا بھائی ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ''جہاں میں رہتا ہوں'' غالباً ۱۹۴۵ء میں لکھی گئی لیکن آج برسوں بعد یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کل کی نہیں آج کی کہانی ہے۔ صرف مہندر ناتھ کی نہیں ایک پوری نسل کی کہانی ہے۔!

2 زندگی کے موڑ پر، مکتبہ اردو لاہور، صفحہ ۷

3 طوفان کی کلیاں پیش لفظ ص ۵

4 شیرازہ، سمینار نمبر، صفحہ ۱۱۸

5 وادیاں بلا رہی ہیں۔ پیش لفظ ص ۶

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ٹھاکر پونچھی

ٹھاکر پونچھی کا جنم ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پونچھ کے محلّہ جرنیلاں میں ہوا۔ والد کا نام ٹھاکر بھیم سنگھ تھا جو راجہ سکھ دیو سنگھ کے اے ڈی سی تھے۔ لیکن سکھد یو سنگھ ۱۹۲۶ء میں ہی سور گباش ہوئے۔ اس کے بعد راجہ جگت دیو علاقہ پونچھ کے حکمران بنے۔ یہ زمانہ پونچھ میں اردو ادب کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں یہاں ادب اور ثقافت نے نمایاں پیش رفت حاصل کی۔ اس حوصلہ افزا ماحول نے بعض ایسے ادیب پروان چڑھائے جنہوں نے آگے چل کر ادب اور فن کے مختلف شعبوں میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

پونچھ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ٹھاکر پونچھی مزید تعلیم کے لئے جموں روانہ ہو گئے اور وہاں پرنس آف ویلز کالج میں داخلہ حاصل کیا۔ سنگیت اور ادب دونوں سے فطری وابستگی تھی اس لئے کالج کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ پروفیسر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں کہ ٹھاکر کا پہلا افسانہ ''راجہ'' کالج کے رسالے ''توی'' میں شائع ہوا۔ ادھر بعض دیگر لوگ ''کالکی'' ان کی پہلی کہانی قرار دیتے ہیں جو جموں کے ہفت روزہ چاند، میں

شائع ہوئی 1 خود ٹھاکر پونچھی نے اپنی موت سے دو ایک ہفتے قبل اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا 2:

''ریاست کشمیر کے جاگیر دارانہ ماحول میں پیدا ہوا۔ بچپن اور لڑکپن محلات کی منقش چار دیواری میں گزرا۔ گھناونی اور معصوم زندگی کے قرب نے کہانی کار کی نگاہ بخشی۔ پہلی کہانی ''خانہ بدوش'' اور (اب تک کی) آخری کہانی ''بہت دور جانا ہے......''

گریجویشن کرنے کے بعد ٹھاکر پونچھی خوراک وسپلائیز کے محکمے میں کلرک ہوگئے۔ ۱۹۴۶ء میں رشتہ ازدواج میں بند گئے۔ ۱۹۴۸ء کے دوران ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ جموں میں قلیل وقت تک نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام کیا کیونکہ ایک ڈیڑھ سال میں ہی آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوکر دہلی چلے گئے۔ لیکن یہ ہجرت موسمی پنچھی کو ابتدائی طور کچھ راس نہ آئی۔ اسے رہ رہ کر اپنے وطن اور اس کے گردو پیش کی یاد آ آ کر تڑپاتی رہی۔ یہاں کی جنت بداماں وادیاں اس کی روح کے غاروں میں ہمیشہ مہکتی رہیں۔ آپ ایک مہجور فن کار کا سارا درد اپنے افسانوں میں بکھیرتے رہے۔ آپ کے ادبی سفر کے یہ ابتدائی افسانے جموں وکشمیر کی ساری شادابیت اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ایسے دس افسانوں کا مجموعہ ''زندگی کی دوڑ'' ۱۹۵۹ء کے آس پاس شائع ہوا۔ دیوندر ستھیارتھی اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''ٹھاکر کے بیشتر افسانوں میں بڑی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ افسانے کی ہیئت میں مصنف ایک کہنہ مشق ایکٹر کی طرح اپنی شعوری پختگی سے کام لیتا ہے۔ زبان کا بہاؤ بھی پورے رکھ رکھاو سے آگے بڑھتا ہے۔''

''چناروں کے چاند'' کی کامیاب اشاعت کے بعد ٹھاکر پونچھی کو اردو کے کامیاب اور مقبول ترین افسانہ نگار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب آپ کے افسانے برصغیر کے معتبر رسائل میں نمایاں طور شائع ہونے لگے۔ آپ کو پہاڑی رومانوں کا ترجمان افسانہ نگار پکارا جانے لگا آپ کی ہر تخلیق آپ کی انفرادیت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ان میں آپ کی دیکھی ہوئی سحر انگیز وادیاں تھیں، شناسا طرز زندگی کی حقیقت آمیز تصویریں تھیں، پیاسی روحوں کی ازلی تلاش تھی اور استحصال کی چکی میں پسے ہوئے مظلوم لوگوں کی آہیں تھیں، یہ مرقعے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہیں سجائے گئے تھے۔ ''زندگی کے موڑ پر'' کے عنوان سے آپ کا ایک اور افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔ اس مجموعے کے افسانوں میں موت کے سائے تلے، ڈولک بجتی رہی، اندے کی بیوی، معاوضہ، زعفران وغیرہ شامل ہیں۔ یہ افسانے نہیں بلکہ شہروں سے دور پہاڑوں میں رہنے والے معصوم اور سادہ لوگوں کی دھڑکنیں ہیں۔ حسن اور تاثیر سے بھرپور ایک ایسی ہی کہانی سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے3:

> ''آخری بس کے منتظران دو۲ کلرکوں کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ اتنا ہی پرانا جتنا کہ وہ بس سٹاپ خوب صورت سی معصوم لڑکی موٹی موٹی آنکھیں جن میں سوائے بس کے انتظار کے کسی کی بھی جستجو نہ ہوتی۔ رات کے سیاہ اندھیرے میں لڑکی کی سفید براق ساڑھی کی ٹوٹتی بنتی لہریں اس کے دل کے خاموش کناروں کو چھو چھو جاتی۔ لیکن ایک دوسرے کے چہرے پر انہیں فائلوں کے انبار اور ٹایپ مشین کے بے ترتیب حروف کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا''

ایک اور افسانہ ''موت کی موت'' جو شیرازہ انتخاب نمبر ۷۹۔۱۹۷۸ میں

شایع ہوا تھا، سے اقتباس:

"بلتی یار نے بلتی یار کی لاش کو کمبل میں لپیٹا۔ پانچ روپے کا آخری نوٹ مٹھی میں دبایا اور کفن کا انتظام کرنے چل پڑا۔ پورے دس برس کا ساتھ ختم ہوگیا تھا۔ دس برس کی بچی کھچی ساجھی کمائی بھی ختم ہوگئی تھی۔ اب صرف بلتی یار کی لاش تھی۔ اب اپنے کچے گھروندے سے قبرستان تک کا طویل فاصلہ رات اترنے سے پہلے عبور کرنا تھا۔ ساتھ سب کے سب پہاڑی پرندے تھے۔ جو سردیوں میں پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں سے مرغابیوں کے جھنڈوں کی طرح اترتے آتے اور گرمیوں میں اپنے اپنے گھونسلوں میں لوٹ جاتے لیکن رمضانا اور بلتی یار اپنے اپنے گھونسلے اجاڑ کر وہاں آئے تھے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے......"

کہانی کے کلائیمیکس میں بلتی یار کے لئے کفن نہیں ملتا لیکن ایک امیر اپنے مردہ کتے کو ریشمی کفن میں ملبوس دفنانے کے لئے لئے جارہا ہے۔ یہاں تہذیبی زندگی کا المیہ پوری طرح ابھر کے سامنے آتا ہے۔ حقیقت اور رومانیت کا یہ امتزاج ٹھاکر کے افسانوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ برف کے آنسو، خلش کہاں سے ہوتی، بے خواب کواڑ، غرض ہر تحریر کی اپنی ایک خاص مہک ہے۔ آخرالذکر افسانے کے ساتھ خوشتر گرامی کے نام مکتوب سے ایک حصہ 4:

"......حالات ساتھ نہیں دے رہے۔ من کو کسی کروٹ چین نہیں۔

چھوٹی چھوٹی باتیں پریشان کردیتی ہیں اور آپ ہیں کہ بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرتے بھی کبھی مایوسی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ کاش کہ زندگی کا یہ

انداز ہم بھی پاتے: بہر حال ''بے خواب کواڑ'' کی داستان لایا ہوں۔ وہی
پرانی تنہائیاں اور وہی گھسی پٹی زندگی کے پرانے راستے جن سے میں خود بھی
اکتا گیا ہوں''

افسانہ نگار کی حیثیت سے ٹھاکر پونچھی فن کے ہر معیار پر کھرے اترتے ہیں لیکن ان کی فنی صلاحیتوں اور تخلیقی نزاکتوں کا صحیح اندازہ ان کے ناولوں سے ہی ہوسکتا ہے۔ رات کے گھونگھٹ آپ کا پہلا ناول تھا جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس شایع ہوا۔ یہ ناول شروع سے آخیر تک دلچسپیوں اور دلفریبیوں کا مرقع ہے جس میں نئی تہذیب کے ان فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ ٹھاکر نے اس ناول میں سماج کے حسین چہرے سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ الٹ دئے ہیں۔ ناول کا ہر باب ایک ایسی شوخ رومانی داستان ہے جسے پڑھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ مصنف نے حقائق کو عدیم المثال فن کاری اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، آپ کا دوسرا ناول تھا۔ مسرت انگیز اور صحت مند رومانی تخلیق جس کی ہر سطر سے چاندنی راتوں کی پر بہار فضائیں اور حیات بخش زندگی کی رعنائیاں نغمہ بار ہیں۔ یہ ان مردوں کی کہانی ہے جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ اس تخلیق میں ایک اجڑی ہوئی تہذیب کا سارا دردسمٹ آیا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کا قصہ ہے جس کے ہاتھوں نے عورت کو حسن بخشا اسے خاتون خانہ بنادیا

وادیاں اور ویرانے' ٹھاکر پونچھی کا شاہکار ناول ہے جسے مقتدر ناقدین نے ایک بہترین تہذیبی ناول قرار دیا ہے۔ بنجر بیابانوں اور شاداب پہاڑوں کی یہ ایک

حسین وجمیل کہانی ہے۔ یہاں پونچھ کے حسین پس منظر میں پہاڑی رومان اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ کیرتی، مدن رائے سنگھ، رانی، مادھو، کرما، سیٹھ رادھے شام اور سروپ اس ناول کے اہم کردار ہیں5۔ یہ سب زندہ و جاوید آہنی کردار ہیں یہاں ٹھاکر دکھاتے ہیں کہ خوشحال طبقہ کا نوجوان بے غرض محبت کا متحمل نہیں۔ اس کی روح اور تخیل میں بلندی نہیں۔ ٹھاکر اپنے کرداروں کو انفرادیت دینا خوب جانتے ہیں۔ یہ کردار ہماری اپنی لغزشوں کے پرتو بن کر ابھرتے ہیں۔ اداس تنہائیاں، ہو جب پتھر روتے ہیں یا پیاسے بادل یہ کردار اکثر گھناونے ہوتے ہوئے بھی قابل محبت نظر آتے ہیں۔ مناظر کے بیان میں بھی ان کی حقیقت پسندی نظر آتی ہے، جموں وکشمیر کے لالہ زاروں، پہاڑوں قصبوں اور دیہات کی ایسی رنگین تصویریں دو ایک لوگوں کے بغیر شاید ہی کسی نے کھینچی ہوں۔ اس بیش بہا ادب کو آنے والی نسلیں سالہا سال تک یاد کرتی رہیں گی۔ مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمان ٹھاکر کی ناول نویسی کا جایزہ لیتے ہوئے یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ملک کی تقسیم کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں ان میں وہ جمالیاتی رچاؤ، فنی پختگی نفسیاتی نکتے، اور جذبات کے اتار چڑھاو کہیں نظر نہیں آتے جو مجھے ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ملتے ہیں۔ بلاشبہ جدید دور میں ٹھاکر کے ناولوں نے اردو ادب کی لاج رکھ لی ہے ان کے فن سے ہماری روایتوں کو آگے بڑھنے کا کو موقع ملا ہے اس کی یقیناً ایک تاریخی حیثیت ہوگی''

خود ٹھاکر کے بقول بائیس ۲۲ برس دلی کی گلیوں کی خاک چھان کر وہ دوبارہ پتھروں کے شہر جموں آ گئے۔ آخری ناول ''سورج سمندر میں ڈوبتا ہے'' لکھ

انداز ہم بھی پاتے: بہر حال "بے خواب کواڑ" کی داستان لایا ہوں۔ وہی
پرانی تنہائیاں اور وہی گھسی پٹی زندگی کے پرانے راستے جن سے میں خود بھی
اکتا گیا ہوں"

افسانہ نگار کی حیثیت سے ٹھاکر پونچھی فن کے ہر معیار پر کھرے اترتے ہیں لیکن ان کی فنی صلاحیتوں اور تخلیقی نزاکتوں کا صحیح اندازہ ان کے ناولوں سے ہی ہوسکتا ہے۔ رات کے گھونگھٹ آپ کا پہلا ناول تھا جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس شایع ہوا۔ یہ ناول شروع سے آخیر تک دلچسپیوں اور دلفریبیوں کا مرقع ہے جس میں نئی تہذیب کے ان فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ ٹھاکر نے اس ناول میں سماج کے حسین چہرے سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ الٹ دئے ہیں۔ ناول کا ہر باب ایک ایسی شوخ رومانی داستان ہے جسے پڑھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ مصنف نے حقائق کو عدیم المثال فن کاری اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، آپ کا دوسرا ناول تھا۔ مسرت انگیز اور صحت مند رومانی تخلیق جس کی ہر سطر سے چاندنی راتوں کی پر بہار فضائیں اور حیات بخش زندگی کی رعنائیاں نغمہ بار ہیں۔ یہ ان مردوں کی کہانی ہے جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ اس تخلیق میں ایک اجڑی ہوئی تہذیب کا سارا درر سمٹ آیا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کا قصہ ہے جس کے ہاتھوں نے عورت کو حسن بخشا اسے خاتون خانہ بنادیا

وادیاں اور ویرانے' ٹھاکر پونچھی کا شاہکار ناول ہے جسے مقتدر ناقدین نے ایک بہترین تہذیبی ناول قرار دیا ہے۔ بنجر بیابانوں اور شاداب پہاڑوں کی یہ ایک

حسین و جمیل کہانی ہے۔ یہاں پونچھ کے حسین پس منظر میں پہاڑی رومان اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ کیرتی، مدن رائے سنگھ، رانی، مادھو، کرما، سیٹھ رادھے شام اور سروپ اس ناول کے اہم کردار ہیں5۔ یہ سب زندہ و جاوید آہنی کردار ہیں یہاں ٹھاکر دکھاتے ہیں کہ خوشحال طبقہ کا نوجوان بے غرض محبت کا متحمل نہیں۔ اس کی روح اور تخیل میں بلندی نہیں۔ ٹھاکر اپنے کرداروں کو انفرادیت دینا خوب جانتے ہیں۔ یہ کردار ہماری اپنی لغزشوں کے پرتو بن کر ابھرتے ہیں۔ اداس تنہائیاں، ہو جب پتھر روتے ہیں یا پیاسے بادل یہ کردار اکثر گھناونے ہوتے ہوئے بھی قابل محبت نظر آتے ہیں۔ مناظر کے بیان میں بھی ان کی حقیقت پسندی نظر آتی ہے، جموں و کشمیر کے لالہ زاروں، پہاڑوں قصبوں اور دیہات کی ایسی رنگین تصویریں دو ایک لوگوں کے بغیر شاید ہی کسی نے کھینچی ہوں۔ اس بیش بہا ادب کو آنے والی نسلیں سالہا سال تک یاد کرتی رہیں گی۔ مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمان ٹھاکر کی ناول نویسی کا جائزہ لیتے ہوئے یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ملک کی تقسیم کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں ان میں وہ جمالیاتی رچاؤ، فنی پختگی نفسیاتی نکتے، اور جذبات کے اتار چڑھاو کہیں نظر نہیں آتے جو مجھے ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ملتے ہیں۔ بلاشبہ جدید دور میں ٹھاکر کے ناولوں نے اردو ادب کی لاج رکھ لی ہے ان کے فن سے ہماری روایتوں کو آگے بڑھنے کا کو موقع ملا ہے اس کی یقیناً ایک تاریخی حیثیت ہوگی''

خود ٹھاکر کے بقول بائیس ۲۲ برس دلی کی گلیوں کی خاک چھان کر وہ دوبارہ پتھروں کے شہر جموں آ گئے آخری ناول ''سورج سمندر میں ڈوبتا ہے'' لکھ

رہے تھے لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ہی ایک جیپ حادثے میں مجروح ہوئے اور ۱۴
اگست ۱۹۷۳ء کو ابدی نیند سو گئے۔

---

1 ''پونچھ'' مصنف خوش دیو مینی

2 ''ہمارا ادب'' ۱۹۷۳: صفحہ ۲۳۵

3 ہمارا ادب ۱۹۵۹ء، حامدی کاشمیری ص ۱۸۳

4 بیسوی صدی، دہلی سالنامہ، جنوری ۱۹۶۰ء ص ۶۳۔ اس سالنامے میں آپ کا دیگر ممتاز ہم عصر ادیبوں کے علاوہ پورے صفحے کا ایک خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے جس میں آپ ایک ناؤ میں چپو ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔ نیچے یہ مصرع دیا گیا ہے

جستجو میں تری دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

5 اس ناول کے علاوہ ٹھاکر کے بعض دیگر ناول بھی ہندی، پنجابی اور بنگالی میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ خود ٹھاکر نے نیلامبر دیو شرما کی معروف انگریزی تصنیف ''جدید ڈوگری ادب'' کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس اور شستہ ہے۔ کہیں کہیں لفظی ترجمے کی بجائے خیال کے ترجمے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ یہ اہم ترجمہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کی اشاعت کا اہتمام ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے کیا تھا۔ (جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
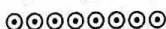
کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔
آپ کا اصلی نام کشمیری لال موہن ہے آپ کے والد گورداس رام موہن ایک عرصہ تک ریاستی محکمہ سیاحت کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس کے بعد آپ ریذیڈنسی میں ملازم ہو کر مستقل طور سری نگر منتقل ہوئے اور پھر برسوں اسی شہر ناشاد میں بود و باش اختیار کی۔ ذاکر نے ابتدائی تعلیم سری نگر کے ایس پی اسکول میں حاصل کی اور لڑکپن کے اپنے بہترین ایام کشمیر میں گزارے۔
لاہور سے شایع ہونے والی ادبی رسالے ''ہمایوں'' کی اکتوبر ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں آپ کی پہلی کہانی ''الگ الگ راستے'' شایع ہوئی۔ اس دوران آپ نے بی اے کرنے کے بعد انگریزی ادبیات میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہونے کے ساتھ ہی آپ نے فکشن کے میدان میں زیادہ سنجیدگی اور متانت سے قدم رکھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب اور ستھیارتی نے اس زمانے میں بیش بہا نثری کارنامے انجام دئے تھے۔ جب ذاکر ان کی صفوں میں داخل ہوئے تو پہلی ہی بار

انہوں نے اردو کے ادبی حلقوں میں ارتعاش پیدا کیا۔ اپنی کہانیوں کی Originality سے وہ اپنے قارئین کو متاثر کرتے رہے۔ اس طرح ۱۹۵۱ء کے آس پاس آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کشمیر جل رہا تھا'' کے عنوان سے شایع ہوا کشمیر اس مجموعے کی کہانیوں کی اساس ہے۔ ان کہانیوں سے واضح ہوتا ہے کہ آپ شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کے مخالف ہیں آپ انہیں دفن کرانے کے متمنی ہیں تاکہ عوام آزادی کی فضاؤں میں سانس لیکر مظالم سے نجات حاصل کرسکیں۔

یہ ایک نو آموز قلم کا پہلا قدم تھا اس کے بعد ایک طویل ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ اس سفر کے ہر موڑ پر آپ نت نئے مضامین کے انبار لگاتے رہے لیکن ہر تحریر میں وادی کشمیر کا پس منظر ابھر آتا۔ ہر تخلیق میں مثبت انسانی قدروں پر اٹوٹ وشواس کا جذبہ نظر آتا کشمیری لال ذاکر نے اپنا قلم ہر بلند و پست میں ان قدروں کی سلامتی کے لئے وقف رکھا۔ ''سیندور کی راکھ''۔ اردو میں تحریر کردہ آپ کا پہلا ناولٹ ہے۔ اس کے بعد آپ مسلسل اور بے تگان لکھتے رہے۔ آپ اپنے لفظوں سے ایک پر سطوت عمارت تعمیر کرتے رہے۔ خود لکھتے ہیں

''ادیب اپنی عمارت کے ماتھے پر سیاہی سے پُتا ہوا مٹی کا برتن الٹا کر نہیں لٹکاتا تاکہ اس کی عمارت کو بری نظر نہ لگے۔ وہ دن رات کی محنت کے بعد تیار کی گئی عمارت میں نہ تو خود رہتا ہے اور نہ ہی اسے کرایہ پر اٹھاتا ہے وہ تو اپنی عمارات کے تمام کواڑ کھول دیتا ہے جہاں کوئی بھی مسافر بغیر کسی اجازت کے آسکتا ہے اور جب تک چاہے رک سکتا ہے، اکیلا یا اپنے کسی دوست کے ساتھ اور اس کے بدلے میں ادیب کچھ بھی نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی

ایسا ہوتا ہے کہ فرسٹریشن کا مارا ہوا ایک شخص دھوپ میں جھلستا عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی چلا اٹھتا ہے کہ عمارت میں کراس وینٹی لیشن تو ہے ہی نہیں۔ اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے وہ عمارت کی بنیاد سے لیکر چھت تک سو خامیاں نکالتا ہے۔ یہ شخص تنقید نگار ہے۔ یہ کسی سے بھی خوش نہیں کیونکہ زندگی کے بارے میں یہی اس کی اپروچ ہے''

کشمیری لال ذاکر منفی رجحان رکھنے والے ایسے ناقدین سے بے نیاز یکے بعد دیگرے ناول تحریر کرتے رہے۔ انگوٹھے کا نشان، دھرتی سدا سہاگن، کرماں والی، لمحوں میں بکھری زندگی اور ڈوبتے سورج کی کتھا، جیسے ناولوں میں آپ نے سماج کے رستے ناسوروں پہ اظہار خیال کیا ہے۔ وہ حالات بیان کئے ہیں جنہوں نے ہمیں ایک خاص طبقے کے پاوں تلے کچل کے رکھ دیا ہے جو انسانیت سے ناآشنا ہے۔ ان تحریروں میں کروڑوں دلوں کے دھڑکنے کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ تحریریں وحشی سماج پر ایک بھرپور طنز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں صنف نازک کی بے چارگیوں اور مذہب کے نام پر پھیلائی جانے والی بے جا منافرت کا بھی اظہار ہے چنانچہ ''کرماں والی'' کا موضوع ایک مسلمان خاتون ہے جس کا بچہ اتفاق سے ایک سکھ گرنتھی کے ہاں پروان چڑھتا ہے۔ نامور ناقد خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں کہ ان کی دانست میں یہ گزشتہ دس برسوں میں تحریر کردہ بہترین ناول ہے۔:

''دھرتی سدا سہاگن'' آپ کا ایسا ناول ہے جو ماہنامہ شاعر ممبئی میں قسط وار شایع ہوتا رہا۔ اپنی ٹانگ کے کٹ جانے کے بعد شیتل جب برسوں بعد اپنے گاؤں لوٹ آیا تو بیساکھی کی مدد سے گھر کی ڈیوڑھی پار کرتے دیکھ کر اس کی ماں چیخ

اٹھی اسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ جب اس کا لڑکا گھر لوٹے گا تو وہ اپاہج بن چکا ہوگا۔ بہر حال ماں نے اسے بتایا کہ اس کے دوست چندر کی موت کے بعد اس کی بیوی کیرتی سسرال میں ہی رہ گئی۔ دوسرے دن جب کیرتی نے شیتل کو دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ کمسن دلہن سے مکمل عورت بن گئی ہو۔ کیرتی کے جانے کے بعد شیتل دیر تک چندر اور کیرتی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس ناول کی کہانی دراصل سماج کے ایک طبقے اور دوسرے طبقے کی بنیادی قدروں اور ضرورتوں کے ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ یہ بعض مجبور اور محروم افراد کی کہانی ہے جو رشتوں کے حقیقی لمس سے نا آشنا ہیں۔ اس ناول سے ایک چھوٹا سا اقتباس پیش خدمت ہے2:

> ''سب سے آخیر میں کیرتی آئی۔ اس نے وہ ساڑھی پہن رکھی تھی جو کچھ روز پہلے شیتل نے اسے خرید کر دی تھی۔ اس کی مانگ جو پورے سات برس تک سونی رہی تھی آج سیندور کی لکیر سے چمک رہی تھی جیسے روشنی کا دریا بہہ رہا ہو۔ اس کے کشادہ گورے ماتھے پر لال بندی یوں چمک رہی تھی جیسے اس میں سے نئے پربھات کی کرنیں پھوٹ کر سارے ماحول کو جگمگا رہی ہو۔ نیا سویرا جو سمر پور گاؤں پر طلوع ہو چکا تھا روشنی کا سیندور دھرتی کی مانگ میں بکھر رہا تھا۔ دھرتی جو سدا سہاگن ہے''۔

''فرار'' آپ کا ایک اور ناول ہے جو ماہنامہ روبی دہلی میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ سینٹرل جیل کے ڈاکٹر کی لڑکی سیما قتل کے جرم میں سزا کاٹنے والے ایک نوجوان بھارت سے نفسیاتی طور متاثر ہوتی ہے۔ خوبصورت اور پڑھا لکھا بھارت بے حد تند مزاج اور ضدی بھی ہے۔ سیما کو بھارت کی بدتمیزی بے حد ناگوار گذرتی

ہے۔ وہ بھارت کو گھر کے کام کاج کے لئے بلواتی ہے۔ دراصل فرار کا محور وہ محروم لوگ ہیں جو دیہی زندگی سے منہ موڑ کر شہروں کا رخ کرتے ہیں۔لیکن مشینی نظام کے آلات میں جنہیں اپنے گاؤں کی بار بار یاد آتی ہے۔ایک اقتباس3:

''بھارت کو گاؤں چھوڑے ہوئے چار برس ہو گئے تھے۔اس کا جی چاہتا تھا جب وہ گاؤں میں داخل ہو تو پہلے اس کی مٹی کو چومے جس میں کھیل کود کر اس نے زندگی پائی تھی۔گلی میں چلنے والے ہر بزرگ کے پاؤں چھوئے انہیں کی دعاؤں سے تو باپ کے نہ ہونے کے احساس کو بھولا رہا۔ ان مہربان چہروں کا شکریہ ادا کرے جو اسے شہر کی جگمگاتی سڑکوں پر بھی یاد آتے رہتے ہیں......''

چھٹی اور ساتویں دہائی کے دوران گو کشمیری لال کا فنی میلان ناول ہی کی طرح مائل رہا لیکن افسانے سے وہ قطعی غافل نہیں رہا۔اس مدت کے دوران بھی ذاکر کے افسانے ملک کے مقبول رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے رہے۔اس صدی کا آخری گرہن اور دو کنواریاں ایسے نمائندہ افسانے ہیں۔ ''ایک قیدی اور......'' ذاکر کا بہترین افسانہ قرار دیا ہے۔اس افسانے سے ایک اقتباس4:

پندرہ سال فائلوں کی موٹی موٹی تہوں میں اپنے دماغ اور ضمیر کو دفن کرنے کے بعد،اب کہیں میں اپنی کرسی سے اٹھ کر قریب کی دوسری کرسی پر بیٹھ سکا ہوں۔پندرہ سال کے اس طویل عرصے میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔زندگی کے مختلف شعبوں میں تجربات کی وسعتیں بڑھ گئی مشاہدات کی نئی دنیائیں ظہور میں آئیں ملک میں متعدد تحریکیں ابھریں یا مٹ گئیں خود میری زندگی میں کئی حادثات پیش آئے۔وقت کے

اتنے طویل سفر کے بعد میری دفتری زندگی نے کونسی منزل پائی۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ کرسی جس پر کبھی لالہ یوگ بیٹھا کرتے تھے آج میرے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔

کشمیر کا پس منظر اور کشمیریات کی بازگشت آپ کی فنی کاوشوں میں بار بار لوٹ کر آتی رہی۔ "لمحوں میں بکھری ہوی زندگی" عنوان کا ناول بھی جموں وکشمیر کے پس منظر میں ہی تحریر کیا گیا۔ بعض ناقدین اسے ایک سوانحی ناول قرار دیتے ہوے اسے وہی درجہ دیتے ہیں جو کرشن چندر کے ناول، میری یادوں کے چنار، کو حاصل ہے۔ مماثلت سے قطع نظر یہ ناول کشمیری لال ذاکر کی سوانح حیات کا ایک باب قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ناول کشمیری لال ذاکر کی روح میں اترنے اور ان کے فن کی بلندی کو چھونے کے لئے ایک زینہ ہے۔ جس میں یاداشت اور افسانے کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جاتی ہوئی رت، خون پھر خون ہے، ڈوبتے سورج کی کتھا اور چار میل لمبی سڑک آپکے بعض دیگر ناول ہیں۔ ان سبھی ناولوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ آپ ہر بار ایک اچھوتے اور انوکھے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ مثلاً ڈوبتے سورج کی کتھا، میں آپ نے ڈھلتی عمر کے پھیلتے سایوں کو اپنے مخصوص انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، خون پھر خون ہے ایمرجنسی کے دوران، ان پر آشوب ایام پر تحریر کیا جانے والا اردو کا واحد ناول ہے۔

کشمیری لال ذاکر اپنے کرداروں کا انتخاب اکثر جموں وکشمیر کی دھرتی سے کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے ان کی تخلیقات میں کشمیر کا حسن اس کی دل کشی اور سادگی سمٹ کر آتی ہے ان تحریروں میں اس درد کی ہلکی ہلکی آنچ پیدا ہوتی ہے جو اہل کشمیر نے صدیوں سے اپنے سینے میں دبا کے رکھا ہے۔ سمندر صلیب اور وہ، ایک ایسا ہی

ناول ہے۔ یہ ذاکر کے تازہ ترین ناولوں میں گنا جاتا ہے۔

''گوا کی تحریک آزادی کے پس منظر میں تحریر کیا گیا یہ ناول کشمیر کی حسین وادی اور گوا کے گرجا گھروں اور اس کے حسین ساحلوں کے درمیان ایک مضبوط اور خوب صورت پل کی حیثیت رکھتا ہے انسانی قدروں کے تحفظ کے لئے لفظوں کی مدد سے تعمیر کیئے گئے اس پل کے نیچے سے بہتے ہوئے دریائے جہلم اور مانڈوی ندی کا پانی آپس میں تحلیل ہوکر ان مجاہدین کی داستان بھی سناتا ہے جو برسوں تک اذیتیں سہتے رہے کہ انہیں جابر حکومت سے آزادی حاصل کرنا تھی اور جب وہ اپنی اندھیری کوٹھریوں سے رہا کیئے گئے تو ان کی آنکھیں باہر پھیلی تیز روشنی کی تاب نہ لاکر بینائی کھو بیٹھیں''۔

جاوید، محمودہ، ممتاز، دھون، سرجیت وغیرہ یہ سب ناول کے کردار ہی نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں جو اس سماج کی نمایندگی کرتے ہیں جس میں وہ جی رہے ہیں۔ وہ اپنے علاقے کے مخصوص کلچر کے نمایندے ہیں لیکن وہ سب سے زیادہ جس چیز کی نمایندگی کر رہے ہیں وہ انسانیت کی قدریں ہیں۔ یہاں ذاکر کی زبان میں روانی ہے مٹھاس ہے اور ایک بے ساختگی ہے یہ تحریریں دل کی عمیق گہرائیوں میں اپنا اثر چھوڑ دیتی ہیں۔ ایک اقتباس پیش ہے5:

''جب کبھی مجھے میرے باپ نے پیٹا ہے میں یہیں آیا ہوں چناروں کی چھاؤں میں۔ جب مجھے کسی نے جھڑکا ہے مجھے یہیں آ کر سکون ملا ہے میں نے کئی برسوں تک اسکول سے چھٹی کے بعد اپنا وقت اسی چنار کی چھاؤں میں گزارا ہے۔ جہاں ہم دونوں بیٹھے ہیں یہیں بیٹھ کر میں نے ہوم ورک کیا ہے اقبالؒ کی نظمیں یاد کی

ہیں یہیں میں جی بھر ہنسا بھی ہوں اور رویا بھی ہوں"۔

---

1 لفظوں کی عمارت، سمندر صلیب اور وہ ص ۸

2 ماہنامہ شاعر، ناولٹ نمبر ۱۹۷۱ء ص ۵۳۴

3 ماہنامہ روبی دہلی، اگست ۱۹۶۹ء ص ۱۲۶

4 بیسوی صدی نئی دہلی مارچ ۱۹۹۱ء ص ۱۹

5 سمندر صلیب اور وہ ص ۳۱

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

موہن یاور

موہن یاور کی ولادت ۱۹۲۷ء میں جموں میں ہوئی۔ اپنی تعلیم بھی جموں میں ہی حاصل کی۔ لڑکپن ہی سے ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا چنانچہ ۱۹۵۵ء تک آپ نے اردو افسانے میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا اور اس طرح نئے لکھنے والوں میں اپنے لئے ایک نمایاں مقام پیدا کیا۔ ''وہسکی کی بوتل'' آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا۔ مجموعہ میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ یاور کے نئے انداز بیان نے قارئین کو فوری طور اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس کے بعد آپ کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''سیاہ تاج محل'' کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا۔ اس کے افسانہ دائرہ، بانجھ، چند تصویر بتاں، موم اور پتھر اور دل چارہ گر قابل ذکر ہیں۔ ان سبھی افسانوں کے موضوع اور ان کا سٹائل دلچسپ بھی ہے اور اس میں تازہ کاری بھی ہے اس تازہ کاری اور انفرادیت کا اعتراف کشمیری لال ذاکر نے مجموعے کے اپنے تعارفی سطور میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجاز میں لکھنوی بانکپن تھا اور یاور میں ڈُگر دیس کا تیکھاپن۔ یہ تیکھاپن یاور کی کہانیوں کی جان ہے۔ یاور کا فن کسی گیت کی گونجتی ہوئی لئے ہے جس میں سوز

ہے تڑپ ہے نغمگی ہے لیکن نرماہٹ نہیں بلکہ آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے کسی اوزار کی تیز دھار ہے جو ایک دم چیرتی ہوئی سی جسم میں گزر جاتی ہے……"

"تیسری آنکھ" آپ کا ایک اور افسانوی مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں محرومیوں اور تمناؤں کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ موہن یاور ان میں سے کوئی ایک لمحہ چن کر اپنے پورے تاثر کے ساتھ اس کا اظہار کرتا ہے۔ شعور کی تہذیب اور نفسیاتی تفسیر آپ کے فن میں ایک ایسی پختگی پیدا کرتی ہے کہ ان کی تعظیم ایک منجھے ہوئے فن کار کی حیثیت سے کرنی ہی پڑتی ہے۔ برج پریمی ایک قدم آگے جا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ موہن یاور کہانی کے فن پر قادر ہیں۔ وہ منٹو اور بیدی کی طرح الفاظ کے کم از کم استعمال سے تاثر کی وحدت قائم کرتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یاور اپنے بعض ہم عصر دوستوں کی طرح نثر میں شاعری نہیں کرتے کیونکہ ان کا ارتکاز اختصار پر ہے۔

دو کنارے، کے بعد توی اور جہلم آپ کی ایک قابل قدر تخلیقی کوشش تھی جس میں جموں وکشمیر کی بعض ادبی شخصیات کے پورٹریٹ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ پتھروں کا شہر، آپ کا ایک معروف ناولٹ ہے۔ جموں کے باغی افسانہ نگار نے اب نیا روپ دھارن کیا تھا لیکن یہاں بھی انگلیاں وقت کے نبض پر تھیں۔ یہاں جموں کی سنگلاخ سرزمین کے پس منظر میں بدلتی زندگی کا بے لاگ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماہنامہ سنگم جموں کے ساتھ آپ برسوں وابستہ رہے۔ یہ آپ کی مساعی جمیلہ کا اعجاز تھا کہ اس ماہنامہ نے قلیل وقت میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور یہ برصغیر کے مقتدر قلم کاروں کا ترجمان بنا رہا ہے۔ روز نامہ سندیش اور روز نامہ رفتار بھی

موہن یاور کی ادبی صحافت کے غماز ہیں۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے آپ کے مجموعے ''سیاہ تاج محل'' پر انعام دیا گیا۔ اس مجموعے کی کہانیاں بھی ایک زنگ آلود نظام کے خلاف حساس کہانی کار کی للکار ہے۔ یہ کہانیاں آپ کی بے پناہ بصیرت کی عکاس ہیں جنہیں آپ نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ موہن یاور نے ریڈیو کے لئے لگ بھگ ایک سو ڈرامے تحریر کئے جن میں جاگتے رہو خبردار اور بھوکے پیٹ کا عشق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

---

1 اسی سال ''رامانند ساگر نے اپنا متنازعہ فیہ افسانہ کشمیر کی بیٹی تحریر کیا تھا۔ اس سے قبل ان کا تحریر کردہ ناول ''اور انسان مر گیا'' بھی کافی متنازعہ فیہ رہا تھا اور عرصہ دراز تک برصغیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا تھا۔ ساگر نے کشمیر کی بیٹی فن کار دہلی کو اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن متعلقہ ادارے نے اس کی اشاعت کے لئے معذرت ظاہر کی۔ چھ برس بعد یہ افسانہ مئی ۱۹۶۱ء کے سنگم جموں میں شائع کیا گیا۔ اس افسانے کے ساتھ مدیر فن کار پرکاش پنڈت کا وہ خط بھی شامل اشاعت ہے جس میں معذرت ظاہر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ مذکورہ افسانہ فن میں پروپیگنڈے کے رجحان کا عکاس ہے۔ افسانے میں سطحی سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پرکاش پنڈت نے اس حد تک بھی لکھا تھا کہ شاید ساگر نے یہ کہانی کسی فلم کے لئے لکھی ہے اور غلطی سے ادبی رسالے کو بھیج دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساگر کا جواب نامہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے ادب اور آزادی کی بات کی ہے۔ ساگر لکھتے ہیں۔ ''جسمانی طور ادیب کا گلا گھونٹ کر اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ادب کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا''۔ رامانند ساگر عرصہ دراز تک دق کے عارضے میں مبتلا رہے۔ اس سلسلے

میں انہیں ٹنگمرگ کے سینی ٹوریم میں زیر علاج رہنا پڑا۔ چنانچہ اس زمانے کے مشاہدات پر آپ کا افسانہ ٹنگمرگ کے اڈے پر شائع ہوا۔ اس کے بعد بخشش، کے عنوان سے شائع ہونے والا افسانہ بھی کنٹروورسی کا موجب بنا۔ ان ہی دنوں آپ کے افسانوں کا مجموعہ جوار بھاٹا کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ سترا افسانوں پر مشتمل تھا۔ ان افسانوں میں تشنہ تکیل، زور پشیماں، آب حیات ان کی فکر اورفن کے اچھے نمونے ہیں۔ لیکن جس تخلیق نے برصغیر کے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا وہ آپ کا ناول ''اور انسان مر گیا'' تھا۔ یہ ناول تقسیم اور فسادات کے موضوع پر تحریر کیا گیا تھا۔ اس ناول کی بنیاد ساگر کے وہ نوٹس ہیں جو انہوں نے اس خون آشام دور کے دوران جمع کئے تھے۔ خواجہ احمد عباس نے اس کتاب کے پیش لفظ میں ہنگامی ادب کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن وہ اس ناول کو مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت قرار دینے پر مُصر ہیں۔ ادبی دنیا میں ہلچل مچانے کے بعد راما نند ساگر ممبئی منتقل ہو گئے اور پھر وہیں مستقل رہائش اختیار کی۔ انسانیت پیغام اور آرزو جیسی کامیاب فلمیں بنانے کے بعد آپ نے دوردرشن کے لئے بعض ایسے سیریل تیار کئے جن کی وجہ سے آپ کو بقائے دوام حاصل ہو چکا ہے۔ (ج م ا)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اللہ رکھا ساغر

اللہ رکھا ساغرؔ جموں خطے سے تعلق رکھنے والے ایک معروف قلم کار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ مسلم کانفرنس، کے ایک اہم رکن بھی رہے ہیں اور اس تنظیم کے ساتھ آپ کا جذباتی لگاؤ اس قدر شدید تھا کہ آپ مخالفت کی تیز و تند آندھیوں کے باوجود اپنے اس اعتقاد کے ساتھ مسلسل منسلک رہے۔ آپ شعلہ بیان مقرر ہونے کے علاوہ اردو کے صف اول کے انشا پرداز تھے۔ ساغر کے فکر و فن سے آگہی رکھنے والے جموں کے اہل علم انہیں وہاں کا شمیم احمد شمیمؔ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ساغر کے قلم اور کلام سے ویسی ہی چنگاریاں جھڑتی اور بھڑکتی تھیں جیسی شمیمؔ کے قلم اور کلام سے۔ ساغر برسہا برس تک اخبار جاوید، کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس اخبار میں آپ کے فکر انگیز مقالات اور تیر و نشتر تحریریں پڑھکر مولانا ظفرؔ علی خان نے کہا تھا کہ اللہ رکھا ساغر کی تحریریں اور تقریریں عدیم النظیر ہیں۔ کبھی کبھی آپ کے انداز میں رشید احمدؔ صدیقی جیسی نشتریت آجاتی ہے مولانا یہاں تک کہتے ہیں کہ جب اللہ رکھا ساغر مرزا محمد افضل بیگ اور وزیر گنگارام پر طنز کے تیر برساتے ہیں تو اس ظرافت میں نیازؔ فتح پوری کی بے ساختگی اور مولوی عبدالحق کی سی تنقیدی بصیرت اور متانت آجاتی ہے۔ گلزار احمد فداؔ ساغرؔ کے فکر و فن کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے

یہاں تک کہتے ہیں کہ جب ان کی تحریروں میں شعلوں کا رقص شروع ہوتا ہے تو سودا اور اودھ پنچ کے منشی سجاد حسین کی روحیں بھی لرزنے لگتی ہیں1۔ اخبار ''جاوید'' کا مزاحیہ کالم ''جُر عات'' ادبی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گا۔ یہ ایسی تحریریں ہیں جنہیں گردش ایام کی کوئی بھی آندھی اڑا نہیں لے جا سکتی۔

---

1 محمد یوسف ٹینگ ہمارا ادب شخصیات نمبر ۳ میں ساغر صاحب کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چودھری غلام عباس کی اکثر تقریریں اللہ رکھا ساغر کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ بلکہ چوہدری صاحب کی خودنوشت سرگزشت کشمکش، بھی دراصل ساغر کے ہی نیستاں کی فصل ہے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد دوسرے مہاجر لیڈروں کے برعکس ساغر نے کسی عہدے کی تمنا نہیں کی۔ ان کی جتنی جائیداد جموں میں ہے اس کا چھوٹا سا بدل بھی انہیں پاکستان میں نہ ملا۔ چوہدری عباس کے بعد اگر کسی شخص نے اس سلسلے میں بے نیازی دکھائی تو وہ ساغر ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ نے اپنے اس مضمون میں ساغر کے اخبار جاوید کا سیر حاصل مطالعہ پیش کیا ہے جس سے ساغر کی خلاق شوخ اور بے لاگ طبیعت کی پھلجڑیوں کا عکس ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس نشاط مطالعہ کے دوران فاضل مضمون نگار نے شمیم کے مماثلتی رنگ بھی ابھارے ہیں۔ اس مضمون کے اختتام میں وہ لکھتے ہیں ''میری آنکھوں کے سامنے اللہ رکھا ساغر کا وہ چہرہ ابھر رہا ہے جس پر کسی آزمودہ جنگ جو کی طرح رعونت ہے اگرچہ اس کو یہ علم ہے کہ اس نے جنگ نہیں جیتی لیکن حرب تو ایک فن ہے اور اس نے Art for Arts Sake جنگ لڑی ڈٹ کر لڑی اور خوب لڑی'' (جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

حمید نظامیؔ

حمید نظامیؔ تقسیم سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے ایک اہم تنقید نگار رہے ہیں۔ آپ کی ناقدانہ تحریروں کو نہایت قدر ومنزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ نے اس زمانے میں متعدد قلم کاروں کے فکر وفن پر نہایت مدلل تبصرے کیے۔ دیوان نرگس کے رسالہ پریم میں آپ کے مضامین نمایاں طور شائع ہوا کرتے تھے۔ فروری ۱۹۴۶ء کے شمارے میں آپ کا ایک مضمون ''سینچ گاؤں کی قلو پطرہ'' شائع ہوا۔ یہ دراصل جولائی ۱۹۴۵ء کے ادبی رسالے ساقی میں پروفیسر محمود ہاشمی کے افسانے پر ایک جائزہ ہے جو رسالے میں اسی عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ جائزہ آپ کی ناقدانہ نگاہ کا غماز ہے۔ اس مضمون میں اگرچہ آپ نے مختلف پہلوؤں سے تنقید کا ہدف بنایا ہے تاہم آپ کی تنقید متوازن بھی ہے اور معقول بھی۔ خود رسالہ پریم کے مختلف اہم نمبروں پر آپ کے نقد ونظر شائع ہوتے رہے ہیں۔ جنہیں ادبی حلقوں میں نہایت دلچسپی سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی آپ کے مضامین اور افسانے رسالوں اور اخباروں میں چھپتے رہے۔ یہاں آپ آزاد کشمیر حکومت کے محکمہ ابریشم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ستر

کی دہائی کے دوران ریٹائر ہو گئے۔ ملازمت سے سبکدوش کے بعد سیالکوٹ سے ایک ہفت روزہ ''دورِ جدید'' جاری کیا۔

حمید نظامیؔ کی ادبی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ آپ ایک کہنہ مشق مترجم کی حیثیت سے بھی معروف رہے ہیں۔ آپ نے درجنوں انگریزی کہانیوں کے اردو ترجمے اس خوبی سے کئے ہیں کہ یہ تحریریں طبع زاد نظر آتی ہیں۔ اور ان پر ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ گلزار احمد فدا ایک مترجم کی حیثیت سے آپ کی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انگریزی کی کہانیوں کا اردو ترجمہ کرنے میں حمید نظامیؔ کے مرتبے کا کوئی مترجم نہیں ہوسکتا۔ فاضل قلم کار ترجمے کا فریضہ اس قدر چابکدستی سے انجام دیتے ہیں کہ اصل اور ترجمے میں فرق کرنا کبھی کبھی کٹھن ہو جاتا ہے آپ کے ترجمے کا انداز وہی ہے جو مولوی عنایت اللہ اور ل احمد کا ہے۔ آپ کا تخیل بھی زرخیز ہے اور زبان نہایت دلی دھلی اور رومانوی۔ آپ نے پریم ناتھ بزاز کی مشہور کتاب ''آزاد کشمیر'' کا اردو میں نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ آپ کے افسانے اور تنقیدی مضامین پاکستان کے ممتاز رسائل میں چند سال پہلے تک پابندی سے شائع ہوتے رہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
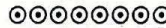
رام کمار ابرولؔ

رام کمار ابرول ۱۹۳۰ء کے آس پاس جموں میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور بی اے کرنے کے بعد ریڈیو کشمیر جموں میں ملازم ہو گئے۔ یہاں آپ نے ریڈیو ڈرامے میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ابلاغ عامہ کے اس زمانے کے اس نہایت توانا میڈیم کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ''انسان جیت گیا'' آپ کا پہلا ڈرامہ ہے جو ۱۹۵۹ء میں نہایت اہتمام سے شایع کیا گیا۔ اس سے قبل آپ کے ڈوگری افسانوں کا مجموعہ پیریں دے نشان، (پاوں کے نشان) اور شری رام ناتھ شاستری اور دینو بھائی پنت کے ساتھ مل کر مشترکہ تصنیف نواں گراں (نیا گاؤں) شایع ہو چکے تھے ۱ انسان جیت گیا، ابرول کی پہلی تصنیف تھی جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارین تک پہنچی۔ اس کتاب کی اشاعت کے طفیل ابرول جموں کے افسانوی افق پر ستارے کی طرح چمک اٹھے۔

''انسان جیت گیا'' کا موضوع اجتماعی کاشت کاری کے فلسفے کی عام فہم تفسیر ہے۔ صدیوں کے سوئے ہوئے کسان نے ۱۹۴۷ء کے بعد اگرچہ کروٹ بدلی لیکن اس کے کھیت اب بھی منتشر رہے چھوٹے چھوٹے قطعوں میں بٹے ہوئے یہ

کھیت زمین کے کٹاو اور بہاو سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ابرول اپنے کھیل میں یہ دکھاتے ہیں کہ کسان چاہے تو اپنی مدد آپ کر سکتا ہے اس کا ذوق عمل اور سعی پیہم ہی اس کی بہترین رہبری کر سکتی ہے۔ ابرول عوام الناس کی خوشحالی میں ان کے اشتراک عمل کا متمنی ہے۔ ممکن ہے کہ ابرول اس زمانے کی ترقی پسند تحریک براہ راست وابستہ نہ رہے ہوں لیکن اس کھیل کے پس منظر میں اس تحریک سے دبی دبی وابستگی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ رضا کارانہ محنت اجتماعی ترقی اور مشترکہ عمل کی اہمیت وافادیت کسی سیاسی بازیگر کی تقریر کا موضوع ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی ادبی تخلیق کا محور نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ اس رجحان کی وجہ سے وہ ادب نہیں رہتا بے جا تشہیر کا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ بد قسمتی سے ابرول کے ہاں یہ رجحان بجائے کم ہونے کے بتدریج بڑھتا رہا اور اس کا ہدف اردو تو اردو اس کی ڈوگری میں تحریر کردہ چیزیں بھی بن گئیں۔ ابتدا میں ناقدین نے اسے ریڈیو ڈرامے کے وقتی اثر سے تعبیر کر کے اس کو نظر انداز کرنے کی بھی کوشش کی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ابرول کے خطیبانہ سٹائل میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکی اور اس طرح ڈرامے ہوں یا افسانے ان کی تخلیقات غیر حقیقی اور غیر فطری ہو کر رہ گئیں۔ تاہم اگر ان کے فن کو کسی چیز نے سہارا دیا تو وہ ان کی کردار نگاری ہے۔ وہ ایک ایک کردار کو نہایت عرق ریزی سے تراشتے ہیں۔ ان کرداروں میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ ان میں سادگی اور تنوع کا امتزاج ملتا ہے۔ دھرتی اور ہم، چکی کے پاٹ کے بعد زندگی اور عورت کے شائع شدہ مجموعوں میں ان سب باتوں کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے2۔

اداکاری سے شوق نے ابرول کو ممبئی کے نگار خانوں میں سرگرداں کیے رکھا

لیکن اپنے ہم عصر دوست وید راہی کی طرح انہیں بھی ناکام واپس جموں لوٹ آنا پڑا۔ اب انہوں نے ریاستی محکمہ اطلاعات میں نوکری کرلی۔ اس دوران آپ نے ڈوگری زبان وادب کے لئے گویا اپنے حقوق محفوظ کر لئے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد آپ کا فن بھی جدید ادبی رجحانات سے متاثر ہوا۔ اردو میں جو کچھ لکھا وہ نئے تقاضوں کے مطابق تھا۔ سحر ہونے تک عنوان کا ناول آپ کے تخلیقی سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ رام کمار ابرول نے ڈگر دیس کے عوام اوران کے دکھ سکھ کی جو علامتی تفسیر پیش کی ہے وہ ان کے قارئین کے حلقوں میں ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔

---

1 ابرول نے اگر چہ اردو کی معرفت ہی ڈوگری میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن اردو سے قبل آپ کی بعض ڈوگری چیزیں شائع ہوئیں۔ ٹھاکر پونچھی نے ایک بار کہا تھا کہ رام کمار ابرول سوچتے اردو میں ہیں مگر لکھتے ڈوگری میں ہیں۔ چنانچہ ان کی دواتھرو (دو آنسو) اور غیرتو دامُل (غیرت کی قیمت) کہانیوں میں احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کا اثر نمایاں ہے۔ درحقیقت دو آنسو، احمد ندیم کے گنڈاسہ، افسانے سے متحرک ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ افسانہ احمد ندیم قاسمی کی کہانی کا ڈوگری چربہ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس بات کی تصدیق نیلامبر شرمانے بھی اپنی انگریزی کتاب میں کی ہے۔

2 مصنف کے ساتھ ایک اور سماجی ناول بھی منسوب ہے۔ ''راحت'' عنوان کے اس ناول کا اشتہار ''انسان جیت گیا'' کے صفحہ نمبر ۸۸ پر نمایاں طور درج ہے۔

3 سرورؔی اپنی کتاب کشمیر میں اردو کے تیسرے حصے میں لکھتے ہیں کہ ابرولؔ نے ''انسان جیت گیا'' کی ہدایت بھی خود دی تھی جو کہ واقعتاً قطعی غلط ہے۔ اس کھیل کی ہدایت کاری کے

فرائض جتیندر شرما نے انجام دئے تھے۔ ابرول نے اس میں رام، کا مرکزی کردار ادا کیا تھا جس کا سروری نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ (ج،م،ا)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

کشوری منچندہ

کشوری منچندہ کا اصلی نام کشوری لال ہے۔ ۱۹۲۹ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ گردش آفاق نے آپ کو اتنی مہلت نہ دی کہ آپ اعلیٰ تعلیم کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتے۔ بمشکل میٹرک کا امتحان پاس کیا اور محکمہ تعلیم میں مدرس کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن نوکری کے دوران بھی اپنی تعلیمی صلاحیت کو بڑھانے کے لئے کوشاں رہے۔ اسی زمانے میں آپ افسانوں کے ذریعہ اپنے ماضی الضمیر کا اظہار کرنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے میں آپ کے افسانے پنجاب کے کثیر الاشاعت اخباروں میں نمایاں طور شائع ہونے لگے۔ ادھر نوجوان افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر مبنی مجموعے ''حوا کی بیٹیاں'' میں آپ کا افسانہ ''ساحرہ'' شائع ہوا/۱۔ اس کے بعد ایک اور ادبی انجمن بزم فروغ اردو کے انتخاب میں آپ کا ایک اور افسانہ ''سیاہی'' شائع ہوا۔ یہ ایک ابھرتے قلم کار کے نقش اول تھے۔ ان میں کوئی اور خصوصیت بھلے ہی نہ رہی ہو لیکن کشوری منچندہ کی سادہ اور سلیس زبان نے قارئین کی توجہ اپنی طرف ضرور مبذول کی تھی۔

سلاست کا یہ سفر پھر سالہا سال سرگرمی سے جاری رہا۔ ۱۹۶۷ء میں آپ کا

نقاب نے منچندہ کے چہرے کو ڈھانپ دیا ہو۔

2 ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے ۱۹۸۰ء میں ایک روزہ کل ہند اردو کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ لیکن کانفرنس پھر ۲۷/جنوری ۱۹۸۱ء کو جموں کے ابھینو تھیٹر میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی محفل افسانہ میں کشوری منچندہ نے یہ کہانی پڑھی تھی۔ اس محفل کی صدارت مشہور افسانہ نگار شری بندھو شرمانے کی تھی۔

3 تکون کا کرب، بیک ٹائیٹل۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

لیش سروج

لیش سروج کا اصلی نام لیش رام پال ہے۔ آپ ۱۹۳۳ء کے آس پاس جموں میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بی اے کرنے کے بعد پنجابی زبان میں اپنی ذات کا اظہار کرنے لگے۔ بہت سال بعد ہندی اور پھر اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہانیاں تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ آپ مزدور تحریک کے ساتھ قریبی طور وابستہ رہے اور سرمایہ دارنہ نظام کے خلاف محنت کش طبقہ کو منظم کرتے رہے۔ ان سرگرمیوں کے دوران لیش کو دنیا بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ شمال جنوب مشرق اور مغرب ہر پرانت میں گھوما لیکن وہ جہاں کہیں بھی گیا جموں اسے آواز دیتا رہا۔ ہر آوارہ گردی کے بعد پتھروں کے اس شہر میں لوٹ آتا اور یہاں کی پر پیچ گلیوں کے درمیان اپنے تنگ وتاریک نشیمن میں پناہ لیتا۔

''زمین پیاسی ہے'' لیش کے افسانوں کا مجموعہ ہے اس کی اشاعت کا اہتمام ارمی پبلیکیشنز جموں نے کیا تھا۔ ایک درجن افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے پیش لفظ ''لیش...... میرا عزیز'' سے ایک اقتباس:

''یہ افسانے رومانیت اور حقیقت نگاری کی عکاسی کرتے ہیں۔

جواں سال افسانہ نویس نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی تخلیقات میں خلوص و مشاہدہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ دماغی اور دلی طور پر اسے پسماندہ عوام سے گہری ہمدردی ہے مگر یہ ہمدردی کسی تماشائی کی ہمدردی نہیں بلکہ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ افسانہ نگار نے عوام کی خواہشات کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں سمولیا ہے اور وہ عوام کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد خیال کرتا ہے"۔

لیش سروج کی کہانیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں اس کے اپنے گرد و پیش اس کی اپنی مٹی کی مہک ہے۔ اپنی عصری زندگی کی زخمی تمنائیں ہیں۔ اپنے مخصوص سیاسی نظرئے کی تبلیغ و تشہیر ہے لیکن کہیں کہیں وہ سنبھل نہیں پاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں خطابت سی آجاتی ہے۔ وہ بہت زیادہ جذباتی ہوجاتے ہیں۔ ان کی تخلیق اس جذباتیت کی متحمل نہیں ہوتی اور فن مجروح ہوجاتا ہے۔ لیکن اسے لیش سروج کی ایک بنیادی کمزوری سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔ ان کی اپنی ایک سیاسی سوچ ہے جو کسی نہ کسی طرح ان کے افسانوں سے بے ساختہ اگ آتی ہے۔ نفسیاتی کشمکش کی تفسیر پیش کرنے میں لیش سروج بہرحال چابک دست ہیں اور ان کی کہانیاں شعور و فکر کی ایسی شعاعوں سے قاری کو محظوظ ضرور کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں کلائمکس، زمین پیاسی ہے، چیر ہرن اور خون کا قرض جیسے افسانے قابل ذکر ہیں۔

موہن یاور نے ایک بار لیش سروج کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں کہا تھا2:

"لیش افسانہ اس کے فن تنوع اور تکنیک سے بخوبی واقف ہے۔ وہ

جانتا ہے کہ افسانہ زندہ و جاوید کیسے بنتا ہے اوا سکے زندہ جاوید بنانے میں افسانہ نگار کو کتنا خون تھوکنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیش سروج نے اپنے افسانوں کو سیاہی کے بجائے خون سے تحریر کیا ہے۔"

آپ کی دوسری تخلیقات میں پتھر کا درد (افسانوی مجموعہ) قمقموں کے سیاہ اجالے میں (باول) اور تجھے یادگار بنادیا بھی شامل ہیں۔ یہ تصنیفات آپ کی ہندی اور پنجابی تخلیقات کے علاوہ ہیں۔

---

1 لیش......میرا عزیز: ڈاکٹر اپورب سوم ناتھ: زمین پیاسی ہے۔ص ۷

2 کتب مینار: ماہنامہ سنگم جموں: جنوری ۱۹۶۴ء ص ۵۹

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

وید راہی

وید راہی جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں میں ایک مخصوص حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ ریاست کے ممتاز صحافی لالہ ملک راج صراف کے صاحبزادے ہیں اس لحاظ سے ادب اور صحافت آپ کو ورثے میں حاصل ہوئے ہیں۔ اپنے والد بزرگوار کے مقبول ماہنامے رتن، جو بچوں کے لئے مخصوص تھا، میں آپ کے اندر کے فن کار کو ابلاغ و اظہار کا موقع ملا۔ رتن کے صفحات پر ہی بالآخر وید راہی ایک اردو افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہوا اور اس نے مقبولیت حاصل کی۔

وید راہی اپنے افسانوں میں نفسیات کا اچھا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ آپ کے افسانے مکالموں سے نہیں بلکہ اپنے منفرد سٹائل اور انداز بیان سے ابھرتے ہیں۔ منظر نگاری کا بھی ان میں خاص اہتمام رہتا ہے۔ آپ ایک مخصوص تصوّر کے گرد افسانے کا تانا بانا بنتے ہیں اور پھر اس تصوّر میں اپنے طلسماتی زور بیان سے زندگی کے رنگ بھر دیتے ہیں۔ آپ پہلے افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیوں میں جموں اور اس کے گرد و پیش کے سنگلاخ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی عکس ریز ہوتی ہے۔ لیکن ان افسانوں میں کردار نگاری مقدم ہے۔ کالے ہاتھ 1 آپ کا مشہور افسانہ

ہے۔ اس میں ڈاکٹر نشا اپنی تمام تر مجبوریوں اور محرومیوں کے ساتھ ابھرتی ہے۔ وہ ڈاکٹر گپتا سے رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں ہو پاتی حالانکہ اس کے ساتھ اس کی منگنی بھی طے ہوگئی تھی پھر ستم یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گپتا نشا کی ہی بہن سے شادی کرتا ہے۔ اس افسانہ میں بعض معمولی کوتاہیوں کے باوجود تکنیک پختہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ منجر کا میلہ، شگوفہ اور اسلم میرا دوست راہی کے بعض دیگر یادگار افسانے ہیں۔

''یہ پربت میرے ہیں'' کو میں وید راہی کی نمائندہ تخلیق تصور کرتا ہوں2۔ یہ ایک چھوٹے سے گاوں کی چھوٹی سی کہانی ہے لیکن یہ چھوٹی سی کہانی نہایت معصوم اداوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے ابھر آتی ہے۔ اس میں دیہی زندگی کا صاف شفاف عکس نظر آتا ہے۔ دیہی زندگی کے دھندلے دھندلے سے نقوش، بجھی بجھی آنکھوں سے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نقش کہن ہمارے سامنے کئی ایک سوالیہ نشان رکھ دیتے ہیں۔ جن میں سے ایک کا تعلق کم عمر لڑکیوں کو معمر آدمیوں سے بیاہنے کی مکروہ رسم سے ہے۔ یہ کردار قارین کے دیکھے بھالے ہیں۔ یہ شکست خوردہ سہی لیکن ان میں جینے کی بے پناہ خواہش بھی ہے۔ اس قسم کے افسانے اس بات کا عندیہ دیتے ہیں کہ وید راہی نے کس قدر عرق ریزی سے دیہی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور اسے اپنے فن کے سانچے میں کامیابی اور جراتمندی سے ڈھالا ہے۔ فاضل قلم کار رسوم ورواج کی آہنی زنجیروں کو پگھلانے کے متمنی ہیں وہ معاشرے کے اندر کی مکروہات کو بے نقاب کر کے قارئین کے سامنے حقیقت کا اصلی چہرہ لا دیتے ہیں۔

جموں وکشمیر کے مخصوص لسانی تقاضوں سے تحریک پا کر اردو کا یہ محنتی، پر

خلوص اور باصلاحیت قلم کار بعد میں ڈوگری زبان میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنے لگا۔ وہ ڈوگرہ دیش کے لوگوں کی زندگی ان کے قہقہوں اور آنسووں کی امیدوں اور ناامیدیوں کی کہانیاں بیان کرتا رہا۔ اس نے ''ہاڑ بیٹری تے پتن'' عنوان کا ایک ڈوگری ناول لکھ کر اپنی صلاحتوں کا لوہا منوالیا۔ اس دوران اس نے محکمہ انفارمیشن 3 کے ترجمان رسالے یوجنا، کی ادارت بھی کی۔ پھر وہ ریڈیو کشمیر، جموں سے بھی وابستہ رہا لیکن وہ اب الیکٹرانک میڈیا کے سب سے موثر اور مقبول میڈیم سینما اور پھر ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہی اپنی ذات کا بہتر اظہار کرنے کا قائل ہے۔ وہ اپنی کہانی پڑھنے یا پڑھانے سے زیادہ سلولائیڈ کے قرطاس رنگیں پہ اجاگر کرنے کا قائل ہے۔

---

1 یہ افسانہ ۱۹۶۰ء کے ہمارا ادب میں شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۵۸ء میں ویدراہی کا جو افسانوی مجموعہ ''کالے ہتھ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ اس ڈوگری مجموعے کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس لحاظ سے ۶۲-۱۹۶۰ء تک کا جو ادبی انتخاب ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے ہمارا ادب کے تحت شائع کیا ہے اس مین شامل ویدراہی کی کہانی ''کالے ہاتھ'' دراصل اس کی ڈوگری کہانی کا اردو ترجمہ کہی جاسکتی ہے۔

2 فلم ''پریم پربت'' کا سکرین پلے غالباً اسی کہانی سے ماخوذ ہے۔ ویدراہی کی اس فلم کو ایک حقیقت پسندانہ اور فنی حسن کا ایک امتزاج قرار دیا گیا تھا۔ یہ فلم ۱۹۷۰ء کے آس پاس نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔

3 فلم کی معاونت میں اس محکمے نے بھی اشتراک کیا تھا۔ (ج م ا)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

کِرنؔ کاشمیری

کرنؔ کاشمیری کا اصلی نام دیوراج چوپڑہ ہے۔ آپ ۱۹۳۴ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ دیوان مول راج کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اس نے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں کے ظلم واستبداد کے خلاف نعرہ بغاوت بلند کیا تھا جس کے نتیجے میں اسے تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا تھا۔ لڑکپن سے ہی مختلف شہروں میں اور مختلف ثقافتی مظاہر میں گھومنے پھرنے کا اتفاق ہوا چنانچہ تعلیم کے سلسلے جموں، پنجاب اور دہلی میں کٹتے جڑتے رہے۔ پھر بی اے کرنے کے بعد ماہنامہ چندن سے منسلک ہوئے۔ اس ادارے سے نکل کر معروف قلم کار رنبیر کے روزنامے ملاپ سے وابستہ ہوئے لیکن یہاں بھی اوب گئے تو خود اپنا ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ چند ماہ کے بعد آخر یہ رسالہ بھی بند کر دینا پڑا۔ اپنی ان ادبی اور صحافتی آوارہ گردیوں کے بعد کرن اپنے مشاغل کا یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

"کِرنؔ کاشمیری زبردست احمق ہے۔ کبھی فوجی وردی میں اور کبھی مرکزی سرکار کے مچھلی بازار جیسے دفتروں میں وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ ایک جگہ وہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا کیونکہ

وہ دل کا انسان ہے اور دماغ کا فوجی......وہ منہ کی کھاتا ہے مگر ہار نہیں مانتا۔!
وہ تنہا ہے اور شاید ہمیشہ تنہا ہی رہے گا''۔

آپ کا ناول ''رات اور زلف'' سیمانت پرکاشن کے اہتمام سے ۱۹۸۲ء میں شایع ہوا۔ اس کا انداز بیان رومانی اور شاعرانہ ہے۔ اس اچھوتے طرز بیان اور اس بصیرت سے چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

''ایک پلاسٹر کا بے جان مجسمہ تھا لیکن اس کی مسکراہٹ دلکش اور زندگی سے بھر پور تھی۔ ایک طرف وہ جیتی جاگتی عورت تھی لیکن اس کی مسکراہٹ بے جان تھی''۔

''منورما کے حسن میں مجھے اس کے بدنصیب شوہر کی آرزوں اور ادھورے سپنوں کے تازہ تازہ لہو کی جھلک دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی پاوڈر کی ہلکی تہہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے یہ اس کے شوہر کے ارمانوں کی بجھی ہوئی راکھ ہے''۔

''دن کے اجالے میں جو لوگ بچھڑ جاتے ہیں وہ رات کے دھندلکوں میں نہیں ملا کرتے۔ رات چاہے کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ رات آخر رات ہی ہوتی ہے۔ کبھی دن نہیں ہوسکتی''۔

مندرجہ بالا اقتباسات کرن کاشمیری کے تیز مشاہدے کا عندیہ دیتے ہیں۔ کرن ایک حساس دل فن کار ہیں۔ وہ مختلف لوگوں سے ملتے ہیں ان میں سے بعض پر ان کو ترس آتا ہے اور بعض پر غصّہ لیکن سب سے زیادہ الجھن انہیں اس تضاد اور دھوکے سے ہوتی ہے جو تہذیب وانسانیت کے نام پر پھیلا جارہا ہے۔ ناول نگار کے

دل میں ایسے اجارہ داروں کے خلاف بڑی تلخی ہے۔ انسانی نفسیات کے عمیق مطالعہ سے جو واقعات آپ قلمبند کرتے ہیں۔ ان میں کس قدر حقیقت ہوتی ہے۔ آیئے اس بارے میں بھی ان ہی سے سنیں۔

''رات اور زلف زندہ حقیقی لوگوں کی کہانی ہے جو ہر شہر اور ہر معاشرے میں موجود ہیں۔ جو لوٹتے ہیں اور لٹتے رہتے ہیں یہ لوٹ کبھی دولت کی ہوتی ہے اور کبھی آبرو اور عصمت کی۔ منورما رات کے اندھیروں میں گھر نہ جاتی تو کیا کرتی۔ رات کی سیاہ زلفوں کا پھندا بنا کر خودکشی کے علاوہ منورما کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ رات اور زلف کی منورما نے بھی خودکشی کر لی۔ اپنے اس محبوب کے سامنے جو اسے چاہتے ہوئے بھی اپنانے کو تیار نہیں تھا۔ یہ ناول بہت پہلے چھپ جانا چاہئے تھا مگر ناول کے مرکزی کردار کی گزارش پر اس کا مسودہ دبائے رکھنا پڑا تا کہ اصل زندگی میں اسے نئی منزلوں پر پہنچ کر جم جانے کا موقع مل سکے''۔

اس طرح ناول نگار اس تخلیق کا کرب برسوں تک اپنے سینے سے لگائے رہا۔ ویسے اس کے افسانے باقاعدہ طور ۱۹۵۱ء کے بعد سے ہی شایع ہونے لگے تھے۔ ایک افسانہ تنہا درخت ممبئی سے شایع ہونے والے مقبول ادبی رسالے شاعر میں شائع ہوا تھا۔ رات اور زلف، سے قبل آپ کا ایک اور ناول خوابوں کے قافلے، شایع ہوا تھا جو رومانیت اور حقیقت کے رجحانات کا ایک حسین افزاج پیش کرتا ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

خالد حسین

خالد حسین کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں تینتیس کہانیاں شامل اشاعت تھیں۔ چونکہ منصف کا تعلق بنیادی طور پنجابی زبان سے ہے لہٰذا اس افسانوی مجموعے کی بعض کہانیاں دراصل ان کی پنجابی تخلیقات کا اردو ترجمہ ہیں۔ خالد حسین متعدد نفسیاتی معاملات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں آپ کی کہانیاں عصر حاضر کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں لیکن آپ کی اکثر کہانیوں کا موضوع ذات کا کرب ہے۔ آپ کے بعض افسانوں میں ان دونوں رجحانات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ٹھندی کانگڑی، اشتہاروں والی حویلی، سیلاب ذات، اجالے کی تاریکی، کھوکھلا سورج، گوری فصل کے سوداگر اور دھرتی روتی ہے، جیسے افسانوں میں اقدار کی شکست وریخت نفسیاتی الجھنیں اور معاشی مسائل سے متعلق موضوعات ملتے ہیں۔ آپ کے یہاں اگرچہ بات براہ راست اور دوٹوک کی جاتی ہے تاہم کہیں کہیں علامتی فریم ورک میں بھی افسانوں کے تانے بانے بنے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر

ظہور الدین آپ کے انداز نگارش کے متعلق لکھتے ہیں1:

"His dictation is however weak and sometimes he fails to appreciate the limitations of words within his reach."

تاہم ڈاکٹر ظہور الدین مصنف کے بعض افسانوں کو مستحسن قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان تخلیقات کے باطن میں جو تیر ونشتر پنہاں ہیں وہ دراصل خالد حسین کی گہری بصیرت اور معاشرے کی مکروہات سے ان کی آگہی کا نتیجہ ہیں۔ نصرت چودھری لکھتی ہیں2 خالد حسین بنیادی طور روایت پسند افسانہ نگار ہیں آپ کے ہاں پلاٹ کردار اور تکنیک کی سطح پر روایتی انداز ملتا ہے لیکن موضوعات کی سطح پر ان کے ہاں نیاپن ضرور ملتا ہے۔ ابلاغ کا صاف ستھرا انداز آپ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جہاں کہیں آپ علامتی حدود کو عبور کرتے ہیں قاری اور خالق کے درمیان کچھ فاصلے جنم لینے لگتے ہیں۔ دراصل علامتوں کی بہتات مفہوم تک رسائی ناممکن بنا دیتی ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے افسانے ''بھوشیہ وانی'' نئے آدم کا خواب، اندھیر نگری اور گھاس پر چلنا ممنوع ہے، میں موجودہ دور کی زندگی کی بے سمتی کو علامتوں کے ذریعہ ابھارا ہے۔ محمد اسد اللہ وانی نے آپ کی بعض پنجابی کہانیوں کا اردو ترجمہ کیا ہے شیرازہ کے ۱۹۷۷ء میں شایع شدہ افسانہ نمبر میں ایسا ہی ایک ترجمہ ''ادھورا تاج محل'' شایع ہوا ہے۔ وانی صاحب لکھتے ہیں کہ زبان کا جو چٹخارہ اور اسلوب ان کی پنجابی کہانیوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ وہ اردو میں بہت کم ہے3۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

ظہورالدین

ظہورالدین ۱۹۴۲ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اردو اور انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر گیان چند کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کیا۔ ''بیسوی صدی کے اردو ادب میں انگریزی ادبی رجحانات'' عنوان کے تحت یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۷۸ء کے دوران ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی معاونت سے شایع کرایا گیا۔ اس عالمانہ تحقیقی مقالے میں ادب کی غایت کلاسکیت اور رومانیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ بقول برج پریمی[1] ''اس مقالے میں اردو کے ساتھ انگریزی ادب کے اہم رجحانات کو بڑی محنت سے تلاش کیا گیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے آپ نے بڑی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے آپ نے انگریزی ماخذوں سے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر بیسوی صدی کے اردو ادب میں ان رجحانات کو ٹٹول ٹٹول کر دریافت کیا ہے''۔ کتاب کے آخیر میں سوانحی خاکے بھی دئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل ''محروم کی شاعری'' نام کی تصنیف پر یوپی اردو اکیڈیمی نے آپ کو انعام کا حقدار قرار دیا تھا۔

اس دوران آپ کے علمی تنقیدی اور ادبی مضامین ملک کے معتبر رسائل

میں شایع ہوتے رہے۔ ان گنت ایسی چیزیں ریڈیو کشمیر جموں سے نشر بھی ہوتی رہیں۔ ''اردو ناول کا مستقبل'' ''اردو ادب پر مغربیت کی چھاپ'' ''غالب زنداں میں'' اور ''ادب میں ہپی ازم'' ایسے بعض مقالات کے عنوانات ہیں۔ ادھر ۱۹۷۰ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں نئے افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ رواں دواں نظر آنے لگا۔ اردو افسانہ اس دوران روایات سے انحراف کر کے نئے تغیرات سے آشنا ہونے لگا۔ ظہورالدین اس نئے دبستان کے اولین مبلغین میں شامل تھے۔ نصرت چودھری افسانے کے حوالے سے آپ کی گرانقدر عطا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں2:

''نئے اور علامتی افسانے کی روش کے بانیوں میں اہم نام ظہورالدین کا ہے وہ اُن افسانہ نگاروں میں ہیں۔ جنہوں نے جدیدیت کے اندھے طوفان کو فوراً قبول نہیں کیا بلکہ فنی اور تکنیکی سطح پر افسانوں میں کئے گئے تجربات کا گہرا شعور حاصل کر کے انہیں اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ انہوں نے زمانے کے انتشار و اضطراب بے معنویت اور بدلتی اقدار کو فوراً افسانوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ خوب سوچ سمجھ کر نئے افسانے کے فن سے گہری واقفیت اور مطابقت رکھنے کے بعد پیش کیا ہے۔ انہوں نے عصری زندگی کے اضطراب بے مقصدیت اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں نجات، بدروح، دُرِشہوار، بیگ والا اور اور کینی بلز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً نجات میں انہوں نے آج کے دور کے انسانی المیئے کو پیش کیا ہے۔ سائنیسی اور صنعتی ترقی نے انسان کو جو مالی خوشحالی دی ہے اس نے انسان کے ذاتی اوصاف کو مسخ کر دیا ہے وہ ذہنی پراگندگی اور روحانی انتشار کا شکار ہو گیا ہے......''

اشاعت میں ریاستی کلچرل اکیڈمی نے مصنف کی معاونت کی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں آپ کو ڈوگری افسانوں کے مجموعے کی اشاعت پر ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ادھر آپ کی متعدد کہانیاں اردو کے مقبول اور معروف جریدوں میں شائع ہوتی رہیں۔ آپ کی ابتدائی فنی کاوشوں کا محور عموماً آپ کے فطری رجحان کی غمازی کرتا تھا۔ ایک چتر کار کی محسوسات آپ کا محبوب موضوع ہوتی تھیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہی سارتھی نے خود کو ان تنگ دائروں سے آزاد کر دیا آپ کے فن میں بتدریج نکھار اور وسعت آتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء کے بعد آپ کی تخلیقی سرگرمیاں نئے آفاق کو چھونے لگیں۔ گو آپ کا فن مجموعی حیثیت سے ارتقائی مراحل میں ہی رہا تاہم آپ کی بعض کہانیاں اس بات کا عندیہ دیتی ہیں کہ ایک کہنہ مشق کہانی کار کا ہاتھ وقت کی نبض پر ہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙
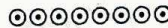
جوتیشور پتھک

جوتیشور پتھک کا اصلی نام جیوتی پرکاش گنڈوترہ ہے۔ آپ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو جموں میں پیدا ہوئے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد ریاستی محکمہ اطلاعات میں ملازم ہوئے۔ اردو میں ایک چوتھائی صدی سے کہانیاں لکھتے رہے ہیں چنانچہ ۱۹۷۰ء کے بعد منظر عام پر آنے والے افسانہ نگاروں میں آپ کا نام منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ٹوٹے رشتوں کا روگ، اور ''اپنے گھاؤ کا درد'' آپ کے ابتدائی افسانے تھے جن میں فاشسٹ قوتوں کے خلاف محنت کش طبقے کی جدوجہد بھی تھی اور انسان کے داخلی انتشار کا احوال بھی تھا۔ جوتیشور جی کا تخلیقی سفراب بھی جاری ہے اور جزیرہ کے عنوان سے آپ کی تازہ ترین کہانی شیرازہ کی ۱۹۹۵ء کی اشاعت میں شامل کی گئی ہے۔ اس طویل سفر کے دوران آپ کے فن نے کئی موڑ لئے لیکن آپ کی کہانیاں ہر پڑاؤ پر اپنی شکستہ و مجروح شخصیت کو یکجا کرنے کی کوششیں کرتی رہیں۔ آپ نے ہر سنگ میل پر آج کے انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع سخن بنایا۔ اس ہزیمت خوردگی کا درد لئے آپ کی تحریریں ملک کے معتبر اور ممتاز رسائل میں شایع ہوتی رہیں۔ آپ کے افسانوں کے کئی مجموعے دیدہ زیب

طریقے پر شایع ہوتے رہے۔لیکن ہجوم کے عنوان سے آپ کا جو ناول ۱۹۸۵ء میں شایع ہوا اس نے ناقدین کو پہلی مرتبہ آپ کی طرف متوجہ کیا۔ جے کے پبلکیشنز کے اہتمام سے آپ کا یہ ناول تشدّد کے رجحانات کا پیش بین بنکر نئی نسل کے مسائل کا جرات مندانہ تجزیہ پیش کرتا ہے۔اس ناول میں نئی نسل کا استحصال واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔نوجوان معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں لیکن انہیں سیاسیات کی دلدل میں کس طرح پھنسانے کی مذموم کوشش ہوتی ہے ۔ ناول میں اس طرف خوب اشارے کئے گئے ہیں۔ مدھوکر اور سادھنا کردار نگاری کی اچھی کوششیں ہیں۔ منصف نے ان کی ذہنی کشمکش کا گہرا ادارک کر کے انہیں نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

---

1 ڈیولپمنٹ آف اردو لٹریچر ان جموں ص ۲۹۹

2 شیرازہ: جلد۳۴ شمارہ ۶-۷ ص ۸۰

3 تعمیر: اردو ادب ۱۹۸۳ء ص ۹۴

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

میر محمد نیاز

میر محمد نیاز منشی محمد الدین فوق کے کشمیری میگزین میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد آپ لاہور کے روزناموں میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ آپ نے گلانسی کمیشن کی رپورٹ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو آپ کا ایک اہم کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے ۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ پر ایک کتاب بھی تحریر کی تھی جو اب برسوں سے نایاب ہے۔ میر محمد نیاز ایک معروف کالم نویس، ایک ممتاز انشاپرداز اور ایک منجھے ہوئے مترجم کی حیثیت سے لگ بھگ نصف صدی تک ادب اور صحافت کی دنیا پر چھائے رہے۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

محمد اسد اللہ وانی

ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اردو زبان و ادب کی ترویج کے ضمن میں ایک ناقابل فراموش رول ادا کیا ہے۔ ان گرانقدر خدمات کو انجام دینے میں مختلف ادوار میں متعدد اہل قلم سرگرم عمل رہے۔ محمد اسد اللہ وانی بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں۔ جن کا فکر و فن اکیڈیمی کی سازگار فضا میں پروان چڑھا اور پھر ایک ایک مقتدر محقق کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ آپ ستھر اور اسی کی دہائی کے دوران اکیڈیمی کی طرف سے بلائی جانے والی ادبی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور مختلف اصناف میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے رہے۔ آپ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین ممتاز اردو رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے رہے ہیں اور ناقدین کے حلقوں میں آپ کی آواز نہایت توجہ سے سنی جاتی ہے۔ شیرازہ کے گولڈن جوبلی نمبر میں آپ کا مضمون ''اقبالیات میں ریاستی ادیبوں کا حصہ'' نہایت معلومات افزا ہے۔ یہ اقبال شناسی کے حوالے سے ایک منفرد مضمون ہے۔ اسی طرح ادبی شخصیات کے پورٹریٹ تخلیق کرنے میں آپ کا سٹائل یکتا ہے۔ پروفیسر منظر اعظمی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر آپ کا جو مضمون شیرازہ میں شائع ہے وہ اس اہم شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر

حاصل روشنی ڈالتا ہے۔ وانی صاحب کی وجاہت نے ان کے فکر و فن کو جو تنویر بخشی ہے اس سے اردو ادب کی ابھی نہ جانے کتنی امیدیں وابستہ ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

خوشدیو مینی

خوشدیو مینی اردو، پنجابی اور پہاڑی میں افسانے ڈرامے اور مضامین لکھنے کے علاوہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ نئی نسل کے اردو افسانہ نگاروں کو متعارف کرانے کا فیضہ کلچرل اکیڈیمی ہر دور میں انجام دیتی رہی ہے۔ ۱۹۸۰ء کے دوران ایسی نگارشات کا جو مجموعہ اکیڈیمی کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس میں کے ڈی مینی کی تخلیق بھی شامل ہے۔ ایسا نہیں کہ مینی اس سے قبل نہیں لکھتے تھے۔ سچ پوچھیں تو تب تک ان کے درجنوں افسانے اور مضامین شائع بھی ہوئے تھے اور ریڈیو کشمیر جموں سے نشر بھی ہوتے رہے تھے۔ بعد کے برسوں مین ان کا فن زیادہ بالیدہ دکھائی دیتا ہے۔ ''چاند''، ''عرفان'' پہلا پتھر اور ڈھوک کی رات آپ کے بہتر فنی سلیقے کی عکاس تحریریں ہیں۔ آپ نے اپنے گرد و پیش کے درد کو اپنی نگارشات میں تحلیل کر کے رکھا ہے۔ ادھر ۱۹۸۰ء کے بعد آپ کے فن نے تجریدیت کا رنگ لیا۔ آپ نے انشائیوں کا ایک مجموعہ جوتیاں بھی شائع کیا۔ اس فن لطیف میں آپ کی کنٹری بیوشن بلاشبہ لایق ستائش ہے۔ آپ کے قلمی خاکے نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت کا پورٹریٹ آپ نے جیسے اپنے جون جگر کے رنگوں سے کمپوز کیا ہے۔ اس میں جراغ حسن حسرت کی شخصیت کے سبھی ساہ و سفید رنگ صاف و شفاف نظر

آتے ہیں۔ آپ کئی برسوں سے پونچھ کی وادیوں کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا ہوا۔ پونچھ کے لوگوں کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر آپ نے ایک کتاب بھی تحریر کی۔ اس کی اشاعت میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے آپ کی معاونت کی۔ اس کتاب میں پونچھ کی تاریخی اہمیت کی جگہوں کا تذکرہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ادھر اسی موضوع پر آپ کے بعض مضامین شیرازہ میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔ پہاڑی زبان، نوری چھم، درجن کی وادی ایسے بعض مضامین کے عنوانات ہیں۔ ان مضامین کی زبان اس قدر رومانی اور خواب وخیال سی لگتی ہے کہ عندیہ ملتا ہے کہ ان پر فطرت کے رومان کا جادو چل چکا ہو۔ اس کیفیت کا اندازہ ''سات سروں کی وادی'' عنوان کے تحت شائع ہونے والے اس مضمون کے مختصر سے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے[1]:

''اس جھیل پر ہر وقت سفید سفید دھند ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اڑتی رہتی ہے۔ یہ دھند اتنی تیز چلتی ہے کہ ایک منٹ میں پوری جھیل دھند میں غائب ہو جاتی ہے جب کہ اگلے لمحے پھر یہ جھیل نمودار ہو جاتی ہے اور مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ یہاں جھیل کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر جو ہانک لگائی جائے تو آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک چٹان سے دوسری چٹان سے ٹکراتی اور پلٹتی رہتی ہے۔ آواز کے گونجنے کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا ہے''۔

---

1 سات سروں کی وادی شیرازہ جلد ۳۳ شمارہ ۷-۱۲ ص ۱۰۷

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

شام سندر آنند لہر

شام سندر آنند لہر کا تعلق بھی اردو افسانے میں جدید نظریات کے حامی گروپ سے ہے۔ آپ نے ستھر کی دہائی کے آخری برسوں میں جب افسانے کی طرف توجہ کی تو آپ بھی اپنے باقی ہم عصروں کی طرح Conventional افسانے لکھتے تھے۔ لیکن پھر وقت بدلنے کے ساتھ آپ کے فن میں نکھار آنے لگا اور آپ نے اندھی روشنی، ٹرین کا ڈبہ، جواب، پانی کی لکیریں اور عدالت جیسے افسانے تحریر کئے۔ اس کے بعد کے دور میں آپ نے ریڈیو کشمیر جموں کے لئے کچھ سوچو، سفر، رات کے چشمے اور دریا جیسے جان دار سکرپٹیں لکھے۔ ''تپسوی کون؟'' آپ کا تحریر کردہ پہلا ناول ہے۔ جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی تکنیک میں روایت اور تجرید کا عجیب غریب امتزج ملتا ہے ناول کا موضوع جدید انسان اُس کے عقائد اور ان کی شکست وریخت ہے۔

آپ کی کتاب ''سرحد کے اس پار'' کو اترپردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے ایوارڈ بھی حاصل ہوا ہے۔ ''سرحد کے اس پار'' لہر کے پندرہ افسانوں کا تازہ

مجموعہ ہے۔اس کے علاوہ آنند لہر کی کئی اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں ''اگلی عید سے پہلے اور سرحدوں کے بیچ'' کافی مقبول ہوئیں۔

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

غلام مصطفیٰ عشرتؔ

غلام مصطفیٰ عشرتؔ کشتواڑی ۱۹۶۰ء کے آس پاس ایک سرکاری رسالے ''دیہات سدھار'' کی ادارت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے سرگرم سیاست میں حصہ لیا لیکن علم وادب کا ذوق لڑکپن سے تھا۔ چنانچہ سن وسال گزرنے کے ساتھ آپ کا شمار جموں کے صف اول کے شعرا میں ہونے لگا۔ آپ نے اردو نثر کی طرف بھی ارتکاز کیا اور برسہابرس تک تاریخ کشتواڑ جیسے دقت طلب پروجیکٹ پر عرق ریزی سے کام کرتے رہے۔ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ وہ تاریخ کشتواڑ کی تحریر وتحقیق کے لئے ابتدائی زمانے سے ہی ضروری مواد شیرازہ بند کرتے رہے تھے۔ آخر برسہابرس کی عرق ریزی کے بعد آپ نے اسے ۱۹۷۲ء میں مکمل کر کے شائع کرایا۔ ڈاکٹر ظہورالدین1 لکھتے ہیں کہ عشرت کاشمیری نے ۱۹۴۵ء سے پہلے بچوں کے لئے دو تین کہانیوں کے کتابچے شائع کئے تھے۔ آپ کے ساتھ آریہ سماج کے بارے مین ایک کتاب بھی منسوب بتائی جاتی ہے۔

---

1 ماہنامہ شیرازہ اپریل ۱۹۸۳ء ص ۸۳

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙

اقبال نازشؔ

اقبال نازشؔ نئی سوچ اور نئے رجحان کے ایک اہم اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے فکر و فن کو پروان چڑھانے اور اسے ایک واضح سمت بخشنے میں مجلس ادب، تھنہ منڈی کا نمایاں کردار رہا ہے۔ آپ کی شعری تخلیقات کے علاوہ آپ کے نثری شہہ پارے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ شعر و ادب میں آپ جدید فکر کے نمائندہ فن کار ہیں۔ چنانچہ آپ کی اکثر کہانیاں علامتی فریم ورک میں ترتیب دی ہوئی ہوتی ہیں۔ ''پانیوں کا قہر اور بھیگتے الفاظ'' ایک ٹھہرے ہوئے لمحے کی کہانی'' اور ''بے نام سسکیوں کا ماتم'' اس قبیل کی آپ کی بعض کہانیاں ہیں۔ میونسپلٹی کی گاڑی اور پتنگ عنوانات کی کہانیوں کے مطالعہ سے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ افسانوی ادب میں آپ مستقبل قریب کے اندر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا کے رہیں گے 1۔

---

1 ''پرویز مایوس'' آپ کے ہم عصر ہیں۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''چناروں کی آگ''

خالد حسین کے دیباچے سے مزین ابھی حال ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ ''شباب مرزا'' ایک اور معاصر افسانہ نگار ہیں۔ جن کا تعلق راجوری سے ہے۔ اقبال شال، شوکت میر، انور خان نسیم، منیر منہاس، غلام احمد پنچھی اور امتیاز نسیم بعض دیگر ابھرتے نام ہیں جو اردو فکشن میں اپنی نمایاں کنٹری بیوشن سے اعتباریت حاصل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیق انجم اور شہاباز راجوروی اس سلسلے کے معتبر سخن ور ہیں جنہوں نے اپنی تخلیق اور تحریر کی توانائی سے اردو زبان وادب میں اپنا نمایاں مقام بنا لیا ہے۔ رفیق انجم کی تصیف ''گوجری ادب کی سنہری تاریخ'' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسے ''فیضان کوہسار'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ (جان محمد آزاد)

⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙⊙